

سالگرہ نمبر

کمر کے ہر رنگ کے

# پاکینہ

اپریل 2012

میراج رسول

PDFBOOKSFREE.PK

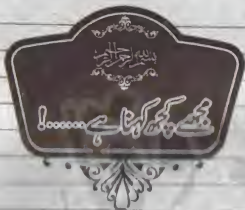
داناہید سلطانہ اختر  
عسیرہ سید، نمرہ احمد، انجم انصار  
عندایک اقبال بانو



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

اور یہ کہ مصنفہ کی غیب سے تحریریں سے آگاہ تھیں





قارئین کرام! آپ سب کو پاکیزہ کی سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ کے فضل و کرم سے پاکیزہ ڈائجسٹ چالیسویں سال میں داخل ہو گیا ہے۔ بلاشبہ یہ اپنی اشاعت کے اتنے برس مکمل کر چکا ہے۔ ایک ننھا مٹا پودا آج ایک تناور درخت کا روپ دھار چکا ہے اور اس کی کئی شاخیں تواتنی دور دور تک پھیل چکی ہیں جس کا اندازہ تک نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ یقیناً اس خواب کی خوب صورت تعبیر ہے کہ پاکیزہ خوب صورت اور فکر انگیز تحریروں کا ایسا گلدستہ ہو جس کی خوشبو سے ہر عمر کی خواتین مسحور ہو سکیں اور بلا جھجک اپنے گھر میں سب کے سامنے اس کا مطالعہ کر سکیں اور اس کو پڑھ کر انہیں آگاہی حاصل ہو۔ بفضل خدا پاکیزہ کی تحریروں حقیقتاً پاکیزہ ہوتی ہیں۔ ہمارے افسانوں اور ناولوں میں نہ صرف لڑکیوں کو اعلیٰ تربیت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے بلکہ مسائل سے غٹنے کے احسن طریقے بھی بتائے جاتے ہیں۔ ہمارے افسانے ہوں یا ناول، شاعری ہو یا خطوط ہمارا مقصد ہر جگہ یہی ہوتا ہے کہ ہمارے قارئین کو آگاہی حاصل ہو۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ پاکیزہ گاؤں گوشوں میں بھی بے حد شوق سے پڑھا جاتا ہے اور اس کی بے شمار قارئین ایسی بھی ہیں جو ٹوٹی پھوٹی اردو پڑھنا جانتی ہیں۔ جن کے ہاں اعتبار بھی نہیں آتا جو ٹی وی کی سہولت سے بھی محروم ہیں۔ اس لیے ہم ایسی تحریروں بھی شائع کرتے ہیں جن کو پڑھ کر وہ اپنی زندگی کو با مقصد بنا سکیں اور اپنی زندگی کے حوالے سے کبھی منفی قدم نہ اٹھائیں۔ جب افراد کی سوچ مثبت ہوگی، وہاں کے معاشرے میں مثبت اقدار خود پیدا ہوں گی۔ میری تمنا ہے کہ پاکیزہ کی ہر قاری اتنی باشعور ضرور ہو جائے کہ وہ اچھے برے، سچ جھوٹ، حرام و حلال کی پرکھ تو کر سکے کہ لاعلمی، جہالت اور نادانیوں نے ہمیں بہت پیچھے دھکیل رکھا ہے اور ہمیں پاکیزہ کی مشعل لے کر بہت آگے جانا ہے بہت آگے..... (انشاء اللہ) مدبرہ

انجم انصار



اور بے شک ضرور انہیں میں گمراہ کروں گا اور ضرور انہیں امیدیں دلاؤں گا اور یقیناً ضرور میں انہیں سکساؤں گا تاکہ وہ جانوروں کے کان کاٹیں اور بے شک ہاتھ میں انہیں سکساؤں گا تاکہ وہ اللہ کی بنائی ہوئی (صورت) کو (پہری کلیم کے موافق) بدل ڈالیں اور جس نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنایا تو بے شک اس نے مرتع کھانا اٹھایا (۱۱۹) شیطان انہیں (اٹھنے اٹھنے) وعدے دے (دے کر بے کام کر لیتا) ہے اور انہیں امید دلاتا ہے حالانکہ شیطان جو کچھ ان سے وعدہ کرتا ہے وہ دھوکا ہے (۱۲۰) یہ لوگ (ایسے ہیں کہ) ان کا کھانا دوزخ ہے اور وہ اس سے (بھگتی) رہائی نہ پائیں گے (۱۲۱) اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کی محنتیں ہم انہیں ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں بہہ رہی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (یہ) اللہ کا وعدہ ہے (جو نہایت) سچا (ہے) اور اللہ سے زیادہ کون (اپنی) بات میں سچا (ہو سکتا) ہے (۱۲۲) اے مسلمانو تمہاری آرزوئیں (شک) ہیں اور تم اہل کتاب کی خواہشیں (سچا) ہیں (بلکہ) جو شخص کچھ برا کام کرے گا اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا اور اللہ کے سوا کسی کو (اپنا کوئی کارساز اور مددگار نہ پائے گا) (۱۲۳) اور جو مرد یا عورت (کوئی ایسا فعل) کرے گی (جو) نیک کاموں میں سے (ہو) اور وہ (کرنے والا) مسلمان (بھی) ہو تو وہی (ان) برکزیہ لوگوں میں ہوگا جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر فقیر برابر (بھی) ظلم نہ کیا جائے گا (۱۲۴)

(سورہ نسا آیت نمبر ۱۱۹-۱۲۴)

## آنحضرت ﷺ کے اسلمے گرامی سیدنا محمد

الحدیث محمد ﷺ

آپ ﷺ نے فرمایا۔

”زمین میں میرا نام محمد ﷺ اور آسمان میں احمد ﷺ ہے۔ اسی طرح نور جنت میں میرا نام محمد ﷺ اور اہل جنت میں احمد ﷺ ہے۔“

۲۔ حضرت ابو ذر سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”اے ابو ذر! عجیباً میں سب سے پہلے حضرت آدم اور سب سے آخر میں محمد ﷺ (ترقی) ہیں۔“

۳۔ حدیث قدسی ہے کہ اے محمد ﷺ اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو کائنات کا وجود نہ ہوتا۔

۴۔ روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا فرمایا تو آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی نیت سے بلایا آپ نے عرض کی اللہ تعالیٰ امیری یہ نیت کیسے ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اپنا سر اٹھاؤ۔ آپ نے اوپر دیکھا تو عرض پر تو میری ﷺ جلوہ گرفتار۔ حضرت آدم نے پوچھا۔

باری تعالیٰ ایسے کس کا نور ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ محمد ﷺ کا نور ہے

یہ تیری اولاد میں سے ہوں گے۔ ان کا نام

آسمان میں احمد ﷺ ہے اور زمین پر

محمد ﷺ ہے۔ اگر میں انہیں نہ پیدا کرتا تو

نہ تمہیں پیدا کرتا اور نہ زمین و آسمان کو

پیدا فرماتا۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسلام ﷺ سے اقتباس







نوع 9

## عکس سمیرا احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے گردناووں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکادینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پراسرار ریت بھی... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تین تین، سنسنی خیز اور چونکادینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی مہارنگہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... مگر ان کی عکس اور اپنا سایہ پر شخص کے ساتھ رہتا ہے... ہماری کرافٹیں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

ان لاکھ موت میں ہم مل مل کر مرنے کے  
اک رابطہ مسلسل ہے اک قافلہ مسلسل ہے







☆☆☆

22



”چنگچنگ پلو ہیں؟“ کچھ دیر بعد شیردل نے بالآخر کہا۔

”ہاں۔“ دوسری طرف سے کس نے کہا۔

”کھا کر سو جاؤ۔“ اپنے وال کاک پر ایک نظر ڈالنے ہوئے شیردل نے اس سے کہا۔

”اوکے۔“ کس نے ایک بار پھر ہتھیار ڈالے۔

”ایک کھانا پوری نسل مت کھانا۔“ شیردل اس صورت حال میں بھی کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ہنس پڑی تھی۔

”دکھنم اب صرف سو ڈی۔“ تم نے سنا۔“ اس نے بالآخر بڑے جفاکارانہ انداز میں اس سے کہا۔ ”میں کل آکر کھانا

ہوں تم سے۔“ کس کو خدا حافظ کہنے کے بعد وہ ایک بار پھر سونے کے لیے لیٹ گیا تھا لیکن نیند اب بھی اس کی آنکھوں

سے کھول نہ دیتی۔ وہ بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اتنے سالوں سے کس کو اتنے قریب سے جاننے کے

باوجود اس نے بھی اسے اس طرح ادا اس اور اب بیٹ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے فون پر کچھ دیر پہلے بات کرتے

ہوئے اسے مرنے کی بات کہی تھی اور شیردل کو اس جتنے پریشان کیا تھا۔ کس اور اس ساری صورت حال کے بارے میں سوچتے

سوچتے بالآخر نیند آ گئی تھی۔

”اے اے کہ بہت دیر سے جا تھا اور بڑی بڑا بہت اور رگت کے عالم میں آفس کے لیے تیار ہوتے ہوئے اس نے

اپنے فون پر کس کا کال کر دیا تھا۔

”I am alright“ اسکرین پر چمکتے ہوئے اس چھوٹے سیٹل فون کی طرف دیکھ کر کس نے ایک

چھوٹے سے جملے نے اسے بتائیں کیا کیا کر دیا تھا۔ اس کے اور کس کے درمیان دوستی کا آغاز اسی ایک جملے سے ہوا

تھا۔

”No matter how hard you have been hit, you are always

alright۔“ اس نے کس کو ٹیکسٹ کیا تھا۔ جواب بہت دیر تک نہیں آیا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ ریٹائر ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ ریٹائر واقعی ہو چکی تھی۔ ایسا بہت کم ہی ہوتا تھا ان دونوں کے درمیان کردہ ایک دوسرے کا ریٹائر نہ سمجھ

پائے ہوں۔ اشارے کنایوں میں کی جانے والی بات کو بھی سیکٹرز میں ڈی کوڈ کرتے تھے اور یہ تب بھی تھا جب وہ دونوں

ایکٹری میں ایک دوسرے سے کسی ملک ملک تیار کھتے تھے۔

کس نے جھجھ میں پکڑا سون اور وائس ٹیلی پر کچھ کر پائیوٹ ٹیچرز ایسوسی ایشن کے دفتر کے اس نمائندے کی

بات پر توجہ دینے کی کوشش کی جو اس کے سامنے اس کے آفس میں بیٹھا ایک کے بعد ایک مطالبہ اس فہرست میں سے پڑھ

کر چلا کر ہاتھ اس کی ایک کاپی اس کے سامنے میز پر بھی پڑی ہوئی تھی اور جس پر موجود 25 کے 25 مطالبات اسے

زبانی پڑھتے۔ اس کے باوجود وہ میکانیکی انداز میں بظاہر سے حد درجہ کی کسٹمائیڈ ان مطالبات کو سن رہی تھی۔

مجموعی ساری رات جاتے رہنے کے بعد وہ صبح صرف دو بجے کی نیند لینے کے بعد اسے مقررہ وقت پر آفس میں تھی اور جس

سے ایک کے بعد ایک اپائنٹمنٹ بھگتتے ہوئے۔ وہ وہی طور پر بھی ایک ایک رات میں جیسی ہوتی تھی۔ اور اس کا دفتر

حالت کے ساتھ شیردل کی طرف سے ملنے والا وہ ٹیکسٹ۔ وائس تاکہ تھے۔ دو بجے دو بجے سے سامنے پڑے ایک کاغذ پر

نوٹس لیتے ہوئے وہ اس نمائندے کی بات سن رہی تھی کاغذ پر وہ پوائنٹس نوٹ کر رہی تھی جن پر اسے اس نمائندے کے

خاص نوٹس ہونے کے بعد بات کرنی کی اور سوچ وہ شیردل کے بارے میں یہی تھی۔ شیردل، جو کئی قید اور بہت سے

دوسرے چہرے۔ سارے چہرے آپس میں گڑبڑ ہو رہے تھے۔ سوائے ایک چہرے کے۔

☆☆☆

”بھرا ایک نام ہے۔“ قاطر نے فونوں کے لیے فون پر کوئی کنگ ایڈرڈ میں بیٹا کا پانچواں دن تھا جب اس

نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ اس دن پہلی بار کراچ آیا تھا۔ پانچواں۔ وہ اسے آپ سے اپنی کنگ کی اس نے ایک کو

نوٹس بھی نہیں کیا تھا اور نوٹس تب کیا تھا جب وہ کراچ میں آ کر اس کے القاب مل کر آیا تھا۔ قاطر اگر مل نہیں کھی تھی تو

بے فہم معمولی تھا۔ یہ ایک نام ایسا تھا اس کی زندگی میں جو بھی کسی بھی اسی طرح نروس۔ اسی طرح فریڈر

تھا۔

وہ اس کے سامنے کھڑا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سر ہاتھ تھا۔ قاطر نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ پھر

اس نے سر کرنے کی بھی کوشش کی۔ وہ بڑے دوستانہ انداز میں اس کے القاب مل کر آیا تھا۔

”میں نے آپ کو پریشان کر دیا شاید؟“ وہ اب معذرت کر رہا تھا۔ قاطر کو کیسے ذرا شرمندگی ہوئی۔ اس کی وقتی

کیفیت اس کے چہرے پر کیوں آ گئی تھی۔

”فہم تو؟“ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

وہ اب اپنا تعارف دے رہا تھا۔ قاطر کو حیرت ہوئی وہ اس کی طرف متوجہ کیوں ہوا تھا۔ پوری کلاس میں اسے

تعارف کے لیے ایک ہی لڑکی کی یاد ہو رہی تھی۔ اسی بے تکلفی کے ساتھ بات کر لیتا تھا۔ وہی الحال اندازہ نہیں کر

سکتی تھی لیکن اس نے بڑے سلیکٹو سلیکٹو کے ساتھ اس کی تعارف بنا۔

وہ ایک سلطان کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات تھی اور کراچ سے ہاتھ تک ایک اس کے سر پر سوار ہوا تھا۔ اور اس

کی وجہ سے کسی سے بچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی۔ پہلا تجربہ۔ بہت سارے سبق

ایک سلطان قاطر کی پہلی محبت تھی۔ پہلی محبت۔ پہلی غلطی۔ پہلا تجربہ۔ بہت سارے سبق

تھے جو اس تجربے پر نے اسے دے تھے جو اس نے محبت کے نام پر کیا تھا۔ شاید اسے ہوا تھا۔

لاہور آنے کے بعد وہ کیڑے کے ساتھ پہلی بار لاہور آئے۔ ان دنوں کا آقا ناس کی طرف سے

نہیں ہوتا تھا۔ یہ ایک تھا جو خدو اس کی طرف بڑھا تھا۔ کلاس کی تمام لڑکیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ اسے خوش سے

پہچاننا پڑتا تھا۔ پھر خود آنا چاہیے تھا۔ ساتویں آسمان پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ زندگی میں پہلی بار کوئی کلاس میں

اس طرح کی دلچسپی دکھا رہا تھا لیکن اس کے برعکس وہ بہت عجیب سی بھنگو کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے اتنے سالوں کے لیے جتنا

اور ایک سے دور رہ کر اپنے خول میں زندگی گزار کر کئی کئی سالوں کے بعد اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔ وہ

صرف جسمانی طور پر ہاتھ اور کراچ کی لڑکیوں کے ساتھ تھے جیسے کئی لیکن فنی طور پر وہ اب بھی ان سے بہت دور تھی۔

وہ خول جو بچپن کے اس حادثے نے اس کے گرد بٹایا تھا وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ مضبوط اور سخت ہوتا گیا تھا

اور قاطر نے جسے خود کو اس خول کے کنارے پر ضرب لگا کر گراؤں میں ڈال دیا تھا۔

ایک سلطان کی آمد نے پہلی بار اس کی خول پر ضرب لگا کر گراؤں میں ڈال دیا تھا۔

تھا؟ اس کی اس غیر معمولی توجہ کا مقصد کیا تھا۔ ان دنوں والوں سے زیادہ پریشان ان سوال قاطر کے لیے یہ تھا کہ وہ ایک

کی توجہ resist کیوں نہیں کر پاتی تھی۔ وہ ایک لالابی لالابی نہایت سلیکٹو تھا۔ پھر وہ لڑکا تھا اور قاطر نے سب سے

برعکس تھی۔ اس کے باوجود وہ ایک کاس کی طرف متوجہ ہونا اور قاطر کا جانے کے باوجود اس اعتبار کا مظاہرہ نہ کر پاتا جو اس

کی زندگی کا حصہ تھی۔ قاطر کے لیے عجیب سی لیکن اس کی زندگی میں آنے والی ایک بے حد خوشگوار تھی۔ یہ ایک

نئی اسی دنیا کی کراچ میں اسٹینٹ پروفیسر کے طور پر کام کر رہی تھی۔ وہ ایک انتہائی دوستانہ مزاج رکھنے والی تھی۔

تھی جس خاتون میں اس نے پہلے قاطر ان سے مل چکی تھی۔ وہ ان کو لکھی ایک کلاس تھی جس میں ان اور

چند تجربہ زبیں سے ایک تھیں جنہیں اسٹوڈنٹ بہت پسند کرتے تھے۔ ایک اور اس کی دوستی چند مغل میں ہی ان کے

نوٹس میں آ گئی تھی۔ قاطر کو کچھ خط لکھتے تھے ان کے نوٹس کے حوالے سے۔ لیکن اس کی توقعات کے برعکس سلطان

کا رویہ اس کے ساتھ بہت دوستانہ اور حوصلہ افزا تھا۔ وہ ایک کے ساتھ ان کے اوقات ان کے آفس چل جاتا کئی بھی اور

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء

میلنگ ہاؤس میں ایک۔۔۔ اپریل 2012ء





”تمہیں پتا نہیں تھا کہ جو اوڑنک کرتا ہے؟“ شیردل نے عکس سے پوچھا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس کے شہر پہنچا تھا اور اب وہ دونوں عکس کے آفس میں بیٹھے تھے۔

”دوسرا سے جان بچان کی تم دونوں کی..... ہونا چاہیے تھا۔“ شیردل نے حج کے گروٹی بیک کے دھاکے کو لپیٹتے ہوئے اس کو چھوڑ کر بیک سے نکلتے ہوئے کہا۔ عکس جو دیر پاگل خانوٹی بھیجی تھی۔ سوال شرمندہ کرنے کے لیے لیس تھا لیکن اسے شرمندہ کر گیا تھا۔ شیردل اب جانے کا پلے ہوئے اسے تلخ دیکھ رہا تھا۔

”میں نے اس سے پوچھا تھا کہ آدھ ہار..... اس نے بیٹھ کر کہا کہ آدھ ہار..... عکس نے ہار لیا۔

پہلے وہ اس کے خلاف ہاتھ بٹا کر تھا۔ میرے لیے یقین کرنا ناممکن تھا کہ وہ جیوٹ بیل رہا تھا۔ وہ تو اب کسی نہیں رہا کہ وہ اس پر چڑھا ہو یا کھلا کر اسے اپنے فائدے پر استعمال کرے۔ مجھے بھی کیا ہے کہ میرے افسران کیا کیا ہے اس کا ٹیکہ لے لے لکھنؤ میں اس کی جلی اسے صوبائی اسمبلی کے امیدوار کے طور پر سرائے لانا چاہتی تھی۔“

عکس نے ڈاکھری کی ساس لے لے ہوئے چاہے سننے کی بجائے کال کر رکھ دیا۔

”جی۔“

”جواد سے کب بات ہوئی ہے تمہاری؟“ شیردل نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”آج اس کی bail ہوئی گی کہ رات ہی سن مجھ سے بات نہیں ہو سکی اس کی..... کہہ رہا طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے مجھ سے خواتین نہیں کر سکا۔“ کس اب کچھ سوچتے ہو جائے کس پ لے رہی تھی۔“ میں نے اس کو چھانچا کہ اس نے اپنی ستر کے طور پر سرانام کیوں لا؟ اس نے کہا اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ میدانے خودی یہ خبر دھڑکنے لگی اور اظہارِ درد اس کی دھڑکنے لگی کہاں اپنی عورتوں کا نام اس طرح دینی دلی اسکرین پر بدستوری اور خوش ہوئی ہے۔“ شریل نے جانے کا کب کب کہا تھا۔

”تم کو اس کی باتوں پر یقین آ گیا؟“ عکس نے نظریں اٹھا کر شیردل کو دیکھا۔

”میرے پاس یقین کرنے کا آپشن نہیں ہے..... کم از کم اس اسٹیج پر۔“ اس نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

”کس نے یہ پیش لیکن میں خود تہنہ مارا جا تھا۔ ایک بار کیں بار بار۔ وہ پوسٹ کو پہلے سے باپ کا نام لے کر دھکا رہا تھا بعد میں تہنہ مارا۔ لے کر۔“ ایف آئی آر میں پوسٹ نے یہ بھی لکھا ہے۔ مجھے اگر جواد کی چیز پر شک ہو تو وہ یہی ہے۔ کچھ کی جوتا اسے اس سارے معاملے میں تہنہ مارا جس لانا چاہیے تھا۔ اس میں اسی بار دہری اور میرت ضرور ہوئی چاہیے تھی کہ وہ تہنہ مارے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے تہنہ مار عزت کا خیال کر لیتا۔“

That's the only point that bothered me..... ورنہ مجھے اس کے ڈبک کرنے یا کسی عورت کے ساتھ بھی بچڑے جانے پر کوئی اعتراض نہیں..... اور وہ بالکل بھوت بول رہا ہے کہ وہ ڈبک نہیں کرتا..... وہ نشے میں لگا تھا، آٹھ گھنٹے بعد وہ پولیس کے گاڑی کو روکا تھا۔ پولیس والوں نے فو آفیسر ایمریڈی اور اس کی جان ان خطہ کے لیے اسے روکا تھا کہ کہیں گاڑی مارندے..... ورناسے سے اقدار نے اسے چیت میں اس کا ٹیکہ کر کے گاڑی جانے کے لئے اس کو ٹیق شین میں تھا اس پر کوئی ایف آئی آر درجہ درجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے مارنے کا ارادہ ہے..... اس کے کہہ والوں کو اطلاع دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کو مارے جائیں لیکن ان موصوف نے نشے کی حالت میں اس کو ہتھکڑیاں پہنائیں اور اس کو گاڑی میں باندھ کر لے گئے۔ ورنہ اس کے کہنے سے کسی نے بھی اس کو اطلاع کر دی اور میرے پاس پہنچنے کے بعد پولیس کو مجبور اس کے خلاف ایف آئی آر درجہ کر دئی..... خیر دل اسے بعد بھیجی کے لئے کی قصصات تیار تھا.....

”اگر تم سے کل رات کو بات نہ کرنے کی وجہ طبیعت کی خرابی سے زیادہ فتنے کی وجہ سے بات نہ کرنے کے قابل نہ ہو تا۔۔۔۔۔۔ لیکن خیر مسکدہ قول ہو گیا ہے اب۔۔۔۔۔۔ اور وہی بات تھا ان کی پہلی گفتگو تمہارے سر والوں کی سے یہ کہ ان کی چھوٹی بات پر جکڑ کر جانے رہا ہے یہ کورات کی پیش کش یعنی خیر گزارنے دیتے۔۔۔۔۔۔ شہر دل نہ جانے کاپ دوبارہ اٹھا دیا اس سے پہلے کہ عکس کچھ نہ شہر دل سے میل نہ ہو پکونی کال آئی تھی۔۔۔۔۔۔ جانے کاپ واپس رکھتے ہوئے شہر دل

28 ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2012ء

لے بہت حد برق رفتاری سے فون اٹھا لیا اور فون پر ایک نظر ڈالتے ہی عکس نے اس کے چہرے پر اطمینان بھری ایک مسکراہٹ پھیلنے لگی تھی۔ چنانچہ اس نے فون پر مسکراہٹ میں کہیں شیر دل کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی۔ وہ بات فون پر شہر بانو سے بات کر رہا تھا۔

”تم نیویارک پہنچ گئیں؟“

”یہاں ابھی سامان وغیرہ لیتا ہے ہم لوگوں کو۔“ شہر ہالو کی آواز سنی ہوئی تھی۔

”اگلی فلائٹ کا ہوا کیا؟“ شیرول نے اس سے پوچھا۔

”نہیں! ابھی نہیں سنا، دیکھ کر لینے کے لیے کمرے میں بیٹا اُٹھا۔ وہ میری اگلی گلابت میں چار باج کھنے پہنچا۔ ابھی اور میں اتنی تھک چکی ہوں کہ میں تمہیں بتا بھی نہیں سکتی۔ تمہیں ساتھ آنا چاہیے تھا شہر لے۔“ شہر بانو نے شکایت کا شیر دل سن کر مارتے ہوئے اس کو بھلانے والے اعزاز سے کہا۔

"I know yaar..... میں پہلے ہی بہت مس کر رہا ہوں کل رات سے تم دونوں کو..."

”مس کو تو ہماری بیٹی کر رہی ہے نہیں۔ میری جان کھالی ہے اس نے پورے دے میں بار بار کہا تو اپنا ہاتھ کر۔“  
اب تم بات کرو اس سے۔“ شہزاد نے مثال کو دیکھ کر ہنسنے لگا۔ وہ اس کے ہاتھ میں دے ہوئے کہا۔ جو شہزاد کا  
نام ہے جانے پر۔ یہ *impatient* مرضی کی اس کی آواز فون پر سنائی دے رہی تھی۔ وہ کہنے لگا کہ یہ لے لے  
واقعی یہ بیچوں کہا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ مس مہم مسکراہٹ کے ساتھ فون پر مثال کے ساتھ وہ دلی اس کی ہنسنے لگی رہی۔  
میں عجیب بہ ساریک آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ ایک پریچٹ کے نکلنے پر۔ ایک کھیل خوب صورت  
تھی۔ جس کی کوئی دھک آ سکتا تھا۔

”جہاں می خوابوں کا ملک تک نہیں کرنا اب تم نے..... مئی کا خیال رکھنا ہے۔“ شیردل اب الوداعی کلمات کہہ رہا تھا مثال سے

اور اس سے ایک کے بعد ایک وعدہ لے رہا تھا۔

”میں کوئی نونہ دو۔“ اس نے مثال کو آخری ہدایت دے ہوئے کہا۔  
 ”شیر دل تہی سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ مجھے قبول جاتے ہو۔“ شہر بانو نے فون پکڑتے ہی کچھ ٹھکی سے اس سے کہا اور اس کا یہ سہرا بیک صدمہ لے کر اٹھا۔

”میں تمہیں کہے بغول کہاں سویت ہارٹ؟“ عکس کی سہرا لہری ہوئی تھی۔ چائے کا ٹافلی کپیتل پر پڑے ہوئے اس نے چندھوں کے لیے شیر دل سے نظر تھائی تھی اور باگل اس لیے شیر دل کو پہلی بار احساس اورد کہہ کہاں تھا۔ شہر کو کو اگلی علامت کے حوالے سے کچھ دایات دیتے ہوئے اس نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے فون بند کیا اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں گھر سے کہا۔

”سوری یار..... سو دو دنوں نیویارک پہنچی ہیں۔ شہر باؤ پہلی ہارٹل کے ساتھ اکیلے اتنا سفر کر رہی ہے اس لیے میں تھوڑا بے چین ہوں۔“ عکس نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کائی۔

”میں نے کچھ کہا؟“

”نہیں تم نے کہا تو نہیں..... لیکن میں پھر بھی سوچ رہا تھا کہ کچھ زیادہ ہی لمبی بات ہوگئی ان لوگوں کے ساتھ میری۔“ وہ ہیلن واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”تم کیسا سوچ رہی ہو۔۔۔؟“ شہر دل کو جانک خیال آ رہا ہے وہ کسی سوچ میں غرق ہے۔  
 ”شہر بانو! اور مثال پر ڈھنگ آ رہا تھا مجھے۔۔۔ عکس نے اپنا ہنسا کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک لحظہ کے لیے  
 شہر دل حیران ہوا۔ عکس سے ایسا جملہ آتا ہے غیر متوقع تھا۔

”احمہ؟ اور کس لیے؟“ وہ پہلے استعجالی انداز میں ذرا سا ہنسا پھر اس نے کہا۔

”تم بہت اچھے شوہر اور باپ ہو شیر دل۔“ عکس نے مسکراتے ہوئے اسے

ملک نامہ ایڈیٹر۔۔۔ اپریل 2012ء 29



”جانتی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

”انتخاب غلط تھا کیا؟“

’بس ایک دم سے پروگرام بنالیا تم سے ملنے کا۔‘ اس آدمی نے مسکراتے ہوئے عکس سے کہا۔

آپ جہاں پوسٹڈ ہیں وہاں تو اکثر کام پڑتا رہتا ہے ہم لوگوں کو..... میرا خیال ہے آپ سرتو ایسا...

یہاں سے ہی جو ابائی گرم بولی کے ساتھ اس سے کہا۔ دوبارہ اپنی لشت سنبھالنے کے بعد شیر دل

سرساڑی گاڑی کی بجائے پر پیچھے جی ٹی روڈ پر شام کے دھند لکے میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وہ نہ جانتے

.....اے بھی مس کی زندگی میں آنے والے کسی مرد پر رشک نہیں آیا تھا۔ اے صرف حسد ہوتا تھا۔

”مجھے تو حسد ہوتا اگر میں وہاں انوائسڈ ہوتی اور میں تمہارے بجائے کسی اور کو best probationer کا

”STP ابھی باقی ہے مگر“ شیردل نے جیسے اپنے ماں باپ کو assurance دینے کی کوشش کی۔

تعداد سوال نہیں بتائی۔

پیدا ہوئی۔ سیر دل نے دیکھو سیر میں جو ہر کاسری سر اس کے پاس سے ہارے میں گواہیں۔

ہوئی۔ کسی کاروباری گھرانے کو تو شیردل کی میلی بہت بچلا درجہ ہی دے سکتی تھی۔

ڈال رہا تھا۔

یقین نہیں آتا۔

”اے، ہو سکتا تھا۔“ اگر ہمارے دل نے اپنے مات کو حے سنجہ کی سے اپنی بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتے دیکھا۔

You can't be serious" (اے بھائی، سنجیدہ نہیں ہو سکتا۔) اس کے بچے میں سے اس دوروں کو

”دہ اچھی کہاں سے ہے مُمی.....؟ سی ایس ایس میں ٹاپ کر لینے یا best Probationer ایوارڈ لے کر؟“

”ایسے ہی سوچا ہے ہم کو نیا سا تمہاری شادی واقعی اس کے ساتھ طے کرنے جا رہے ہیں۔“ اس کی ماں نے اسے خفا

مر اعلیٰ..... کوئی پیچ ہی نہیں سے ہم دونوں کا۔ "شرر دل نے بے حد بنجیدگی سے اپنی چائے ختم کرتے ہوئے کپ رکھا۔

”وہ اتنی بری ہے؟“ اس کی ماں کو ایک عجیب سی کڑی ہوئی کس کے بارے میں۔

”she is just average“ (وہ سب ٹھیک ہی ہے) شیردل نے بے حد محنت سے کہا۔  
اور اس نے اضافہ کیا۔ ”very ordinary“۔ ”دوسرے اضافے پر ایک لمحے کے لیے دوسو ج میں پڑا۔ کس اس کے تصور میں آئی تھی اور اسے لگا اس کی وضاحت کچھ مناسب نہیں تھی۔

(میرا مطلب ہے کہ وہ اتنی بری لڑکی نہیں ہے لیکن وہ میرے مزاج کی لڑکی نہیں ہے۔“ چند لمحوں میں ہی اس نے گزربوا کر اپنے ہی پٹیل کی بچہ بچ کی۔  
”دو پے کو کسی لڑکیاں پسند ہیں؟“ شیردل کی ماں کو یک دم جیسے اس موضوع پر اس سے تفصیل سے بات کرنے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔

”کس اور اکیس کے علاوہ مجھے ہر لڑکی پسند ہے۔“ اس با شیردل نے کندھے اچکا کر جیسے مذاق میں ایک بات کی۔  
”کس کی تو ہم بات ہی نہیں کر رہے؟“ اس کی ماں نے کہا۔  
”ایسے ہی کہہ دیا میں نے۔۔۔ اور پھر آپ یہی بتائیں create کرنے کی کوشش نہ کریں بیٹی اچال۔ مجھے

ابھی STP پوری کرنی ہے۔ پھر اپنی پہلی پونٹک کے دوران تو کم از کم اس طرح کے کسی مسئلے میں دلچسپی نہیں ہے۔“  
شیردل ماں کے ارادے پر ہانپتے ہوئے لپلا۔  
”میں صرف انجینئرنگ کا سوچ رہی تھی۔“

”آپ کا بھی محنت سے سوچیں best Probationer کے ایوارڈ لینے کی اتنی بڑی سزا تو نہیں ملنی چاہیے تھی۔“ وہ اچھٹ کرنا ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باپ سکرا دیے تھے۔ کمرے سے باہر نکلے ہوئے بھی شیردل کو اپنے باپ کی خاموشی پر ہی دلچسپی تھی۔ انہوں نے گفتگو میں بہت کم حصہ لیا تھا اور وہ مسلسل سنجیدہ رہے تھے جو ایک جملہ انہوں نے بولا تھا۔ شیردل کو لگنے کی طرح چھب گیا تھا۔ STP کے best Probationer کا ایوارڈ اب اس کے لیے عزت کا مسئلہ بن گیا تھا۔

☆☆☆

”وہ ذہن کا کلوا میرے لیے عزت کا مسئلہ نہیں ہے چڑیا۔ وہ 20 سال کی حق حلال کی کمائی ہے میری۔۔۔ خون پسینے سے کمائی جانے والی ایک باپ کی اکٹھی کر کے خریدی گئی وہ ذہن۔۔۔ میں اسے اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا۔“ خون چڑیانے عجیب تکلف کے احساس کے ساتھ ہانپتا ناؤ کو بیکھا۔

وہ اچھی کچھ پہلے حالات سے لگنا تھا اور اب وہ اور چڑیا بس پر بیٹھے وہاں شہر جا رہے تھے۔ خردین کے کندھے ایک باہر پھر عجیب سی شکست خوردگی کے عالم میں جھکے ہوئے تھے۔ چڑیانے تھکدوئی سے اپنے ناؤ کو بیکھا۔ خردین کے لیے ان کی بھی پوچھیں کر سکتی تھی۔ لیکن اب کم از کم سب کچھ تھی اور وہ اس وقت وہی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔  
”میں اب اس ذہن کی ضرورت نہیں سے نا۔۔۔ اس کو بچ کر بھی میں اتنے پیسے نہیں ملیں گے جن سے ہماری

زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی آجائے۔ ہمارے پاس کمرے۔۔۔ آپ نے اپنی دکان بھی خرید لی ہے۔۔۔ میں میڈیکل کالج جاری ہوں۔۔۔ میں اس ذہن کے لیے اب ذیل کوں کے ضرورت نہیں ہے۔“ چڑیانے خردین کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کس کے شور میں ڈورے بلند آواز میں کہا۔  
”ہر چیز کو پیسے سے توڑی جا تا ہے۔ بعض چیزوں کی قدر پیسے کی وجہ سے نہیں ہوتی چڑیا۔ وہ میری حق حلال کی

کمائی ہے۔۔۔ کسی کا حصہ جھینے تو نہیں گیا تھا۔۔۔ اپنی چیز لینے گیا تھا۔۔۔ اتنا بھی نہیں سمجھے گا کہ چیز لینے کے لیے میں قانون کا سہارا لگ سکوں۔“ خردین بات کرتے کرتے رو پڑا، چڑیانے بے حد تکلیف سے اپنے ناؤ کو بیکھا۔ اسے

لو سال پہلے تکلف اور یہی یاد آتی تھی۔۔۔ اور پھر چند دنوں سے بار بار یاد آ رہی تھی۔  
”ممت رو میں نا۔۔۔ اس نے ٹھوکر آواز میں خردین سے کہا۔ خردین نے یک دم خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ چڑیا کے سامنے رو تاہیں جا رہا تھا۔ یہی اس کا کوئی اظہار نہیں چاہتا تھا۔

نوسال کے بعد خردین چڑیا کے ساتھ بڑے غر سے گاؤں آیا تھا۔ اب اس کی جیب میں پیسے بھی تھے اور اس کے سر پر نوسال پہلی طرح ایک جوان بیٹی اور ایک چھوٹی بیٹی کا پوچھنا تھا۔ وہ گاؤں آ کر اپنے اسی دوست کے پاس ٹھہرا تھا جس نے کئی سال پہلے گاؤں سے شہر جانے سے اس کی بات یاد کی تھی۔ خردین نے اپنے رشتے داروں سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی نہ ہی اس کے رشتے داروں نے اسے منگایا تھا۔ گاؤں میں اب خردین کی عزت تھی کیونکہ خردین وہاں اس طرح بس چند دن رہنے آیا تھا جس طرح سرکاری نوکری کے دوران آ کر رہتا تھا۔ اس کے سبب جرنل اور گاؤں والے اس کی شخصی عزت کر سکتے تھے انہوں نے کی۔ وہ اس گاؤں کی پہلی ڈاکٹر لڑکی کی جو کئی لگا کر آیا تھا وہ کی زیادہ نظر نہیں آئی۔ شاید اس لیے کیونکہ چڑیا ابھی میڈیکل کالج میں تھی مگر ڈاکٹر ہی نہیں تھی اور اس لیے بھی کیونکہ وہ ایک لڑکی تھی۔ وہ بھی ایسی لڑکی جس کا واقعہ انجین گائوں کے ہر بڑے بڑے کو برا تھا۔

خردین کو شہر میں ساری زندگی گزارنے کے بعد ان کے تعلیم پر کوئی بھی پانی پڑا تھا تو گاؤں والوں نے اسے چکانا چور کرنے میں کوئی رک نہیں چھوڑی تھی۔ لوگوں کو اس سے یہ جاننے میں رکھنا تھا کہ اس کے حال میں جو بری سے دال کی دکان بنائی گئی تھی وہ بھی اس کے دور دورہ کے نکتے کا دور تھے جیالینا تھا۔ اور گاؤں گاؤں میں سے کسی اور کے شہر جا کر دال کی کوئی کر رہی لگانے میں دیا اس کو پتہ جیسا خردین کے لیے ہوا تھا۔ لیکن کسی نے خردین کی ڈاکٹر ی بڑھنے والی نواسی کے بارے میں زیادہ نہیں پوچھا تھا کیونکہ وہاں کی کوئی بیٹیوں یا لکڑیوں کو ڈاکٹر تو کیا ابتدائی تعلیم سے زیادہ پڑھانے کی بھی خواہش نہیں کی۔ وہ عورت کے اس کی دلی اور حیثیت سے خوش تھے جو صمدیوں سے ان کے علاقے میں عورت کی تھی۔ چڑیا ڈاکٹر بن کے وہاں آئی ہو تو شاید پھر بھی وہاں اس کی قدر ہوئی۔ مفت دوا اور علاج کی غرض بہت سے لوگوں کو غرض مند بنا کر ان کا احسان مند کر دیتی لیکن بیٹی خردین کا کھڑے گاؤں والوں کے نزدیک کسی کام کا نہیں تھا۔ ان کے نزدیک شہر میں خردین کے کام میں ہونے والی ترقی نہ ہو پڑی تھی۔ یہاں تک کہ اپنی بیٹی کو کویت اچھی جگہ دوا رہا دیا بھی قابلِ تحسین تھا۔ لیکن چڑیا کو وہ ایک ڈاکٹر نہیں جس کے لیے خردین نے بچپن سے خواب دیکھے تھے۔ جس کے لیے خردین نے راتیں محنت کرتے کاٹی تھیں۔

خردین نے گاؤں آتے ہی چھوڑ کر بیٹی کی اس نے یک دم اس کی ٹھنکی کی سالوں پرانی کدورت اور شنی کو جیسے چکا دیا تھا۔ خردین نے گاؤں آتے ہی چڑیا کے منع کرنے کے باوجود اپنے خاندان پر جھلماڑی کے ذریعے اپنی زمین بھلیا لینے کی ایف آئی آر کوڈر لڑکی تھی اور تھا نے دار نے اس کے طے اور بول چال سے متاثر ہوتے ہوئے بچے لے دیے بغیر ہی ایف آئی آر صرف رجسٹر کر لی جی بکلاس پر فوراً کارروائی کرنے کی کوشش بھی کی تھی اور یہی کوشش جیسے ایک پیٹرنڈ باکس کھولنے کے برابر تھا۔

☆☆☆

”فنی اچال تو شادی کی بات کرنا اور سوچتا بھی پیٹرنڈ باکس کھولنے کے برابر ہے۔“ ایک نے فاطمہ کے اس مطالبے پر کہ وہ اپنی اپنی اور ٹھنکی کو اس کے کھر شرٹہ لٹکنے کے لیے لائے جواب دیے ہوئے کہا۔ فاطمہ اس کی بات پر کچھ دیر کے لیے جیسے ٹھہر گئی تھیں۔

”پیٹرنڈ باکس کس اعتبار سے کہہ رہے ہو؟“ وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک چند لمحے بڑی سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھا رہا پھر اس نے کہا۔  
”میری بچھلے سال اپنی کزن سے گجٹ ہوئی ہے۔“ فاطمہ کو لگا اسے سننے میں کوئی غلطی ہوئی تھی۔  
”تم نے کیا کہا؟ میں نے سنا نہیں۔“



”میری انجمن ہو چکی ہے لیکن میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہ ختم ہو جائے۔“ مجھے خود اوقات چاہیے ایک ڈیڑھ سال میں، میں اس مسئلے کا کوئی حل نکال لوں گا۔“ فاطمہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھ رہی۔ اس کے لیے یہ ناقابل یقین تھا کہ ان کے اس طرح کے تعلق کے باوجود ایک نے چپ چپاے تعلق کر لی تھی فاطمہ کو اس بارے میں بتایا نہیں تھا۔

”تم نے مجھ سے درخواست کی؟“ اس نے بالآخر ایک سے شکایت کی۔  
”تم سے کیا کر رہا تھا۔“ تم خواہو اور میں اور تم اپنی ہی بات کہیں تو میں بھی کہاں خوش رہ سکتا تھا۔“ ایک نے بڑی جھجکی سے اس سے کہا۔

”لیکن ایک یہ بہت بڑی بات تھی۔ ایک سال ہو گیا تمہاری جتنی کو اور تم نے مجھے بتایا نہیں۔“  
”میں نے کہا تھا میں اس رشتے سے خوش ہوں یہ نہیں اور نہ ہی مجھے وہاں شادی کرنی ہے۔“ پھر جھٹکی کا ہونا نہ ہونا اور اس کے بارے میں بتانا یہ بتانا کوئی نہیں رکھتا۔“ ایک نے اسی جھجکی سے کہا۔  
”میرے لیے رکھتا ہے ایک۔“ مجھے بے خبری میں رہنا اور کچھ تو بے رہنا بھی اچھا نہیں لگتا۔“ فاطمہ نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا تھا۔

”میں جتنی تم کو اس کی کوشش کر رہا تھا۔“ ایک نے کچھ کمزور داز میں اسے وضاحت دی۔  
”پھر میں بتانا چاہتا تھا۔“ فاطمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔  
”مجھے خود شہقا کہ تم فاطمہ کو مجھ سے الگ ہو جاؤ گی۔“ اس کی وضاحت نے کچھ دیر کے لیے فاطمہ کو جیسے لاجواب کر دیا۔ کچھ کہنے کے بجائے اس نے اپنی کتابیں میٹھا شروع کر دیں۔  
”تم اس طرح مجھ سے تھا ہو کر جاؤ گی تو میں بہت اپنی ہی رہوں گا۔“ ایک نے اس کو گور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں ہوں۔“ ہرٹ ہوئی ہوں اور میرا خیال ہے مجھے اس کا حق ہے۔“ وہ کہتے ہوئے کبھی دھکیل کر لائبریری کی میز پر پڑی اپنی کتابیں اٹھا کر کھڑی ہوئی تھی۔ ایک ایک کھڑا ہو گیا۔

”I am sorry“ اس نے مدغم داز میں جیسے فاطمہ کا ایک بار پھر ممانہ کی کوشش کی۔ فاطمہ کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے نکل آئی۔ دل ٹوٹے جیسے جیسے اس نے پہلے کی بات سے اور وہ نہ کر سکتی تھی۔ میڈیکل کالج اسٹوڈنٹ ہونے ہوئے یہ یقین نہ کرنا کہ پیار میں ناکی پر دل تو ٹوٹ سکتا ہے بالکل ناممکن تھا لیکن لائبریری سے ہال تک کا سفر کرتے ہوئے فاطمہ کو پہلی بار اس تکلیف دہ احساس سے گزرتا پڑا۔ کالج اور ہال میں وہ لڑکیوں کی صفیں ہوتے اور ٹوٹے دھتکتے تھے۔ انفر جیلے اور پھر اس طرح پر ایک ایک ہوجاتے اور زندگی چلتی لیکن پچھتیں بدلنا تھا۔ لڑکیاں کچھ دیر روٹی دھتی تھیں پھر ٹھیک ہوجاتی تھیں۔ پہل جاتی تھیں۔ ان کی گفتگو میں آئے وہ کم داز نام کی بہت جلدی اور بھی بہت دیر سے تھیں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اور اس کی چیزوں کو بہت بار دیکھتے رہنے کے بعد بھی وہ اپنے اندر ایسا جھول نہیں پائی تھی اس کی زندگی میں سے مائنس کر کے دیکھتے تھے اپنی زندگی میں ایک کے بجائے کسی دوسرے مرد کا تصور کر پاتی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کے ساتھ کی خواہش کی تھی کسی کے ساتھ کی خواہش کے لیے اسے گور کھڑی دیکھ رہی تھی گرائی تھیں اور اب اس کے یوں قدم پیچھے ہٹا لینے پر کچھ دیر کے لیے فاطمہ کو ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بھیم کے پیچوں سے لکڑی ہو رہی۔

پہلے آنے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک نہ دانغ کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی رہی تھی اس کا ذہن ابھی تک یہ ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اپنے اس کو عام لڑکیوں کی طرح کمزور سمجھتا تھا۔ یہ جانتی تھی کہ پہلے کسی کمرے میں بیٹھ کر وہاں پر بار بار دروازہ پر اور لڑکیوں کا بیچ اٹھا کر کے ان کے ساتھ اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کو پیش کر لیکن عجب بات تھی اس تکلیف سے گزرتے ہوئے اس کا دل بھی جلی چاہ رہا تھا۔ بستر پر

”میری انجمن ہو چکی ہے لیکن میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہ ختم ہو جائے۔“ مجھے خود اوقات چاہیے ایک ڈیڑھ سال میں، میں اس مسئلے کا کوئی حل نکال لوں گا۔“ فاطمہ چپ چاپ اس کا چہرہ دیکھ رہی۔ اس کے لیے یہ ناقابل یقین تھا کہ ان کے اس طرح کے تعلق کے باوجود ایک نے چپ چپاے تعلق کر لی تھی فاطمہ کو اس بارے میں بتایا نہیں تھا۔

”تم نے مجھ سے درخواست کی؟“ اس نے بالآخر ایک سے شکایت کی۔  
”تم سے کیا کر رہا تھا۔“ تم خواہو اور میں اور تم اپنی ہی بات کہیں تو میں بھی کہاں خوش رہ سکتا تھا۔“ ایک نے بڑی جھجکی سے اس سے کہا۔

”لیکن ایک یہ بہت بڑی بات تھی۔ ایک سال ہو گیا تمہاری جتنی کو اور تم نے مجھے بتایا نہیں۔“  
”میں نے کہا تھا میں اس رشتے سے خوش ہوں یہ نہیں اور نہ ہی مجھے وہاں شادی کرنی ہے۔“ پھر جھٹکی کا ہونا نہ ہونا اور اس کے بارے میں بتانا یہ بتانا کوئی نہیں رکھتا۔“ ایک نے اسی جھجکی سے کہا۔  
”میرے لیے رکھتا ہے ایک۔“ مجھے بے خبری میں رہنا اور کچھ تو بے رہنا بھی اچھا نہیں لگتا۔“ فاطمہ نے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا تھا۔

”میں جتنی تم کو اس کی کوشش کر رہا تھا۔“ ایک نے کچھ کمزور داز میں اسے وضاحت دی۔  
”پھر میں بتانا چاہتا تھا۔“ فاطمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔  
”مجھے خود شہقا کہ تم فاطمہ کو مجھ سے الگ ہو جاؤ گی۔“ اس کی وضاحت نے کچھ دیر کے لیے فاطمہ کو جیسے لاجواب کر دیا۔ کچھ کہنے کے بجائے اس نے اپنی کتابیں میٹھا شروع کر دیں۔  
”تم اس طرح مجھ سے تھا ہو کر جاؤ گی تو میں بہت اپنی ہی رہوں گا۔“ ایک نے اس کو گور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں نہیں ہوں۔“ ہرٹ ہوئی ہوں اور میرا خیال ہے مجھے اس کا حق ہے۔“ وہ کہتے ہوئے کبھی دھکیل کر لائبریری کی میز پر پڑی اپنی کتابیں اٹھا کر کھڑی ہوئی تھی۔ ایک ایک کھڑا ہو گیا۔

”I am sorry“ اس نے مدغم داز میں جیسے فاطمہ کا ایک بار پھر ممانہ کی کوشش کی۔ فاطمہ کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے نکل آئی۔ دل ٹوٹے جیسے جیسے اس نے پہلے کی بات سے اور وہ نہ کر سکتی تھی۔ میڈیکل کالج اسٹوڈنٹ ہونے ہوئے یہ یقین نہ کرنا کہ پیار میں ناکی پر دل تو ٹوٹ سکتا ہے بالکل ناممکن تھا لیکن لائبریری سے ہال تک کا سفر کرتے ہوئے فاطمہ کو پہلی بار اس تکلیف دہ احساس سے گزرتا پڑا۔ کالج اور ہال میں وہ لڑکیوں کی صفیں ہوتے اور ٹوٹے دھتکتے تھے۔ انفر جیلے اور پھر اس طرح پر ایک ایک ہوجاتے اور زندگی چلتی لیکن پچھتیں بدلنا تھا۔ لڑکیاں کچھ دیر روٹی دھتی تھیں پھر ٹھیک ہوجاتی تھیں۔ پہل جاتی تھیں۔ ان کی گفتگو میں آئے وہ کم داز نام کی بہت جلدی اور بھی بہت دیر سے تھیں تبدیل ہو جاتا تھا۔ اور اس کی چیزوں کو بہت بار دیکھتے رہنے کے بعد بھی وہ اپنے اندر ایسا جھول نہیں پائی تھی اس کی زندگی میں سے مائنس کر کے دیکھتے تھے اپنی زندگی میں ایک کے بجائے کسی دوسرے مرد کا تصور کر پاتی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کے ساتھ کی خواہش کی تھی کسی کے ساتھ کی خواہش کے لیے اسے گور کھڑی دیکھ رہی تھی گرائی تھیں اور اب اس کے یوں قدم پیچھے ہٹا لینے پر کچھ دیر کے لیے فاطمہ کو ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بھیم کے پیچوں سے لکڑی ہو رہی۔

پہلے آنے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک نہ دانغ کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی رہی تھی اس کا ذہن ابھی تک یہ ماننے کو تیار نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اپنے اس کو عام لڑکیوں کی طرح کمزور سمجھتا تھا۔ یہ جانتی تھی کہ پہلے کسی کمرے میں بیٹھ کر وہاں پر بار بار دروازہ پر اور لڑکیوں کا بیچ اٹھا کر کے ان کے ساتھ اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے کو پیش کر لیکن عجب بات تھی اس تکلیف سے گزرتے ہوئے اس کا دل بھی جلی چاہ رہا تھا۔ بستر پر



کے لیے اور ایک کی آنکھوں کے سامنے فاطمہ کے ساتھ ہونے والے بریک اپ کے نتیجے میں خمدیار جتنا نظر آ رہا تھا وہ اپنی انگلیوں میں بالکل ٹھیک تھا۔

”تم بہت ڈین اور لالائی اسٹوڈنٹ ہو۔ میرے بغیر تم کسی جگہ رہ سکتے ہو ایک..... پھر تمہاری بھی بھی ہیں تمہاری مدد کے لیے۔“ فاطمہ نے کہہ دوں اسے جانے کی کوشش کی۔ ایک بہت دور تک اسے مٹانے کی کوشش کرتا ہوا اس کے ساتھ چلا۔ بالکل فاطمہ نے اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کیا تھا اس دن وہ اپنے باہل آکر دو پہلی رات سے بھی زیادہ اب سیٹ اور اس کی..... سچلی رات ایک کا وہ دور تھا جس نے اسے پریشان کیا تھا لیکن اسے امید بھی دلائی تھی اور آج ہے اس کا اپنا فیصلہ تھا جو اسے پریشان کیے ہوئے تھا اور ایک سے تمام تعلقات ختم کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہ اس کا نہیں تھا وہ بری طرح نگرہ پروری تھی..... قطع تعلق کر لیا اس قدر اس کا نہیں تھا جتنا اس نے سمجھا تھا۔ اس رات اس نے بالآخر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ایک عام لڑکی کی طرح وہ ساری رات بیٹھ کر روتی رہی تھی اور اگلے دن اس نے کالج سے بغیر کسی وجہ کے خلیج چھٹی کی۔

”کیا ہوا چڑھا؟“ خمدین نے باہل سے اسے جانے والی کال پر اس کی آواز سننے ہی سے حد تویش سے کہلا۔ وہ جھوٹ بولنا چاہتی کی کہنا چاہتی تھی..... نانا چڑھیں..... لیکن وہ جھوٹ نہیں بولی کہ..... وہ دو چڑی تھی اور پھر روئی ہی تھی۔ خمدین بہت دو چپ چاپ اس کی سسکایاں اور چکیاں سنتا رہا پھر اس نے کہا۔

”ایک کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہے؟“

”نانا اس نے پچھلے سال مینیجر کی کال اور مجھے اس نے بتایا تک نہیں۔“ فاطمہ نے سسکیوں کے ساتھ خمدین کو بتایا۔ بہت دور خمدین صدمہ سے لگ رہا۔ سارے سوال جواب ایک دم جیسے دم توڑ گئے تھے اس کے لیے چڑیا کی تکلیف کو کون اس سے زیادہ کہہ سکتا تھا۔ چڑیا بہت زیادہ ورک اس کے ساتھ نہیں کر سکی کال ختم ہوئی تھی لیکن اس رات وہ سونیں باقی..... طبیعت کی خرابی کا بھانہ نہ کہہ سکی وہ اپنی روم میس کے کمرے میں ہونے کے باوجود بھی بستر میں صدمہ چھپا کر روتی رہی تھی۔

اس کی زندگی نہ چاہتے ہوئے بھی کالج جانے کے لیے تیار ہو کر باہل سے نکلی تھی اور اب اس نے باہل کے دروازے پر صدمہ سے چادر کی نعل مارے اور اٹھتے ہوئے خمدین کو بیٹھے دیکھا۔ وہ اسے اختیار اس کی طرف آئی تھی۔

”نانا آپ اس وقت یہاں؟“ خمدین اس کی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر چڑیا کو دیکھ کر وہ جیسے یک دم مطمئن ہوا۔

”میں کل رات تم سے بات کرنے کے بعد مجھے چین نہیں آیا۔ میں رات کو یہی نکل آیا تھا تم سے ملنے کے لیے لیکن اجازت نہیں کی تم سے ملنے..... کیونکہ بہت رات ہو گئی تھی۔“ خمدین نے اسے اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ فاطمہ کا دل بے اختیار ہلکا ہوا۔ اس عمر میں اس کے لیے ہر دنوں کی وہ رات باہل کے اس گیٹ کے پاس کھلے آسمان کے نیچے گزرا ہوا تھا چائیں زندگی میں اس کو کتنی بار خمدین کے لیے تکلیف کا باعث بننا تھا۔ فاطمہ کو اپنے آپ پر جیسے شرم آئی تھی۔

”کون دن وہ کالج جانے کے بجائے خمدین کے ساتھ سلس کوڑ میں چلی گئی تھی۔ وہ سارا دن اس نے ریس کورس کی ایک شیٹ پر خمدین کے ساتھ بیٹھے ہوئے گزرا دیا۔ انہوں نے بہت ساری باتیں کیں لیکن اس میں سے کسی بات میں ایک کا ذکر نہیں تھا۔

”میں بہت اچھا جیون سنبھال رہا تھا۔“ جانے سے کچھ دور پہلے خمدین نے یک دم ہنا کی تہدید اس کے اسے کہا۔ فاطمہ نے چونک کر خمدین کو دیکھا پھر ایک دم تہدیدہ سکر امٹ کے ساتھ اس نے خمدین سے کہا۔

”آپ کو کیسے ہے؟“

”کیونکہ تم بہت اچھی ہو۔“ خمدین نے اس سے محبت سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”اور تم بہت باہادر ہو۔“ سمجھ رہا تھا۔

”نانا زندگی میں ایک چیز قسمت بھی ہوتی ہے۔“ فاطمہ نے بڑی رغبت کے ساتھ خمدین کی بات کاٹ دی تھی۔ ”آپ ہی کہتے تھے قسمت بڑی چیز ہوتی ہے۔“ اس نے کم آنکھوں کے ساتھ خمدین کو کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔ خمدین ایک لمحے کے لیے بول نہیں سکا پھر اس نے چڑیا سے کہا۔

”اور تم کتنی محنت نانا جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو میں ایک کھیل بناؤں گی جس کی طرح کا جس میں کوئین ہی بادشاہ ہوگی۔“ چڑیا کی آنکھیں آنسوؤں سے مریں۔

”زندگی اور کھیل میں بہت فرق ہوتا ہے نانا۔ کھیل کو ہم کھیلنے میں لیکن زندگی میں کھاتی ہے۔ ہم زندگی کے ہر لمحے ہوتے ہیں زندگی کو ہر لمحہ پاس نہ سکتے۔“ خمدین نے بہت دیر اس کا چہرہ دیکھتے دیکھتے یک دم سکر دیا۔

”ایک زمانہ ہوتا تھا چڑیا جب تم میری ہر بات اس کی سنیں۔“ خمدین نے مٹھری ماسے لے کر کہا۔

”میں اب بھی آپ کی ہر بات اس کی سنیں ہوں۔“ چڑیا نے کہا۔

”اس لیکن اب تم جنس دفعہ اس کی باتیں کر رہی ہو جس کا جواب میرے پاس نہیں ہوتا۔ لیکن اس کی باتیں تو تم تب بھی کرتی تھیں جب بہت چھوٹی ہو کر تھیں۔“ خمدین نے کہا کہ وہ نے جیسے کچھ یاد آ رہا اور وہ اس رات فاطمہ کیس دن سکی تھی۔ وہ جتنی بھی خمدین اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”تم نے بہت خوب تمہارا دیکھی ہے؟“ خمدین نے یک دم چڑیا کو کھاب کر کے ہوتے ہوئے چڑیا نے پاک میں وضاحتی دھوپ کی مٹھری کو دیکھا جو پاک کے ایک کونے میں بیٹھ رہی تھی۔

”یاد ہے جب ہم پہلی بار اس شیٹ پر آکر بیٹھے تھے تو یہاں دھوپ کی پھر آہستہ آہستہ وہ دھوپ یہاں سے وہاں چلی گئی اور یہاں چھاؤں آ گئی۔“ خمدین نے سارا دن دھوپ اور چھاؤں کو ایک جگہ دیکھا ہے؟“ اس نے نرم آواز میں چڑیا سے پوچھا۔ اس نے ٹھنی میں سر لگادیا۔

”زندگی میں ایسی ہی ہوتی ہے اس میں بھی دھوپ چھاؤں ایک جگہ نہیں رہتی..... کبھی بے رن ہوتے ہیں پھر اچھے آجائے ہیں پھر اچھے کر جائے ہیں اور بے رن آجائے ہیں..... رہا میرا کوئی وقت کبھی کسی انسان کے لیے مستقل نہیں رہتا۔“ فاطمہ نے بے اختیار مٹھری کی سالی کی اور اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے خمدین سے کہا۔

”باتی سب ٹھیک ہے نانا لیکن میں نے اب بھی کسی سے محبت نہیں کرتی۔ یہ جو تکلیف آج ہی ہے تا میں نے..... یہ دو بار دہرنا نہیں چاہتی تھی۔“ فاطمہ نے اٹھتے ہوئے دو گانے خمدین سے کہا۔ وہ اب کھانے پینے کی دھند چڑی مٹی چڑی سہ رہی تھی جو سارا دن استعمال کرتے رہے تھے۔

”کل میری دکان پر ایک لڑکا آیا وہ مجھے بارہوا چھا۔“ خمدین نے اپنا یک اٹھتے ہوئے ایک مٹھری سانس لے کر فاطمہ سے کہا۔

”اور چھوٹا کورا چٹا تھا، یہ پوچھے اس نے اٹھتے سنا دیا تھا۔“ سکراری گاڑی میں آیا تھا۔ اس کے دوست کے ساتھ..... شاید باب وغیرہ مکراری انفرے..... مجھے پہلی نظر میں ہی اتنا اچھا لگا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ شادی اس کے ساتھ ہو۔“

فاطمہ نے ٹھیک کر خمدین کو دیکھا۔ خمدین کے لہجے میں ایک عجیب سی معصوم خواہش تھی..... اپنی چڑیا کو بیٹھ کی طرح سب سے اچھی نظر آنے والی چیز ہے کی خواہش..... وہ چڑیا کا نصیب کس قلم سے لکھا جاتا تھا چڑیا کو بھی جھپٹیں آئی تھی لیکن آج اپنی چڑیا بارہوا تھا کہ خمدین نے دکان پر دال کھانے کے لیے اسے دانے کی سرگرد ہو کر اسے چڑیا کا نصیب دے دینے کی خواہش کی تھی۔ چھلے وہ خمدین کو دیکھتی رہی پھر وہ اپنے نانا کی معصیت پر مڑ پڑی کی۔

”آپ بعض دفعہ عجیب باتیں بھی کرنے کے ہیں نانا۔“ چڑیا نے اس سے کہا۔

”جہیں جاتا ہے اس کا نام کیا تھا؟“ خمدین نے اس کی بات پر کوئی تہرہ کرنے کے بجائے جیسے اچھیک جیجی

مکر امٹ کے ساتھ چڑیا سے کہا۔ چڑیا کو یاد نہیں آئی۔

”نانا آپ اسے نام بھی پوچھتے بیٹھے؟“ اسے جیسے خمدین کی جذباتیت پر یقین نہیں آیا تھا۔





کوشش میں ہے۔ صبر و حوصلہ اور اذیت برداشت میں شمولیت۔ اسے کھڑے کو چند قدم چلائے ہوئے دائرے کے وسط سے دائرے کے اس سرے پر لے آئی گی جہاں سے وہ لوگ ہمیشہ trotting کا آغاز کرتے تھے اور شیر دل نے اسے ایک بار پھر اپنے کھڑے کو لایا لگاتے دیکھا۔ اس عورت کی برداشت اور بے مگرگی نے شیر دل کو اپنی کیا تھا، وہ یہ مانتے کو تیار نہیں تھا کہ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود درجنوں بار کھڑے سے گر چکا تھا اور اب ہر طرح ان انگریز اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تکلیف سے واقف تھا۔ عکس مراد علی سے زیادہ بہت اور حوصلہ کی بات نہیں تھی۔ اس طرح صرف شیر دل نے نہیں کیا تھا ان سترہ کے سترہ DMG پریکٹسز نے کیا تھا جن کو لایز کرتے ہوئے وہاں پہنچا گی۔

اور شیر دل کا اعزاز غلط نہیں تھا۔ عکس مراد علی نے اپنی تکلیف اور اذیت برداشت کرتے ہوئے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا مظاہرہ پہلی بار کیا تھا۔ اس کی کرکٹ کا خاصہ ایک ٹیم کے کی طرح دکھ رہا تھا اور اس میں سے کرکٹ کی طرح نکلنے والی ٹیموں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ نہ صرف بائی کا پورا وقت رائیڈنگ کرتی رہی تھی بلکہ اس نے اس دن معمول کی طرح ہر کلاس لی۔ وہ اس گروپ میں واحد عورت کی اور ان 17 مردوں کے سامنے اسے ایک مرد کی طرح کھڑے ہونا تھا۔ وہ اس سال پاکستان کے 17 ذہین ترین ذہنوں کے ساتھ اس DMG کیپس میں جیتن میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے کمر باندھ رہا تھا اور وہ ان سب کے لیے شام کا چائے بنا رہی تھی۔ اس رائیڈنگ رنگ میں چوتھے دن کرکٹ زمین پر گرسے کا آئینہ قافیہ میں تھا۔ وہ اگلے ساتھ ساتھ DMG کیپس کے کاسٹن روم میں سناٹے جانے والے جوس کا موضوع نہیں بنایا جاتی تھی۔

رات کو ڈانکنگ ہال میں ڈنر کے بعد شیر دل اس کے پاس گیا تھا۔ وہ جانتا نہیں چاہتا تھا لیکن کیا نہیں کیوں وہ وہ نہیں سکا۔ وہ اس وقت ویٹر سے کچھ کہہ رہی تھی جب شیر دل اس کے پاس آ گیا۔

ایسے ہی بھر شیر دل نے اس کے ساتھ دیکھا۔ "I hope you are alright now" اس نے عکس کے جواب میں کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اسے بالکل اطمینان دیا۔

"I am absolutely alright"

شیر دل اور وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب کھڑے تھے کہ شیر دل کو اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے ایک عجیب سا احساس ہوا تھا۔ عکس کی آنکھوں میں بھی ایسی ہی تھی جسے اس نے نظریں چڑا کر اور کچھ دیکھا تھا۔ وہ اب ہاتھ میں پکڑے سوئف کے کچھ دانوں کو کھینچ رہا تھا۔ وہ صرف نظر انداز کرتے ہوئے عکس کو نظر انداز کر رہی تھی۔ شیر دل کو لگا اسے وہ دم ہوا تھا۔ عکس کی آنکھوں میں کی..... اور کس لیے؟..... عکس نے پاؤں پیرونی دروازے کی طرف بڑھا دیے۔ شیر دل بھی پیچھے نہیں رکا۔ بہت خاموشی سے وہ ڈانکنگ ہال سے برابر چلتے ہوئے نکلے تھے۔ ہاسٹل کی طرف جاتے ہوئے شیر دل نے اس سے کہا۔

"کھڑے سے دو چار دفعہ گنا سردی ہوتا ہے۔ عکس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیوں؟ اس سے انسان کا کافریس بڑھتا ہے۔" وہ مسکرائی۔

"کافریس میں اضافے کے لیے اس سے زیادہ مناسب اور کم خطرہ طریقے بھی ہوتے ہیں۔"

"زندگی اور کھڑے آدمیوں کے لیے اس سے زیادہ مناسب اور کم خطرہ طریقے بھی ہوتے ہیں۔"

ایک دم پھر اسے دیکھا تھا۔ اس کی ہنسی کی عکس نے جب سے اعزاز میں اس کے دل کو چھو تھا۔

"آپ کو میری بات ابھی نہیں لگی؟" شیر دل نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "میں نے انجوائے کیا ہے آپ کی بات کو۔"

"آپ دوسرے آدمی ہیں جو اس غلطی پر رہا ہے۔"

"اور پہلا آدمی کو ہے۔" شیر دل نے عجیب سے عکس کے ساتھ اس کے پوچھا۔

"مجھے کیوں نہیں پوچھتا ہے؟" وہ اس دن جواد کے ساتھ اپنی دوسرا کورٹ شپ اور عکس کے بعد کا لاکر گیٹ کر رہی تھی اور اس آرکائیوٹ کا آغاز نہیں کیا تھا۔ یہ کام جواد نے کیا تھا۔

"تجربہ میری ہر بات پر اعتبار کرنا چاہیے۔" جواد کی گفتگو کی لگاتار عکس نے جواد کے پاس سے منگوا کر اسے اندر پائوس ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا اس کے آفس میں یوں آجائے کہ اسے جواد کے پاس سے ملے پر اسے وضاحت دے کہ صورت حال کو سنبھالنا تھا لیکن جواد کی گفتگو سے ہونے والا اس اس کے برعکس تھا۔ اسے لگا وہ

جیسے بلا واسطہ اسے وقتی طور پر آئندہ بھی اس کی کسی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے آیا تھا کیونکہ وہ سیاست میں آنے کی تیار کر رہا تھا اور میڈیا کا مخالف پارٹی اسے اور اس کے خاندان کو پورا نام کے لیے اب کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ وہ بار بار اس کی ایک بات کو بھرا ہوا تھا اور یہ بات اس نے آئی بار پور ہائی کی کہ بے حد صحت سے مزاج کی ہونے کے باوجود عکس کو خفا کیا تھا۔

"یہ دنیا کی خوشی دہجہ کے بغیر نہیں بنام کرنا چاہیے؟ تم پاکستان کے کوئی بہت بڑے سیاست دان نہیں ہو جواد..... اور میری کچھ بات تو نہیں آ رہا کہ بیٹھے بٹھے نہیں سیاست میں آنا شروع کیسے ہو گیا۔ تم نے ہمیشہ مجھ سے کہا کہ اگر تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے اور..... جواد نے پھر عکس سے اس کی بات کا کافی ٹی۔

"اب مجھے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ تم سے پوچھ کے نہیں کرنا اور پھر میں نے کل رات تمہارا attitude (رویت) اور اپنے ساتھ تمہاری loyalty (دقاری) کو دیکھ لیا ہے۔" جواد نے بے حد صحت سے اعزاز میں اس سے کہا۔

"میری loyalty اور میرا attitude عکس جیسے کچھ بگاڑا ہوا۔"

"میں وہاں پولیس اسٹیشن میں تھا تو تم نے میرے لیے کیا کیا؟..... تم ایسا کیوں کر کر سکتے ہو پوچھ کر ہیں کہ کیا میں واقعی شراب پیئے چلا آ گیا ہوں..... اور یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟ تم نے ایک دفعہ بھی انہیں کسی قسم کی مدد کی آخر تم کی۔"

"میں جانتی تھی اگر تم بے گناہ ہو گے تو جیسے کچھ نہیں ہوگا۔" چند لمحے کے لیے جواد کو کوئی جواب نہیں سوجھا پھر جیسے وہ بہت خفا ہو کر بولا۔

"میری پوری فیملی تمہاری وجہ سے مجھے ذلیل کر رہی ہے۔ میرا مذاق اڑا رہی ہے۔ عکس نے اس کی بات کا کاٹی۔

"جواد میری وجہ سے پولیس اسٹیشن نہیں پہنچے تھے۔"

"بار بار پولیس اسٹیشن کا ذکر اس طرح کرنا بند کر دو کہ جیسے میں کوئی مڑو کر کے وہاں پہنچا تھا۔" اسے جواد کی بات پر اتنا صبر نہ نہیں ہوا تھا جتنا اس کی بلندہ آواز سے۔ وہ اس بات کی بردا کیے بغیر کہ وہ اس کا آفس تھا اور وہاں باہر اس کا اسٹاف

Be-Belle  
INNERWEAR

Laces are romantic!



موجودہ جوائدر سے آنے والی ہر آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا۔۔۔۔۔ بلند آواز میں بول رہا تھا۔

ہوش میں آجاؤ گے اور تمہیں لگے گا کہ ہم دو پڑھے لکھے مہذب لوگوں کی طرح گفتگو کر سکتے ہیں تو پھر ہم بیٹھ کر اس ایٹھ پر بات کر لیں گے جس کے لیے تم اتنی دور سے آئے ہو۔“ عکس نے ایک دم اپنی سیٹ سے کھڑے ہوتے ہوئے اپنی فائلز سمیٹنے سے کھڑا ہوا تھا اور اس نے غصے سے تقریباً دو ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے اپنی پوری آواز سے اس سے کہا۔

”میں تمہارا اشاف نہیں ہوں تمہارا ہونے والا شوہر ہوں۔۔۔۔۔ تم مجھ سے ڈپٹی مشنر بن کر بات کرنے کی جرات بھی مت کرنا۔“ وہ چند لمحوں کے لیے جیسے کنگ کی رہ گئی تھی۔ ذلت اور توہین کے احساس سے زیادہ وہ جواد کا وہ نیاروپ دیکھ کر شاکن ہوئی تھی۔ وہ اس جواد سے آج پہلی بار متعارف ہوئی تھی۔ اتنے عرصے سے وہ ایک سو فٹ اسپون، بے حد تہذیب اور شائستگی سے بات کرنے والے ایک بہت خوش مزاج اور نفیس آدمی سے آشنا تھی جس کے ساتھ زندگی کا سفر کرنا اسے بہت آسان لگ رہا تھا۔

”تم ”ہونے“ والے شوہر ہو۔۔۔۔۔ شوہر نہیں اس لیے رعب جھاڑنے کی کوشش مت کرو۔ کم از کم اس طرح گلا پھاڑ کر نہیں۔۔۔۔۔ رشتہ صرف ایک انگوٹھی تک کا ہے جسے میں اگر ہاتھ سے اتار کر تمہارے منہ پر مار دوں تو تمہیں اس آفس سے اٹھوا کر باہر پھینکوا سکتی ہوں اور کسی بھی یہ مت سوچنا کہ میں یہ نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ چاہے میں مستحکم ہوں یا تمہاری بیوی۔۔۔۔۔“ اس نے بڑے محل سے شغف سے لہجے میں جواد سے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر گاڑی لکوانے کی ہدایت دی۔ جواد کا پارا سیکنڈر میں بیچے آیا تھا۔

”میرا خیال ہے میں کہیں اور چل کر بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔“ اس نے اپنا اگلا جملہ مدہم آواز کے ساتھ بدلے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ کم از کم آج کے اس مظاہرے کے بعد میں آج کہیں بھی تم سے بیٹھ کر بات نہیں کروں گی۔ مردکی مردانگی طاقت رکھنے کے باوجود اپنی آواز کو مدہم رکھنے میں ہے، ایک عورت کے سامنے گلا پھاڑنے میں نہیں۔۔۔۔۔ وہ عورت کو بھی آتا ہے۔۔۔۔۔ تم چائے پو، میں جا رہی ہوں۔“

”I am sorry“ وہ لمحوں میں اپنے اسی روپ میں آیا تھا جس سے وہ واقف تھی۔

”اچھی بات ہے لیکن ہم پھر بھی آج کوئی بات نہیں کریں گے۔“ وہ کہہ کر آفس سے نکل آئی تھی۔ اس وقت اس کا ذہن سنسنار تھا۔ ایک شادی شدہ زندگی کے کیا چیلنجز تھے اور کیا ہو سکتے تھے اس کا ایک مظاہرہ عکس نے دیکھ لیا تھا۔

”طاقتور ہوتے ہوئے بھی کچھ دیر کے لیے وہ عجیب بے بسی اور مخمضے کا شکار ہو کر بیٹھی رہ گئی تھی اور جواد ایک روایتی مرد کی طرح اسے اسی احساس سے دوچار کرنے آیا تھا۔ ایک طاقتور عورت کے کام کی جگہ پر اس کی تبدیلی کی کوشش۔۔۔۔۔ اسے نفسیاتی طور پر ہلانے اور خوفزدہ کرنے کا سب سے مؤثر اور کارآمد طریقہ یا شاید جواد کے لیے ایک رات پہلے ہونے والے واقعے کے بعد اپنی عزت نفس کو اپنے اور اس کی نظروں میں بحال کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں تھا یا پھر شاید یہ غصے کا وہ احساس تھا جو جواد کو کچھلی رات کے قہقہے میں عکس مراد علی کے بالکل نیوٹرل رہنے سے ہوا تھا۔۔۔۔۔ ایک ڈینس میگزین کے تحت وہ اپنے آپ کو مزید وضاحتوں اور صفائیوں سے بچانے کے لیے عکس برائٹ پڑا تھا۔۔۔۔۔ وہ وقتی اشتعال تھا یا سوچا سمجھا پلان۔۔۔۔۔ وہ جو کچھ بھی تھا اس کے مناج وہ نہیں نکلے تھے جو جواد چاہتا تھا لیکن اس واقعہ نے عکس کو بہت اپ سیٹ کیا تھا۔۔۔۔۔ پچھل رات سے بھی زیادہ۔

”مردوں کے بارے میں میرے اندازے ہمیشہ غلط ثابت ہوتے ہیں۔“ شیردل نے رات کو عکس کو دوبارہ کال کی تھی اور وہ چاہنے کے باوجود اس سے جواد کے ساتھ ہونے والی تلخ کلامی اور اپنی مایوسی چھپا نہیں سکی تھی۔

”یہ تو تم نے ٹھیک کہا تم واقعی بڑے غلط اندازے لگاتی ہو مردوں کے بارے میں۔“ شیردل نے اس کی بات کی

”فیئر انداز میں تائید کی۔ عکس نے اس کے انداز اور جے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔  
 ”ہر بار میری judgement بہت flawed (ناقص) نکلتی ہے۔“ وہ واقعی کافی دل شکستہ تھی، شادی سے  
 بچنے پہلے ایسی کوئی صورت حال کسی بھی لڑکی کو کسی طرح دل شکستہ کرتی اور وہ بہر حال ایک لڑکی تھی۔

”میری کچھ میں صرف یہ نہیں آیا کہ تمہیں جو ادملہی میں نظر کیا آیا تھا..... مجھے ایک نظر دیکھنے پر ہی وہ اچھا نہیں لگا  
 تھا۔ تم دو سال اس سے ملتے جلتے رہنے کے بعد بھی یہ نہیں جان سکیں کہ وہ ایک short tempered (غصے والا)  
 آدمی تھا جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود عورت کے ساتھ ہر طرح کی جہالت کا مظاہرہ کر سکتا تھا..... میں یہ تو نہیں مان سکتا  
 کہ تم محبت میں اندھی ہو گئی تھیں کیونکہ عکس مراد علی تم کو کوئی محبت میں اندھا کر سکتا تو ٹیکنیکل اسپیکنگ یہ اعزاز صرف مجھے  
 حاصل ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ کام میں بھی نہیں کر سکتا تو کوئی دوسرا اس کا اہل نہیں ہو سکتا..... تو واقعی سوچنے والی بات ہے یہ  
 کہ تم نے اس آدمی کو اتنا misread کیوں کیا، اس کے مزاج کے حوالے سے“ عکس نے اس کے ابتدائی جملوں کو  
 ایک بار پھر نظر انداز کرتے ہوئے اس کے آخری جملے پر کہا۔

”مجھے تو یہ تک پتا نہیں چل سکا کہ وہ ڈرنک کرتا ہے۔“  
 ”خیر وہ میرے لیے کوئی اتنا قابل اعتراض کام نہیں ہے۔“ شیردل نے اسے ٹوکا۔  
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یہ ایسی بات نہیں ہے جس پر تم کسی کوشا دی کے لیے رجحانیت کر دو۔ عادی ڈرنک ہونا اور بات ہے  
 اور سوشل ڈرنک کرنا ایک بالکل الگ..... بہت سارے مرد سوشل ڈرنک کرتے ہیں لیکن وہ بہت اچھے شوہر بھی ثابت  
 ہوتے ہیں۔“ شیردل نے بڑینجیدگی سے اس سے کہا۔ عکس نے یک دم اس کی بات کاٹتے ہوئے اس سے کہا۔  
 ”تم ڈرنک کرتے ہو شیردل؟“ شیردل اس سوال کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ حیرانی سے ہنسا تھا۔

”یہ کیا سوال ہوا؟“

”تم ڈرنک کرتے ہو شیردل؟“ عکس نے اپنا سوال دہرایا۔

”یہاں میری بات نہیں ہو رہی۔“ شیردل نے ایک بار پھر جواب سے بچنا چاہا۔

”تم ڈرنک کرتے ہو؟“ عکس اب بھی ڈائریکٹ تھی۔

”اگر کرتا ہوں تو تم کیا کرو گی؟“ شیردل نے جواب دینے کے بجائے الٹا پوچھا۔

”تم ڈرنک کرتے ہو؟“ اپنی اتنی طویل دوستی کے دوران آج پہلا موقع تھا جب شیردل نے عکس کو کسی بات کو اس  
 قدر اصرار سے پوچھتے دیکھا تھا۔

”نہیں۔“ شیردل نے بالآخر کہا۔

”میں جانتی تھی۔“ اس نے دوسری طرف عکس کے انداز میں ایک عجیب سا اطمینان محسوس کیا۔

”لیکن میں اسے برا نہیں سمجھتا۔“ شیردل نے ساتھ ہی کہا۔

”میں سمجھتی ہوں۔“

”کون سی چیز زیادہ قابل اعتراض ہے تمہارے نزدیک، بدتمیز اور شارٹ میمڈ ہونا یا شراب پینا؟“ شیردل نے  
 جیسے ایک عجیب احساس کے تحت اس سے پوچھا تھا۔

”شراب پینا۔“ عکس نے جواب دینے میں ایک لمحہ نہیں لیا تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔

”مجھے کبھی اندازہ نہیں تھا کہ تم شراب پینے والوں سے اتنی نفرت کرتی ہو..... کیوں؟“ عکس اس بار چند لمحے خاموش  
 رہی پھر اس نے کہا۔

”بہت سی چیزیں ہمیں پسند ہوتی ہیں اور کچھ پسند نہیں ہوتیں..... ہر پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے لیے وجہ کا ہونا  
 ضروری ہے کیا؟“





یادگارِ حقانے میں اپنے رہائی کر سے مگر اب ان کو ہے تو دھمکاتے ہیں کہ زمین کی جڑیں لانا ہے  
 حکم دیا تھا اور اسے نہ لانا ہے کی صورت میں جن نجات کی دھمکی دیا تھا وہی وہ قاطع اس کر سے ہے باہر آنے  
 بعد کی کے سامنے ہارنے کے قابل نہیں تھی۔ عجب دہشت کے عالم میں دو وہاں تھیں کہ ان کی اور جڑیں کی کو لاپتہ  
 قحطی آگئی تھی۔ وہ پاکستان کے بہترین اسکول کاغذ سے پڑھتے ہوئے پاکستان کے ایک بہترین میڈیکل کالج میں  
 تعلیم تھی۔ غیر معمولی ذہانت کی حامل ایک روشن مستقبل رکھنے والی لڑکی تھی۔ لیکن وہ پاکستان کے ایک دور افتادہ علاقے  
 میں ایک لوہاری کی ذات کی حامل ایک روشن مستقبل رکھنے والی لڑکی تھی۔ لیکن وہ پاکستان کے ایک دور افتادہ علاقے  
 صرف مجھ کو ہے مجبور کو نہ کھانے کی ترغیب داتا ہے۔ انسان اور دھند جانور ہے جو مجھ کو نہ ہونے کے باوجود مجھ  
 کسی دوسرے انسان کی ہڈیاں سمجھو کر کھانے کی ترغیب داتا ہے۔ انسان اور دھند جانور ہے جو مجھ کو نہ ہونے کے باوجود مجھ  
 زیادہ خطرناک اور کم طرف جانور ہے۔

بہت سال پہلے ایسی ایک کہانی تھی جو دین نے کیا تھا جو حالات سے باہر آنے کے لیے۔ اپنی زندگی کے لیے میں سے وہاں نہ کھانے کے لیے جس سے وہ وہاں پہنچ کر زندگی بچا پاتا۔ اوسال بعد وہ رجسٹری اس انس ایج اوکوشا کرتے ہوئے وہ ایسی ایک شخصیت فاطمہ نے کیا تھا۔ اپنی اوخر دین کی زندگی کو ایک بار پھر لیے کا ڈیر میں جانے سے بچانے کے لیے۔ وہ جاتی تھی اس رجسٹری کے خزانے ہو جانے کے بعد میں نے کا وہ کہہ دیا کہ دین میں کسی سے سنا کہ تین زمین کے ٹکڑے زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا باعث نہیں بنے چاہیں۔

سائے چڑیا کے نمودار ہوتے ہی خیر دین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا حالات کے اس کھلنے والے دروازے کی قیمت کیا تھی۔

لیسے اس گاؤں سے نکل آئے تب ایک پیچھے دوپٹی کے پھیر کر ہاتھ اس کے خاندان نے خریدیں کی ایف آئی کے جواب میں اس مقامی ایم پی اے کی مدد ملی جس نے سلفے میں وہ دو درختے اور جس کے لیے ایک ایف آئی آر کا صفحہ تھانے دار کی دلائی ایک بک سے غائب کرنا جیسے ایک چھوڑی طرح تھا۔

دو کون لوگوں اسے نظر آنے کے بعد چار اور دو گاؤں میں نہیں رہے۔ ایک سڑک میں آخر تک گئے گاؤں سے کہ وہ وہاں آئے تھے لیکن آخر تک گاؤں سے باہر کے لیے ان گاؤں کا ایک طرف تھا۔ خبریں بس کی گئی تھیں کہ باہر گیا چاروں میں سے چھپا ہے۔ دوسرا باہر کا فاطمہ اس طرح سے سبق لے کر اور ان سے لگائی رہی تھی..... اور اس سڑک میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے قادیان کی رہا تھی۔ وہ بھی کبھی کبھی لائی۔ ان کی بہت ساری سڑکوں میں صرف کئی ہو سکتی تھیں۔ سڑکیں میں اچھی نہ ہو سکتی تھیں۔ یہ درخت ہیں۔ وہ سڑکوں سے باہر تھا۔ چاروں میں سے ایک تھا اور وہ باہر سے قادیان کی رہا تھی۔ اس کے اندر سے وہ چوٹے سے ناکام رہا تھا۔

وہ انہیں بچا کر اپنے گھر کا سر پرچہ پیش کرنا کام نہ ہو سکا تھا۔ سرد ہاتھوں اور زور و جبر سے اساتھ ان کو تین بار پڑنے کے بعد بھی وہ اسے ایک گھنٹے پہلے اپنی ماں کی ایئر سیل پر جگمگاتے ہوئے لایا تھا۔ لیکن جیسے ہی کچھ دیکھ کر ان ہاتھ اور کمر کے روم و فلان میں بھی گھبراہٹ پائی۔ یہاں تک اس شخص پھٹ چکا تھا یا نہیں دیکھنا اور دیکھنا۔ مگر شریل اپنے بیویوں کے نیچے جیسے ان کو گڑا کر اٹھ رہا تھا۔ اس کے زخموں کے آثار تھے یا روبرو جیسے ان کو گڑا تھا۔

mess نہیں تھا وہ دلدل تھی جس میں اس کی فیملی چھپنے والی تھی..... دلدل شہد کی ہویا کچڑ کی..... وہ اپنے اندر سے نکلے نہیں دیتی جب تک انسان غرق نہ ہو جائے۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں



”اور یہ جونی وی پر شیف آتے ہیں۔“  
 ”وہ تو معاوضہ لیتے ہیں۔“  
 ”تم بھی معاوضہ دے دیتا۔“  
 ”ابھی میں اتنی امیر نہیں ہوں“ وہ چوٹھا صاف کرتے ہوئے بولی۔  
 ”یاد رہت امیر ہو۔“ وہ بولا۔  
 ”اچھا تم کو تو پتا نہیں تھا۔“  
 ”آخر تم میری بیوی ہو۔“ ارسلان چکا۔  
 ”ہاں یہ تو یاد ہی نہیں رہا۔“ وہ زور سے ہنسی۔  
 ”میں تو بہت امیر ہوں۔“ عالیہ نے ارسلان کے بازو میں ہاتھ ڈال کر محبت سے کہا۔ ”چلو اب ختم ہو گیا ہے۔“ عالیہ نے کچن کا دروازہ بند کیا اور ارسلان اسے ساتھ لگے کمرے میں داخل ہوا۔

گرم دودھ پی لیوں کی تومردی کم لگے گی مگر بھونیک سے گرم کر کے کرنے کی ذمت ہی نہیں کی۔“  
 ”امی جب عالیہ دودھ لاتی تھی بھاپ نکل رہی تھی۔“ ارسلان نے ماں کی طرف دیکھا۔ ”خشنڈی تو بہت ہے۔ اس لیے جلدی ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔“  
 ”دو چار جوش دے لیں تو ایسا نہ ہوتا۔ اچھا ابھی میں تو سونے جا رہی ہوں۔“ حمیدہ بیگم صوفے سے اٹھتے ہوئے بولیں۔  
 ”شب بخیر امی۔۔۔۔۔!“ ارسلان نے کہا۔ عالیہ جلدی سے کچن میں گئی، پانی کی بوتل اور گلاس اٹھا کر حمیدہ بیگم کے کمرے میں آئی، پیڑ پر گلاس اور بوتل رکھی۔ حمیدہ بیگم واضح روم میں تھیں وہ جلدی سے کمرے سے باہر آگئی۔ ارسلان لاؤنج میں نہیں تھا۔ اس نے کچن میں آ کر برتن دھوئے، چوٹھا اور شیف صاف کر کے وہ بولنگڈ پانی کی بوتلیں رکھ رہی تھی کہ ارسلان آ گیا۔  
 ”دوبھی تک انتظار کرواؤ گی؟“  
 ”آپ جانیں نا کمرے میں، میں آ رہی ہوں۔۔۔۔۔“ عالیہ نے فریج میں بوتل رکھتے ہوئے کہا۔  
 ”تمہارے بغیر کرا کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔“  
 ”یہ رومانس کا ناٹم نہیں ہے۔“ وہ مسکرائی۔  
 ”پھر کون سا ناٹم ہوتا ہے بھلا۔۔۔۔۔؟“ چلو کرے۔“  
 ”جین تو سننے دیں۔“ اس نے سالن کا ڈونگا فریج میں رکھا اور پلٹ کر صوفے پر تن رکھ کر رکھنے لگی۔ ارسلان سینے پر ہاتھ باندھے دروازے سے آگے آئے اسے دیکھ کر ہاتھ چڑھا بولا۔  
 ”مجھے بھی کوئی کام بتاؤ۔“  
 ”بے دین، کچن میں صرف عورتوں کے کام ہوتے ہیں۔“

حیرت سے پوچھا۔  
 ”ہاں کیا حرج ہے؟“  
 ”کیوں۔۔۔۔۔؟“  
 ”آج ذرا ٹھنڈ ہے تا تو دل چاہ رہا تھا۔۔۔۔۔“ مسکرا کر بولی۔  
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے بس دودھ پیو۔“  
 ”چائے نہ پلا جائے گی۔“ عالیہ نے کہا۔  
 ”میں پی لیوں گا، تم اپنے لیے دودھ لاؤ۔۔۔۔۔“ ارسلان نے دوسرا کپ بھی اپنے آگے کرے گا کیا۔  
 ”اچھا میں سوئے وقت پی لیوں گی۔“ عالیہ نے گک اپنی طرف کیا۔  
 ”ابھی۔۔۔۔۔“ ارسلان نے کہا چاہا کہ حمیدہ بیگم بول پڑیں۔  
 ”گھبر تو رہی ہے پی لے گی، تم تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہو اور ذرا شرم نہیں جنھیں کہ ماں سامنے چھٹی ہے چھلپیں سوچ رہی ہیں۔“ حمیدہ بیگم نے خفے سے کہا۔  
 ”امی یہ چھلپیں نہیں ہیں، میں خیال نہیں رکھوں تو۔۔۔۔۔“  
 ”تمہارا کیا خیال ہے، میں عالیہ کا خیال نہیں رکھتی؟“ بات کاٹ کر وہ چل کر بولیں۔  
 ”یہ بات نہیں ہے امی۔۔۔۔۔“ ارسلان گڑ بڑا گیا۔  
 ”پھر کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔۔۔ ایسی حالت میں عورت کی طبیعت اوپر نیچے ہوتی ہے، کبھی دل چاہتا ہے کوئی چیز کھانے کو کبھی نہیں زبردستی ٹھونسے تو تو کر دے گی۔“ حمیدہ بیگم نے اپنا دودھ کا گلاس یوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں غناغٹ پی کر بولیں۔  
 ”بھوک نہیں لگتا تھا؟“  
 ”کیا کیا تھا گرم۔“  
 ”مے لوٹیں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ دل تھا ذرا

سالگرہ منیب انکوتا بیٹا ہے، خاندان والے کیا کہیں گے کہ ارسلان کے پہلے بیچے پر سسرال والوں نے بیٹی کی گوبھرائی کی رسم بھی نہ کی۔“  
 ”خاندان والے۔۔۔۔۔“ عالیہ دھڑے سے ہنس دی۔ وہ تنگ کر بولیں۔  
 ”لو بیٹنی کی کیا بات ہے۔۔۔۔۔ میری تو بیٹیوں کے تین تین بیچے ہو گئے ہیں مگر میں نے ہر بیچے کی مرتبہ ان کی سسرال جا کر گوبھرائی کی۔ اس سے بیٹیوں کے سربل ہو جاتے ہیں۔ غم بھی ماں کو کھو بیٹا ادا دے تمہاری۔“  
 ”جی۔۔۔۔۔ کیوں کی۔۔۔۔۔؟“ عالیہ پرات اٹھا کر اندر چل گئی۔  
 ”عجب لڑکی ہے، جو بات کہو ہمارے ہاں یہ رسم نہیں دہر نہیں دے۔ یہ رئیس، رہنمائی تو پہچان ہیں ہماری۔“ حمیدہ بیگم بڑبڑا رہیں۔  
 ☆☆☆  
 رات کا کھانا کھانے کے بعد عالیہ نے برتن سینے اور کچن میں رکھ کر ڈرائنگ روم میں آ کر میز صاف کی۔  
 ”چائے نہیں لے گی بیگم۔۔۔۔۔؟“ ارسلان نے پوچھا۔  
 ”میں پانی چلے پھر آئی ہوں۔“ عالیہ نے جگ اٹھایا۔ ”امی آپ کے لیے بھی۔“  
 ”نہیں بھئی رات بھر نیند نہیں آتی۔ مجھے گرم گرم دودھ لا دو ایک گلاس۔“ حمیدہ بیگم جلدی سے بولیں۔  
 عالیہ نے چائے بنائی، ساں کے لیے دودھ گرم کیا، گلاس میں دودھ ڈالا، دوگ چائے کے کڑے میں رکھے اور گلاس بھی رکھ کر وہ باہر آئی تو ان پینا لاؤنج میں بیٹھنے کی وی دیکھ رہے تھے۔ عالیہ نے وہیں میز پر ٹرسے رکھ دی اور خود بھی بیٹھ گئی۔  
 ”تم بھی چائے پی رہی ہو؟“ ارسلان نے

52

Monthly Digest

SUSPENSE

سپنس

SARGUZHAST

سرگزشت

PAKEEZA

پاکیزہ

JASOOSI

جاسوسی

مکتبہ اہلا وسہلا

Sole Distributor

ویلکم بک شاپ

WELCOME BOOK SHOP

P.O.Box 27869  
 Karama, Dubai  
 Tel: 04-3961016  
 Fax: 04-3961015  
 Mobile: 050-6245817

Email: welbook@emirates.net.ae

JD Group of Publications



بیڑ پر بٹھا کر بولا۔

”جب آپ کی محبت کی پناہوں میں آتی ہوں تو ساری حسرتیں اتر جاتی ہیں۔“ عالیہ نے اس کے بازو سے گال رگڑتے ہوئے کہا۔

”ج“ ارسلان نے عالیہ کو پیار سے دیکھا۔۔۔۔۔

پھر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ”عالیہ! تم نے مجھے محبت کے ان رموز سے آشنا کیا جو مجھے پہلی بات تھے۔“

”اچھا۔“ عالیہ نے مصروفی جرت سے کہا۔

”حالانکہ کہتے ہیں اربن جیروں سمجھتا ہوتی ہے مگر میں کہتا ہوں ایسی بات نہیں ہے۔ بعض مرتبہ تو لومیر میں بھی سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔“

”یہ بات تو ہے۔“

”ہماری شادی کو آئندہ ماہ پور سال ہو جائے گا لیکن مجھے لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو جب تم میرے اس بچے جگائے کمرے میں آئی تھیں۔“

”آج آپ کو یہ سب کیوں یاد آ رہا ہے؟“

”دبھی دبھی دل چاہتا ہے تم سے اخبار محبت کروں۔“ عالیہ نے دہرائی۔

”پشنے کی کیا بات ہے؟“

”جناں کلیم ہونا چاہیے کہ کسی بھی نہیں بلکہ روز

ہی آپ محبت کی تجدید کر رہے ہیں۔“ عالیہ نے کہا۔

”اچھا مجھے تو پتا ہی نہیں چلتا۔“

”میں سنی ہوں، مجھے تو پتا ہے نا۔“ عالیہ نے

پس کر کہا۔

”تم نے دودھ پیا؟“

”نہا لیا ہے۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔

”میری طرف دیکھ کر کہو۔“

”کیوں ایک بات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔“

عالیہ اٹھ کر ڈریسنگ کے قریب آئی اور ہاتھوں پر لٹوٹ

لگائے گی۔

”تم جھوٹ مت بولا کرو۔“

”صرف دو گلو دودھ لیا جاتا ہے بتائیں کہ پورا ہو۔ ساتھ والی خالہ آگئی تھیں ان کے لیے چائے

بنی بھرائی سے ملنے خالہ رشیدہ آئیں تو آپ چائے

ہیں کر کھانے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے دوسرا

چائے بنی۔ تو۔۔۔۔۔“

”کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے دودھ

نہیں بچتا۔ کل سے دودھ والے کو کہو ایک

گلو تمہارے لیے الگ دیا کرے، سب کچھ جنم میں

تم نے ایک گلو دودھ پیتا ہے بس۔“

”ہی سے کیا کہیں گے؟“

”یہ میرا بچہ ہے، تم پریشان نہ ہو۔“

”اچھا آپ بھی پریشان نہ ہوں آرام سے

چائیں، میں دودھ نہیں پیوؤں گی تو نہیں جاؤں

گی۔“

”ہونے والے بچے کے لیے اور تمہارے لیے

پر دوش بہت ضروری ہے۔“

”ڈاکٹر ایس کیسے ہیں، عورتیں تو سو کی روٹی

کھا کر بھی بچے پیدا کر لیتی ہیں۔“ عالیہ نے بالوں

میں برش کرتے ہوئے کہا۔

”بس کچھ بھی ہو۔۔۔۔۔“ ارسلان نے کہا چاہا تو

عالیہ نے بات کاٹ دی۔

”پلیز ارسلان! میں کوئی ٹینشن نہیں لیتا چاہتی

جس طرح چل رہا ہے چلے دیں۔“

”تم کسی عورت ہو، تمہیں ذرا بھی اپنے بچے کا

خیال نہیں۔“

”خیال ہے جیسا تو کہہ رہی ہوں کہ مجھے ٹینشن

ہونے دیں۔ آپ کو پتا ہے میں بہت حساس ہوں

ارسلان۔۔۔۔۔ بس مجھے خوش رہنے دیں۔ یہی بہت

ہے۔“ عالیہ نے ہاتھوں پر کریم لگائی اور ارسلان

خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

☆☆☆

خدیجہ بیگم اور ظفر علی، عالیہ کے گھر آئے تو وہ

ماں اور بھائی کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔ انہیں وہ

لاڈلج میں بٹھا کر چائے بنانے میں ملی آئی۔ خدیجہ بیگم بھی

ذہیر سارے فروٹ اور بڑا سا آئڈ ٹیک لائی

تھیں۔ عالیہ نے چائے بنائی، بڑے سلیک ٹیک رکھا اور

نمکونکٹ بھی رکھے۔ لاڈلج میں آئی تو امی سے

خدیجہ بیگم باتیں کر رہی تھیں جبکہ ظفر بھائی اخبار پڑھ

رہے تھے۔

”ارسلان کب آتے ہیں؟“ انہوں نے اخبار

لیٹ کر رکھتے ہوئے کہا۔

”بس آنے ہی والے ہوں گے۔“ عالیہ نے

وال کاک کی طرف دیکھا۔

”بہوتم کیک بھی اٹھا لائیں تمہاری اماں کیا

سوچیں گی کہ ہمارے گھر میں چائے کے ساتھ سرد

کرنے کو کچھ نہ تھا۔“

”لیکن بات نہیں ہے امی۔۔۔۔۔“ عالیہ نے کہا

چاہا تو خدیجہ بیگم جلد سے بولیں۔

”تو نہیں کیسی بات کی ہے، اللہ آپ کو بہت

دے، عالیہ کو آئڈ ٹیک بہت پسند ہے تو ظفر نے لے

لیا سب کھا میں گئے۔“

”اور پھر نمکونکٹ تو ہمارے گھر کے ہیں

امی۔“ عالیہ نے ہنسنے ہوئے کہا۔ امی وقت ارسلان

بھی آگیا۔

”ہیلو! مجھی بڑی رونق ہے آج تو ہمارے گھر

میں۔“ ارسلان خوشی سے بولا۔ ظفر سے گلے ملا اور

خدیجہ بیگم کی طرف سر جھکایا تو انہوں نے اس کی

بالا میں لے لیں اور دعا دی۔

”اللہ خوش رکھے۔“

”میں بھی چائے لے گی بیگم۔“ وہ عالیہ سے

بولی۔

بچا قدم

”کیوں نہیں؟“ عالیہ نے پاس بڑے خالی ٹیک

میں چائے اٹھائے ہوئے کہا۔ ”مجھے پتا تھا آپ آنے

والے ہوں گے، پہلے ہی کپ لا کر رکھا ہے۔“

”بیوی ہو تو ایسی۔۔۔۔۔“ ارسلان نے کپ تھام

لیا۔ حمیدہ بیگم نے منہ نہایا تو خدیجہ بیگم کے چہرے پر

خوشی سرکھا۔ امی بن کر گھر گئی۔

”آپ عالیہ کو کب بھیجیں گی؟“ خدیجہ بیگم

نے حمیدہ بیگم سے پوچھا۔

”کہاں؟۔۔۔۔۔“ ارسلان نے پوچھا۔

”مجھی ہمارے گھر۔۔۔۔۔ جب کہیں ہم آکر لے

جائیں گے۔“

”مگر امی تو عالیہ کی ایسی کنڈیشن نہیں ہے خالہ

جان۔“ ارسلان نے کہا۔

”پتا ہے مگر بٹنے کے لیے تو جائے گی۔“

”نہیں، عالیہ نہیں نہیں جائے گی۔“ ارسلان

جلدی سے بولا۔

”یہ رواج ہے ارسلان۔“ حمیدہ بیگم بولیں۔

”میں کسی رواج کو نہیں مانتا، عالیہ میری ذمے

داری ہے اور میں ہی نبھاؤں گا۔“ ارسلان نے سختی

سے کہا۔

”فضول کی ضد ہے تمہاری۔“ حمیدہ بیگم

بولیں۔

”امی آپ سمجھیں۔۔۔۔۔ عالیہ کی طبیعت خراب

ہو گی تو وہ کسے کہے گی؟“

”اے لومباں، وہ کوئی جنگل میں جا رہی ہے۔

باپ ہے، میں ہوں، بھائی ہیں اس کے۔“ خدیجہ بیگم

تک کر بولیں۔

”عالیہ میری بیوی ہے اور کہنا یا یہ صرف میری

ذمے داری ہے، جب آپ کے ہاں تھی تو باپ بھائی

کی ذمے داری تھی۔“

”سجھائیں۔“ خدیجہ بیگم نے حمیدہ بیگم سے کہا۔

”صحیح تو کہہ رہی ہیں! دنیا کیا کہے گی۔“ حمیدہ بیگم بولیں۔

”میری اپنی دنیا ہے اور مجھے لوگوں کی پروا نہیں۔“ ارسلان ساٹ لکچے میں بولا۔

”میں سمجھاؤں گی ارسلان کو، آپ بے فکر رہیں۔“

”دیکھو! ناہتال کار ہمارے یہاں سے بھی اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا یہاں سے بلکہ کچھ نزدیک ہی ہے اگر وہاں رہے گی تو سمجھتے ہوگی۔“

”یہاں بھی رہ سکتا ہے۔ میں اپنی بیوی کو دوسروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔“

”دوسرے.....“ خدیجہ بیگم نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں دوسرے ہیں۔“

”ہاں میرے لیے دوسرے ہی ہیں۔“ ارسلان نے غیر ہمتی کی انتہا کر دی تھی۔ ظفر علی ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

”غیر نہیں تو غیر ہی تھی۔“

”ظفر بھائی آپ تو میری بات سمجھیں۔ رسم و رواج سہولیات کے لیے ہوتے ہیں کسی کو پریشان کرنے کے لیے نہیں۔ اب بھی مصروف آدمی ہیں دفتر سے شام کو آتے ہیں مظفر بھائی بھی شاپ سے رات کو آتے ہیں، انکل بوڑھے ہیں، میں آپ لوگوں پر اپنا بوجھ بھی لا دوں تو یہ کی شرافت تو نہیں ہے۔“

”دنیا میں یہی رواج ہے۔“ حمیدہ بیگم ہنسنے لگیں۔

”تو اسے ختم کر دیں۔ میرا بچہ ہے اور اسے میرے گھر ہی پیدا ہونا چاہیے۔ یہیں اس کا حقیقی جلد ہو پھر بے شک عالیہ میکے جائے گی۔“

”معاذ اللہ! کیا کہہ رہی ہیں۔“

”تو یہ ہے، دماغ خراب ہے اس لڑکے کا۔“ ٹھیک کہہ رہی ہیں خدیجہ۔ سو کام ہوتے ہیں پتلے والی عورت کے۔

”میں کرلوں گا۔“ طاہرہ کو بلوالوں کا اگر ضرورت پڑی۔

”حمیدہ بیگم نے گھور کر دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔“

”تم تو کچھ بولو، چلتا ہے یا نہیں؟“ خدیجہ بیگم نے عالیہ سے پوچھا۔

”جیسے ارسلان کہیں گے۔“ عالیہ نے آہستہ سے کہا۔

”اپنی رائے بھی تو دو۔“

”آپ نے ہمیشہ درس دیا ہے کہ میاں کی مرضی پر چلو بولیں۔“ عالیہ نے کندھے اچکا دیے۔

”اپنی مرضی بھی تو کوئی ہوتی ہے۔“

”میں کچھ نہیں کہتی..... میں نے زندگی ارسلان کے ساتھ گزاری ہے۔“ عالیہ نے برتن سینے اور لاؤنج سے نکل گئی۔

”چلو پھر.....“ خدیجہ بیگم طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”کل کو میاں تم ہی پتلے دو گے کہ والدین خرچے سے بھاگ گئے۔“

”میں ان دامادوں میں سے نہیں ہوں جن سے آپ کا اور امی کا پالا پڑا ہے، میں اپنے زور بازو پر ٹھہر سکتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں، یہی میرے گھر سے آپ کو طعنہ نہیں ملے گا۔“ ارسلان نے اطمینان سے کہا۔

”تو یہاں گھر میں تمہاری امی کیسے دیکھ بھال کریں گی، عالیہ کو بچہ سنبھالنا ہوگا۔ ہمارے گھر میں تو دو بھائی ہیں، عافیہ ہے، میں ہوں۔“ خدیجہ بیگم نے کہا۔

”میں اکیلا ہی بیوی بچے کی دیکھ بھال کرلوں گا۔“

”تو یہ ہے، دماغ خراب ہے اس لڑکے کا۔“ ٹھیک کہہ رہی ہیں خدیجہ۔ سو کام ہوتے ہیں پتلے والی عورت کے۔

”میں کرلوں گا۔“ طاہرہ کو بلوالوں کا اگر ضرورت پڑی۔

”حمیدہ بیگم نے گھور کر دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔“

”تم تو کچھ بولو، چلتا ہے یا نہیں؟“ خدیجہ بیگم نے عالیہ سے پوچھا۔

”جیسے ارسلان کہیں گے۔“ عالیہ نے آہستہ سے کہا۔

”اپنی رائے بھی تو دو۔“

”آپ نے ہمیشہ درس دیا ہے کہ میاں کی مرضی پر چلو بولیں۔“ عالیہ نے کندھے اچکا دیے۔

”اپنی مرضی بھی تو کوئی ہوتی ہے۔“

”میں کچھ نہیں کہتی..... میں نے زندگی ارسلان کے ساتھ گزاری ہے۔“ عالیہ نے برتن سینے اور لاؤنج سے نکل گئی۔

”چلو پھر.....“ خدیجہ بیگم طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”کل کو میاں تم ہی پتلے دو گے کہ والدین خرچے سے بھاگ گئے۔“

”میں ان دامادوں میں سے نہیں ہوں جن سے آپ کا اور امی کا پالا پڑا ہے، میں اپنے زور بازو پر ٹھہر سکتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں، یہی میرے گھر سے آپ کو طعنہ نہیں ملے گا۔“ ارسلان نے اطمینان سے کہا۔

”تو یہاں گھر میں تمہاری امی کیسے دیکھ بھال کریں گی، عالیہ کو بچہ سنبھالنا ہوگا۔ ہمارے گھر میں تو دو بھائی ہیں، عافیہ ہے، میں ہوں۔“ خدیجہ بیگم نے کہا۔

”میں اکیلا ہی بیوی بچے کی دیکھ بھال کرلوں گا۔“

”تو یہ ہے، دماغ خراب ہے اس لڑکے کا۔“ ٹھیک کہہ رہی ہیں خدیجہ۔ سو کام ہوتے ہیں پتلے والی عورت کے۔

”میں کرلوں گا۔“ طاہرہ کو بلوالوں کا اگر ضرورت پڑی۔

”حمیدہ بیگم نے گھور کر دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔“

”تم تو کچھ بولو، چلتا ہے یا نہیں؟“ خدیجہ بیگم نے عالیہ سے پوچھا۔

”جیسے ارسلان کہیں گے۔“ عالیہ نے آہستہ سے کہا۔

”اپنی رائے بھی تو دو۔“

”آپ نے ہمیشہ درس دیا ہے کہ میاں کی مرضی پر چلو بولیں۔“ عالیہ نے کندھے اچکا دیے۔

”اپنی مرضی بھی تو کوئی ہوتی ہے۔“

”میں کچھ نہیں کہتی..... میں نے زندگی ارسلان کے ساتھ گزاری ہے۔“ عالیہ نے برتن سینے اور لاؤنج سے نکل گئی۔

”چلو پھر.....“ خدیجہ بیگم طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”کل کو میاں تم ہی پتلے دو گے کہ والدین خرچے سے بھاگ گئے۔“

”تو یہاں گھر میں تمہاری امی کیسے دیکھ بھال کریں گی، عالیہ کو بچہ سنبھالنا ہوگا۔ ہمارے گھر میں تو دو بھائی ہیں، عافیہ ہے، میں ہوں۔“ خدیجہ بیگم نے کہا۔

”میں اکیلا ہی بیوی بچے کی دیکھ بھال کرلوں گا۔“

”تو یہ ہے، دماغ خراب ہے اس لڑکے کا۔“ ٹھیک کہہ رہی ہیں خدیجہ۔ سو کام ہوتے ہیں پتلے والی عورت کے۔

”میں کرلوں گا۔“ طاہرہ کو بلوالوں کا اگر ضرورت پڑی۔

”حمیدہ بیگم نے گھور کر دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔“

”تم تو کچھ بولو، چلتا ہے یا نہیں؟“ خدیجہ بیگم نے عالیہ سے پوچھا۔

”جیسے ارسلان کہیں گے۔“ عالیہ نے آہستہ سے کہا۔

”اپنی رائے بھی تو دو۔“

”آپ نے ہمیشہ درس دیا ہے کہ میاں کی مرضی پر چلو بولیں۔“ عالیہ نے کندھے اچکا دیے۔

”اپنی مرضی بھی تو کوئی ہوتی ہے۔“

”میں کچھ نہیں کہتی..... میں نے زندگی ارسلان کے ساتھ گزاری ہے۔“ عالیہ نے برتن سینے اور لاؤنج سے نکل گئی۔

”چلو پھر.....“ خدیجہ بیگم طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”کل کو میاں تم ہی پتلے دو گے کہ والدین خرچے سے بھاگ گئے۔“

”میں ان دامادوں میں سے نہیں ہوں جن سے آپ کا اور امی کا پالا پڑا ہے، میں اپنے زور بازو پر ٹھہر سکتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں، یہی میرے گھر سے آپ کو طعنہ نہیں ملے گا۔“ ارسلان نے اطمینان سے کہا۔

”تو یہاں گھر میں تمہاری امی کیسے دیکھ بھال کریں گی، عالیہ کو بچہ سنبھالنا ہوگا۔ ہمارے گھر میں تو دو بھائی ہیں، عافیہ ہے، میں ہوں۔“ خدیجہ بیگم نے کہا۔

”میں اکیلا ہی بیوی بچے کی دیکھ بھال کرلوں گا۔“

”تو یہ ہے، دماغ خراب ہے اس لڑکے کا۔“ ٹھیک کہہ رہی ہیں خدیجہ۔ سو کام ہوتے ہیں پتلے والی عورت کے۔

”میں کرلوں گا۔“ طاہرہ کو بلوالوں کا اگر ضرورت پڑی۔

”حمیدہ بیگم نے گھور کر دیکھا مگر بولیں کچھ نہیں۔“

”تم تو کچھ بولو، چلتا ہے یا نہیں؟“ خدیجہ بیگم نے عالیہ سے پوچھا۔

”جیسے ارسلان کہیں گے۔“ عالیہ نے آہستہ سے کہا۔

”اپنی رائے بھی تو دو۔“

”آپ نے ہمیشہ درس دیا ہے کہ میاں کی مرضی پر چلو بولیں۔“ عالیہ نے کندھے اچکا دیے۔

”اپنی مرضی بھی تو کوئی ہوتی ہے۔“

”میں کچھ نہیں کہتی..... میں نے زندگی ارسلان کے ساتھ گزاری ہے۔“ عالیہ نے برتن سینے اور لاؤنج سے نکل گئی۔

”چلو پھر.....“ خدیجہ بیگم طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”کل کو میاں تم ہی پتلے دو گے کہ والدین خرچے سے بھاگ گئے۔“

# کہانی ورکشاپ

اُن کیلئے، جنہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر یقین ہے، جو کہانیاں، افسانے، ناول لکھنا چاہتے ہیں!

صف اول کے کہانی کاروں اور ادیبوں کی گھمرائی میں کشش راٹنگ کیلئے۔

کشن فورم پاکستان اور میڈیا اوپریٹرز ایسوسی ایشن پاکستان (دستار)

اور 8 اپریل 2012

(11 بجے سے 5 بجے)

ورکشاپ کے موضوعات

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا

★ کہانی کی ابتدا



کر دیجے گا میں تو اب تحریک چلانے لگا ہوں، یہ سب آپ کیسے موقوفوں نے رکھیں مانی ہیں۔ بہو آپ کی بیٹا آپ کا بیٹے کی اولاد آئے گا کھولے تو نہیں مانی، یہ کون سی تک ہے۔ دل سے ہر کوئی تنگ ہے اتنے خرچوں سے۔

”تم نے اتنی آسانی سے کہہ دیا، اب دیکھو میں تو بیمار ہوں کس طرح دیکھوں گی عالیہ کو اور بیٹے کو۔“

”ظاہرہ آجائے گی، ہا کو پلائیں۔“  
”مگر سے فالتو ہیں نا..... آجائیں۔“  
”پانچ ماہ پہلے جب ظاہرہ کے تیرا بیٹا ہوا تھا یہاں تو عالیہ نے ظاہرہ کی خدمت کی تھی، اب ظاہرہ آجائے کروائے عالیہ کا چلہ۔“ ارسلان اطمینان سے بولا۔

”ایسا تو کہیں نہیں سنا جو تم کہہ رہے ہو اور پھر ظاہرہ کیسے آسکتی ہے؟“  
”عالیہ اس کی خدمت کر سکتی ہے تو وہ بھادو ج کے کام نہیں آسکتی۔ بس اسی رہنے دیں آئندہ میری بہنوں کو کہہ دیں چلے کر نے یہاں نہ آئیں۔“  
”کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”رسم ہوتی ہے پہلے بیچے کے لیے مگر یہاں تو ہر تیسرے مہینے بچہ پیدا ہو رہا ہے۔ میں اتنا خرچ فوراً نہیں کر سکتا۔ کئی ظاہرہ آ رہی ہے تو کبھی مینا اور پھر ہا کو کوئی ملے۔ یہ ہیں۔“

”پتا نہیں تمہارے دماغ میں کیا خناس بھر دیا گیا ہے۔“ انہوں نے کبھی نظروں سے عالیہ کو دیکھا۔

”میری بیوی نے مجھے کچھ نہیں کہا اسے مت گھوڑیں۔ چلو عالیہ کھانا کھاؤ مجھے بھوک لگی ہے، میں چیخ کر کے آتا ہوں۔“ ارسلان نے کہا اور اپنے

کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”اسے سمجھاؤ کہ دنیا کے ساتھ چلے۔“

”میری کب مانتے ہیں۔“

”ساتا تو وہ تمہاری ہی ہے۔“ معنی خیز انداز میں کہا گیا۔

”غلط فہمی ہے آپ کو۔“ عالیہ سر جھک کر بولی

اور کچن میں چلی گی۔

☆☆☆

عالیہ نے ٹرے میز پر رکھ دی ارسلان صبح کر کے اچکا تھا۔ وہ پوچھنے لگا۔

”تمہارا دل تو نہیں چاہ رہا تھا جائے کو۔“

”نہیں ارسلان..... میں نے بھی سوچا ہوا تھا کہ یہ فضول رسوں سے بھٹکا رہا پاؤں گی۔ مجھے خوشی ہے آپ میرا ساتھ دے رہے ہیں۔“

”تم نے کب سوچا؟“

”بہت عجیب میں، جب ہماری پانچوں بیویاں ڈیوڑی کے سلسلے میں آتی تھیں۔ آپ کی طرح ابابھی اکیلے بھائی تھے صرف ایک پرچوں کے استور کی آمدنی کیا کرتی..... مگر ہماری وادی کی فرمائش پر بیویوں کی گود بھرائی کی رسم پر تو ڈیوڑی فروٹ اور خشک میوہ لے جایا جاتا۔ ہم بھی شوق سے جاتے، خوب کھاتے، کبھی باں اور باپ سے ٹکرتے جہرے نظر ہی نہ آئے۔ وادی باں اب ان پچھڑی جاتی تھیں۔ اماں کا سارا زور یہی مندوں کے بچوں اور گود بھرائی کی نظر ہو گیا۔“

”واقعی؟.....؟“ ارسلان حیرت سے بولا۔

”آپ یقین کریں ارسلان، اماں کی بالیاں آخری بچی تھیں جو ظفر بھائی کی امی کے فیس کے لیے دینی پڑیں۔“

”مانی کا؟.....؟“

”ان دنوں بھی چھوٹی چھوٹی آمدنی چھوٹی بیٹی

ہمارے ہاں ہی پیدا ہوئی تھی۔ روز کے پھل، اٹھ، ٹائی کے علاوہ روزانہ شام کو داماد جی کے لیے اچھا کھانا، بدلا۔ مشکل وقت کا نا ہے ہم نے.....“

”کوئی منع نہیں کرتا تھا.....؟“ ارسلان نے پوچھا۔

”کون کرتا، وادی کو کون سمجھاتا.....؟ ہمیں اماں سمجھاتیں، ہماری خواہشوں کو پی پی پشٹ ڈال دیتیں مگر وادی کے سامنے آف نہ کرتیں۔“

”وادی نہیں یا عذاب؟“ ارسلان نے کہا تو وہ مسکرائی۔

”کھانا تو کھا نہیں آتی.....“

”یار بس ان رسوں کو دیکھ کر دل خوش نہیں ہوتا ادب جاتا ہے۔ اب امی کی بات سنو، یہ بھلا کیا تک ہے کہ تم کتم ظاہرہ کی خدمت کر سکتی ہو وہ نہیں کر سکتی۔ صرف بھادو ج پر ہی فرض ہے۔ بس میں خود ہی تمہاری دیکھ بھال کروں گا۔ چھٹی کے لوں گا آفس سے۔“ ارسلان سخت سے بولا۔

”اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، آپ ٹکرنہ کریں، میں کام کروں گی۔ مای کو ذرا دیر تک ٹھہرا لوں گی۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ ارسلان نے کہا اور پھر کھانا کھانے لگا۔ جیو پٹیک کا موڈ بیٹے بہو سے خراب تھا۔ وہ چاہتی تھیں یہو بیٹے جائے مگر جب بیٹا نہیں مان رہا تو دیکھ کر تھیں۔

”پتا نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے عالیہ نے کہ وہ اس کی مانتا ہے۔ اسے بیوی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔“

”ایسی ٹھیک تو ہے، ارسلان صبح کر رہا ہے۔“

”اے لو..... کیا کچھ ہے۔“

”کسی پر اتنا بھروسہ نہیں ڈالنا چاہیے۔“

”تم کہتی تو یہاں..... انہوں نے کہا پتا چاہو تو

نے بات کاٹ کر کہا۔

بدلا قدم

”آپ کی بات درست ہے مگر میرے میاں کو اتنی عقل ہوئی تو..... میرا ایک ہی بھائی ہے اور جب میں اسے اتنے پوچھ تلے دیتی ہوں تو دکھ ہوتا ہے یقیناً سب بہنوں کو ہوتا ہوگا۔ ارسلان نے است کی ہے آئندہ ہم بھی اپنے مردوں کو سمجھاتے ہیں۔ آپ ارسلان سے خفا نہ ہوں اور خود بھی سوچیں تو آپ کو لگے گا کہ ارسلان غلط نہیں ہے۔ اس نے پہلا قدم اٹھایا ہے..... بری رسم کے خلاف اس کا ساتھ دیں۔“

حمیدہ بیگم نے آہستہ سے ریوڑ رکھ دیا۔

☆☆☆

دروختوں پر نئے بچے بھار دکھا رہے تھے۔ اور کیا ریوں میں گل باپ بھی جھوم رہے تھے۔ ہمارا کومس تھا جب ایک صبح عالیہ نے خوب صورت سے بیٹے کو جنم دیا۔ ارسلان اسے خود اسپتال لایا تھا اور پھر صرف ایک گھنٹے بعد اسے پتا چلا کہ وہ بیٹے کا باپ بن گیا ہے۔

نرس نے ارسلان کی گود میں بچہ دیا تو اسے بے تحاشا خوش ہوئی۔ عالیہ کمرے میں شفٹ ہوئی تو ارسلان بچے کو لے کر اس کے پاس گیا۔ ”ہمارا کھانا پھول ہمارے آگن میں کھلا ہے۔“ ارسلان نے بچے کو اس کی گود میں دیا تو عالیہ بھی لگاتے ہوئے مسکرائی۔

”دیکھو عالیہ اگر تم سیکے چلی جاتیں تو ہم دونوں اس خوشی سے محروم رہے کر اپنے بچے کو سب سے پہلے ہم نے دیکھا، ہم نے پیا کیا۔“ عالیہ نے سر ہلادیا۔

”اب میں سب کو اطلاع دیتا ہوں کہ ہم باپ بن گئے ہیں۔“ محبت سے سرشار ارسلان نے جب سے اپنا موبائل فون نکالا اور مسکرا کر بشن پیل کرنے لگا۔ عالیہ بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

محبت نامہ پاکیزہ۔ اپریل 2012ء

59

زندگی میں جہاں رشتہ ناتان اور روابط بیت اہم ہوا کرتے ہیں  
... وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی  
خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ  
رکھتے ہیں... مگر ہمیں بیت سے  
لوگ، بہت سے مواقع ایسے  
ضرور ملتے ہیں... جب  
محبت دستک دیتی ہے  
... اور اس کی خوشبو  
میں روشنی کی تابکاری  
بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے  
ساتھ ساتھ... مکر و فریب  
... سفاکی اور تنگ نظری کے  
ساتھ... ازل سے محبت کرنے والوں  
کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی  
کبھی تڑپ کی دگی بھی حکم کے اکے کو کاٹ دیا کرتی ہے...

ہماری مایہ ناز مصطفیٰ نازید سلطان اختر کے قلم سے ایک شاہکار ناول

جس کی سطر میں زندگی سڑکتی نظر آئے گی

## زندگی

نامید سلطان اختر

نوگ شیر پہ یوں ہم نے گزارے لیے  
لاچ کی آنگھوں سے غراہوں کا گرد ہو پیچے









سنو..... دوستوں میں سے صرف تمہیں انوائٹ کر رہی ہوں اور تمہیں آنا ہے۔“ حجاب نے کہا۔

”بائی دوستوں کو کھینچیں ہوگا؟“

”مجبوری ہے، مگر میں ہی چھوڑنا چاہتی ہوں۔“ حجاب نے کہا۔

”تو پھر مجھے ہی نہ بلاؤ۔“

”خبردار جو ایک لفظ اور بولیں۔“

”مجھ کو نہ بلانا۔ تمہیں ساری دوستوں سے بس ایک ہی بات کہنی ہوگی کہ تم دوستوں میں سے کسی کو بھی نہیں

بلا لیا۔ مجھے بلا کر تم باقی دوستوں کو..... شکایت کا بہانہ کیوں دینا چاہتی ہو اور لو کو؟“

”چپ کر جاؤ.....“ حجاب نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ”تم صرف دوست نہیں ہو میری۔“

”ایک تو تمہاری آنکھیں..... بقول کسی شاعر..... چھلکتے جام..... اوپر سے آبی لائٹ اور مسکار! بندہ نہ بھی مرنے

چاہے تو مر جائے۔“

”خیر تم تو ہے اپنی شاعرانہ گفتگو فرمائی جا رہی ہے۔“ حجاب مسکرا کر بولی۔

”رنگ آ رہا ہے مجھے اس شخص پر جو زندگی بھر کے لیے تمہارے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرانے جا رہا ہے۔

بائی داؤے کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟“ تقدیم نے کہا۔

”جب آؤ گی تو خود دیکھ لینا خود پوچھ لیں۔“

”بس یہ تمہیں تقدیم کہانی کہ ان کی لائٹ نکل آئی ہے۔“ رباب کے لہجہ میں رنگ تھا۔ حجاب نے اسے

تنبیہی نظروں سے گھورا۔

”ان کی یا ان کی؟“

”دونوں کی۔“ حجاب کے گھورنے پر رباب نے اپنا کان دباتے ہوئے کہا۔

”موس نے چھوٹا ہو کر بڑھ کر دی۔“ تقدیم بولی۔

”کیا مطلب!“ حجاب نے چونک کر کہا۔

”بڑا ہوتا تو تمہیں کہیں نہ جانے دیتی تھی۔“

”چپ کیوں نہیں کہا۔ چھوٹا کیوں چل جاتا یار۔“ وہ ہنسی۔

”اچھا، اب تو آپ نے نہیں کہا تقدیم کہانی! یہ تو اپنی عمر کے لوگوں کو بھی پتا کہہ کر مخاطب کرتی ہیں، اسے تو

بالکل ہی چوتھی تھی۔“

”اچھا تم زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے، چلتے ہیں۔“

”جائے؟“

”چھ نہیں، بس تم نے برسوں شام آنا ہے، مگر والوں میں سے جو تمہارے ساتھ آنا چاہے سوٹ دیکر۔ میں

تمہیں دعوت دینے کے لیے گھر بھی آسکتی تھی مگر میں نے سوچا رباب کے ساتھ بازا تو جانا ہی ہے تم سے کون سا

تکلف ہے تمہارے آفس سے ہوتے ہوئے تمہیں کہتے چلے جائیں گے۔“

حجاب اور رباب کے جاتے ہی تنہا کیمکس آگیا۔ چھٹی کا وقت ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ تنہا کے ایس ایم

ایس نے اس کے حواس مٹھل کر دیے۔ تنہا کا نمبر ملایا تو درمیر جیتلی میں پھر فون بند کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ کس سے کہے اور کیا کہے۔ فوری طور پر اسے گھر جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کرسی

سے اٹھی تو آنکھوں کے سامنے اچانک اندھیرا سما گیا، ایسا لگا دو بارہ کرسی پر نہ بیٹھی تو پکارا کر بڑے کی۔ میز کا کنارہ

دلوں کا ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے وہ کرسی سے اٹھتے دوبا رہ گئی۔

”کیا ہو اس تقدیم؟“ اس کی ایک ساتھی عارفہ سے یوں بے دہی ہو کر دوبارہ بیٹھے دیکھ کر بولی۔

”جانتیں کیوں پکارا گیا۔“ اس نے اپنا سر دلوں کا ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

”آپ کا چہرہ تو ایک دم زرد ہو رہا ہے مگر تقدیم۔“ عارفہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے نزدیک آکھڑی ہوئی

اور اس کا چہرہ دیکھ کر تھیش سے بولی۔

”نیم کو تاناؤ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔“ عارفہ باس کے کمرے کی طرف لپکی۔ ہاس اپنے کمرے سے نکل کر

تقدیم کے پاس آئیں تو وہ دوبارہ اٹھ چکی تھی۔

”خیر تم کس تقدیم؟“

”نیم! اچانک پکارا گیا۔“ میں..... میں گھر جا سکتی ہوں؟“

”شیور۔“ میرا ذرا نیو آپ کو چھوڑ دے گا۔“

”تو..... تو نیم۔“ جینک یو دیری بچ..... میں..... میں خود چلی جاؤں گی..... ٹیکسی لے لوں گی۔“

”شیور؟“

”بس نیم۔“

”اوکے۔“

دفتر سے گھر تک سارا راستہ انتہائی پریشانی میں کتا، ہر پھر کر اس کے ذہن میں ایک نام گردش کرنے لگتا۔

مڈر..... مگر اس سے آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ کھینچی تو اناں بولیں۔

”شکر ہے تم تو آج روزانہ سے خود راہ جلدی آگئیں مگر تنہا نہ جانے کیوں نہیں آئی ابھی تک۔“

”کچھ کام ہو گا اناں..... وہ اناں سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

”اس کے کاموں کی خبر خود اسے ہوتی ہے یا پھر اللہ کو۔ اتنی تو قیامت تو ہوتی نہیں اسے کہ اگر دیر تک رکنا ہو

یو نیورٹی میں تو ایک دن ہی کر دے۔“

”آجائے گی اناں۔“

”ہاں! تو مجھے بھی پتا ہے کہ آجائے گی۔“ کیا کہتی وہ اناں سے۔

ابا دفتر سے آچکے تھے۔ وہ مڈر اس کا کہنے کو روک رہی تھی۔

”کیا بات ہے بیٹی؟“ وہ ابا کو اپنے موبائل پر مرسول بیٹا م سے آگاہ کرنے کے لیے اپنا حوصلہ جمع کرنے

لگی۔

”ابا! اس نے کتنی گھٹی آواز میں کہا۔“ میں..... میں جو بات آپ کو بتانے جا رہی ہوں..... اسے سن کر ہمت

سے کام لے لے گا۔“ ابا جو کمرہ اصراب کے آدمی تھے جی پٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے۔

”موس تو تھک ہے نا؟“ ابا کا چہرہ ایک لمبٹ مدق نظر آنے لگا تھا۔ اس نے دھیرے سے اثبات میں سر

ہلا لیا۔ شدت رنج سے اس کا گلہ بند ہونے جا رہا تھا۔

”جی ابا..... موس تو ٹھیک ہے۔“ ابا اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”تنہا طلعہ جی ہے ابا.....“ اس نے بے مشکل بتایا۔

”تنہا طلعہ جی ہے۔“ ابا بڑبڑائے۔ ”کہاں.....؟ کہاں.....؟ کہاں.....؟“

”تقدیم کے ہونٹ کپکپاتے۔“

"اس..... اس..... اس نے کورت میرج کر لی ہے بابا۔"

"کیا....." اباجو مولیٰ کی خبر پر سن کر مطمئن سے ہو گئے تھے جڑ بڑا گئے۔ "کیا کیا تم نے! کورت

میرج.....؟" ابانے کچھ نہیں بے یقینی تھی۔

تقدیم نے اسے ہنسی سے اپنا سرائٹ میں ملایا۔ "اس نے بیج کیا تھا میرے موائل پر۔"

ابا چند لمبے جھکا جکا اس کا منہ دیکھتے رہے پھر اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر شہ پر صدمہ کی کیفیت میں

بولے۔ "میرے خدا ایسی بھی ہوتا تھا۔" ابائی کی آواز تقدیم کو کسی جاں بلب پیار کی کراہ جھوس ہوئی۔ دفعتاً ابانے اپنا

چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور ان کا پورا جسم ارتعاش میں آ گیا۔ وہ منہ ہی جذباتی کیفیت سے دوچار محسوس

ہوئے تھے۔

"ابا..... ابا بیڑ؟" تقدیم انہیں دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگی۔ "اماں تک آپ کی آواز پہنچی تو وہ پریشان

ہوں گی۔" ابابچی سکیاں سینے میں گھونٹنے کی کوشش کرنے لگے۔

"ساری زندگی اللہ سے ڈر کر ڈراری..... روزی میں بھی ہے ایمانی نہیں کی..... کسی کا حق نہیں چھینا..... کسی کا

دانت دل نہیں دکھا..... پھر بھی..... مجھے سے کہاں غلطی ہوگی..... بتاؤ بیٹا مجھ سے کہاں غلطی ہوئی ہے؟" ابانے تقدیم کو

اپنی آنسوؤں سے بھیسی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تقدیم نے یوں سر جھکا ایسے کہ انہیں پر سادے رہی ہو۔ دفعتاً اماں اپنی وکیل جیٹر خود چلائی کمرے میں در

آئیں۔

"ارے ذرا تیسم کو....." اباکو روٹے دیکھ کر اماں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ "کیا ہوا؟" انہوں نے

تقدیم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ابا اپنے ٹخنوں پر ہاتھ دھرے ہوئے بدلتا لٹھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لحوں میں برسوں کا سسکر کے انتہائی

تھک گئے ہوں۔ اماں کی وکیل جیٹر کے نزدیک بیچ کر وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں

بولے۔

"تقدیم کی ماں تھیں لی دو..... میری ڈھارس بندھا دو..... میرا دل بھٹ جائے گا۔"

تقدیم یہ تو جانتی تھی کہ اباکمزور عصاب کے آدی ہیں مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ اس حد تک کمزور ہوں گے یا پھر

ساختا ساختا نہ رہے گا کہ وہ ہمارا نہیں پارے تھے۔

"ارے بھٹ جتا تو چلے گیا ہوا؟" اماں وہابی ہو کر پھر تقدیم کو دیکھنے لگیں۔

"مر گیا ہوں..... مگر کیا ہوں تقدیم کی ماں..... جیتے جی مار دیا ہے مجھے تمہاری بیٹی نے..... کسی کو منہ دکھانے

کے لائق نہیں رکھا تیسم نے نہیں..... دفعتاً ابابک تک کروٹنے لگے۔

"ہوا کیا ہے..... بتاؤ تو ہوا کیا ہے؟" اباموتوحس دکھائی دیتے لگیں اور آنکھیں بند کر کے وکیل جیٹر پر ایک

طرف کو جھک گئیں۔

تقدیم اماں کو سہارا دینے کے لیے آگے بڑھی۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور مردہ سی آواز میں

بولیں۔ "کیا ہوا ہے تقدیم؟" میرے ابابا کہہ رہے ہیں..... ارے! اتنا تو یہ اپنی اپی کی موت پر بھی نہیں جکے

تھے۔"

"یہ اباکے لیے ان کی ماں کی موت سے بھی بڑی موت ہے۔" تقدیم نے دیکھی ہو کر دل ہی دل میں سوچا پھر

اس نے جیسی آواز میں اماں کو بتایا۔

"تیسم کا کالج آگیا تھا میرے فون پر، اس نے کسی سے شادی کر لی ہے کورت جا کر۔" اماں کی آنکھیں پھٹی کی

پہلی رہ گئیں۔

"مجھے کچھ ہو جائے گا تقدیم کی ماں۔" ابانے اپنے دونوں ہاتھ اماں کے ٹخنوں پر رکھ دیے اور سر جھکا کر گھٹ

گھٹ کر رو رہے گئے۔

جمہید، نظم اور تقدیم کمرے کے دروازے میں کڑی ہر اسال نظروں سے کمرے کا منظر دیکھ رہی

تھیں۔ اماں نے اپنے کا بجلی حصہ وکیل جیٹر کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ ان کے چہرے پر مردنی سی

تھی۔ تقدیم ان کا سر سہلاتے ہوئے انہیں دلاسا دینے کی کوشش کرنے لگی۔

"اماں کے لیے پانی لاؤ۔" تقدیم نے بیہوش کی طرف دیکھا۔ جمہید اگلے قدموں پانی لانے کے لیے پکلی۔

تقدیم بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔

"کیا ہوا آپ؟" تقدیم نے وہ پکلی کی طرف دیکھا۔ تقدیم نے اپنے ہونٹوں پر انگلی

دھرتے ہوئے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔

جمہید اور تقدیم اماں اور اماں دونوں کے لیے پانی کے گلاس لیے ہوئے بیٹھیں۔ پانی کے دو چھوٹے چھوٹے گھونٹ

بھر کر اماں اپنی قوی کو جمع کرنے کی کوشش کر رہی دکھائی دیتے لگیں۔ ابا بٹھا تھا۔ جمہید، تقدیم، نظم اور تقدیم

چاروں کی نگاہیں اماں سے اباپراور اماں سے پڑو ل رہی تھیں۔

"کیا ہوا تقدیم؟" جمہید نے سرگوشی میں پوچھا۔

تقدیم چپ رہی۔

"بتاؤ؟" جمہید کے کچھ میں اب اصرار تھا۔

"تیسم نے کسی سے شادی کر لی ہے۔" تقدیم کو بتانا ہی پڑا۔

"ہاں؟" جمہید نے گہرا کراہے منہ پر ہاتھ دھر لیا۔ نظم اور تقدیم جو تقدیم کی بات سننے کو قدرے جھک گئی

تھیں ان کی آنکھوں میں وحشت درآئی۔

تقدیم کا خیال تھا اماں سیکڑے ہوئے پر دعائیں مار مار کر روئیں گی مگر اس کی توقع کے برخلاف اماں نے حیرت

انگیز رویہ لکھا۔ ہاتھ پرانے پانی کے گلاس پر اپنا چہرہ یوں ہاتھ یوں دھیرے دھیرے چھپاتے ہوئے

جیسے کوئی درد مند ان اپنے کی تکلیف سے دوچار نہ ہوتا پھر اسے دلاسا دینے اور اس کی ہمت بندھانے

کی کوشش کرے۔ انہوں نے غلاف معمول بڑی آواز میں کہا۔

"گئی ہے..... جائے دو..... اب گھر میں آئے دن کوئی دنگا سناؤ تو نہیں ہوگا۔"

ابا اسرا کھڑے بیٹھی سے اماں کو دیکھنے لگے۔ بیار، کمزور، اور معذور شریک حیات کا یہ روپ ان کے لیے

چران کن تھا۔ اپنی وکیل جیٹر پردہ بڑے اعتماد اور مطمئن سے بیٹھی تھیں۔ کچھ دیر کو تو جیسے پوری کائنات کو چپ سی لگ

گئی پھر اماں کی آواز نے اس خاموشی کا سینہ چیرا۔

"اپنے ماں باں اور بھائی بیہوش کی ہمدردیاں کیا ایسے تھوڑی رہا کرتی ہیں مگر میں جیسے وہ بار کرتی تھی۔ ہر

وقت کہ اندر نہ دھکے کام کاج سے کوئی دھچکا نہ دھکروالوں کے دکھ کھ سے غرض..... بس اپنی ذات میں سن.....

آپ اس کی بیٹی کو درد ہے ہیں۔" اپنے آخری فقرے پر اماں نے اباکو دیکھا جو کچھ باندھے اسی بے یقینی سے اماں کو

دیکھ رہے تھے۔

”بس بات گھر سے نہ نکلی۔“ جیکھ صادر کرتے ہوئے اماں نے چاروں بیٹیوں کو ایک نظر دیکھا۔ ”سب تک! تقدیم کی مال کو تک نہیں نکلی کی گھر سے بات؟“ اماں کے لب پھر کے۔

”مہا چلا! میں کدوہ لنگھا ہے کون اور اس مردوسے کہیں ہماری بیٹی کو ہم رحم نہ آیا تو ہم برا اختار کم کر کے چار لوگوں کی موجودی میں ہمارے گھر سے ایک بار لے جاتا کہ ہماری دوسری بیٹیوں کی راہ کھولی نہ ہو۔“ میں پھر اس کا اور ہمارا رشتہ ساری زندگی کو ختم۔

تبدیلہ تقدیم، تنظیم اور تقدیم میں چاروں کی نظریں یا ہم ملیں۔ ہر ایک کو اپنی آنکھوں میں دیکھا کیا کھاتے آنسوؤں کا سب باقیوں کی آنکھوں میں لڑاں دکھائی دیا۔ برسوں سے دبلی چتر پر عضو معطل کے مانند بڑی اماں ایسی حیرت انگیز قوت کا مظاہرہ کر رہی کہ بیان میں سے کسی کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ”میرا خیال ہے اس کا نام مڈر ہے۔“ تقدیم نے کہا۔ اماں، ابا اور تینوں بیٹیں سب بے ساختہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”تمہیں کیسے پتا؟“ اماں نے پوچھا۔ ”میں نے تنسیم کے موبائل میں اس کے میسج پڑھے تھے۔“ ”اور تمہیں بتایا تک نہیں۔“ اماں نے اسے نگاری سے دیکھا۔ ”اُن کے لہجہ میں گد اور نگاہوں میں ایسی کاتھمی کہ تقدیم شرمندہ ہو کر رہ گئی۔ ”وہ مجھ سے لڑتی۔“

”ارے لڑتی ہی نہ..... یہ دنیا تو نہ دیکھتی پڑتی..... خدا جانے اور کیا کچھ پھنچایا جاتا ہو گا مجھ سے۔“ تقدیم نے چونک کر اماں کو دیکھا۔ اس کی زبان سے نکلا ایک جملہ اماں کو اس حد تک بدگمان کر دے گا یہ اس کے وہم و خیال میں بھی نہیں تھا۔ ”مجھے بتایا تھا اس نے۔“ ابا نے اسے انتہائی جراتی لہجوں میں مکہ بہم پہنچائی۔

اماں نے چونک کر ابا کی جانب دیکھا۔ ”جس روز تنسیم اس سے لڑی تھی اس روز یہی بات تھی۔“ ابا نے مزید کہا۔ ”تو پھر اب بیٹھے کاے کو رو رہے ہیں۔ ارے جب پتا چلتا تھا تو اسی وقت اس منہوں ماری کی منڈیا مروڑ دیتے۔ اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیتے۔“ میر جاتی تو اچھا تھا۔“ اماں بولیں۔ ”ٹھیک کہتی ہو۔“ ابا بولے۔

دفعتاً اماں اتنی زور سے کراہیں کہ لگا تکلیف کی شدت ان کا سینہ شق کر دے گی۔ اپنا سر وکیل جیسے کڑی پشت کے کنارے پر ٹک کر انہوں نے آنکھیں موند لیں۔

تمہید گھبرا کر اماں کے کندھے دھیرے دھیرے دبائے لگی۔ تقدیم نے پانی کا گلاس اٹھایا اور اماں کے لبوں سے لگے ہوئے بولی۔ ”پانی پی لیں اماں۔“

اماں نے ایک کھونٹ بھرا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور چوٹوں پر ارتعاش..... اچانک ان کی بند آنکھوں سے آنسو نکلے اور ان کے دونوں رخساروں پر کم گیسر کھینچتے چلے گئے۔ اماں کا بے اختیار کراہنا اور ان کی آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسو اس امر کے غماز تھے کہ وہ اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ سہارنے میں ناکام ہو چکی تھیں۔

”اماں..... اماں پیاز حوصلہ کریں۔“ تقدیم نے دھیرے دھیرے ان کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی۔

”میں..... ٹھیک ہوں..... میری فکر نہ کرو..... اس کا پتا کرو کہاں ہے۔“ اماں بولیں۔

تقدیم نے پہلے اپنے نمبر سے پھر ابا کے نمبر سے تنسیم کا نمبر لایا۔ فون بند تھا۔ مڈر کے نمبر پر فون کیا تو پہلے تیل کی پھر اس نے بھی فون بند کر دیا۔ رات سیر ہو گئی۔ پریشانی میں رات اُدکس قدر مہیب محسوس ہوئی ہے۔



ناور شام کو دفتر سے گھر واپس لوٹا تو مڈر نے تنسیم سے اس کی ملاقات کروائی۔ شادی کی مبارک باد دینے کے بعد اس نے کہا۔

”مہاجانی! اس غریب خانے کو اپنا ہی گھر نہیں۔ جس چیز کی ضرورت ہو کر یا کو بتا دیں۔“ ”کیا! کیا! میرا نام سسلے میں لیا جا رہا ہے۔“ نادر کی بیوی ایک چھوٹی غریبہ لیے جس میں چائے کے تین کپ رکھے ہوئے تھے گھر سے میں داخل ہوتے ہوئے لڑتی۔

”میں بھائی کو بتا رہا ہوں کہ میری بڑی اچھی بیوی ہے۔“ نادر نے کہا۔

”اگر شرا اچھی بیوی ہے تو کیا کوئی بری بیوی بھی رکھی ہوئی ہے۔“ نادر کی بیوی نے چائے کی ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔

”کان پکڑتا ہوں میرے لیے ایک ہی کافی ہے۔“ نادر نے دونوں کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

”آپ مردوں کا کیا اعتبار..... اب مڈر کوئی دیکھ لیں۔ کتنے مزے سے گھر والوں سے چھپتے چھپاتے شادی کر کے بیٹھ گیا۔“ اماں باپ کو ارمان نہیں ہوتا ہے کیا عزت سے بھوگھر لائے۔ دس لاکھ انظر میں رکھی ہیں مائیں اپنے بیٹیوں کے لیے۔ آٹنی بے چاری کو جب پتا چلے گا تو کتنا افسوس ہوگا انہیں۔“ ثریا نے چھپتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”چلو کوئی نہیں جہاں میرے یا رکھ دلا مل گیا۔“ نادر نے اپنے صلح جو لہجے میں بیوی کی گری گفتار کو گویا دھیمیا کرنے کی کوشش کی۔

”میرا تو یہی سوچ سوچ کر دل دکھے جا رہا ہے کہ بے چارے لڑکی کے گھر والوں پر کیا گز رہی ہوگی۔ جیتے جی مر گئے ہوں کہ وہ تو.....“ ثریا نے اپنے دونوں رخسار پہنے۔ ”جس گھر کی ایک لڑکی گھر سے بھاگ کر اپنی مرضی سے پیچھے جا کر شادی کر لے اس گھر کا پھر رستہ بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے لوگ۔“ کیا کہ ثریا نے تنسیم کو مخاطب کیا۔ ”تنسیم اور نہیں ہیں تمہاری؟“

”جی۔“ تنسیم جس کا خنیدہ سر شریا کی باتوں سے اور بھی جھک گیا تھا آہستہ سے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے جھکی آواز میں بولی۔

”تھیں؟“

”جاری۔“

”تم سے بڑی یا.....؟“

”دو بڑی ہیں مجھ سے دو چھوٹی۔“

”بڑی بہنوں کی شادی ہو گئی؟“

”تنسیم کو دل ہی دل میں شرا پر غصہ آئے لگا۔ یہ سب کچھ وہ اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں بھی تو پوچھ سکتی تھی مگر شاید وہ اسے اپنے شوہر کی موجودگی میں ذیل کرتا جا رہی تھی۔

”جی نہیں۔“ اس نے بڑی بہنوں کی شادی کے بارے میں شریا کے استفسار پر کہا۔



"بہت ظلم کیا تم نے اپنی بہنوں کے ساتھ..... کیا ہوگا بے چاروں کا مستقبل! کون لے جاتا پسند کرے گا انہیں اپنے گھر۔"

ثریا کے بیڑے تو رخصتوں سے تینم کو شرمندگی اور ذلت کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنی خطا سے زیادہ اسے مدثر پر غصہ آ رہا تھا جس نے اسے اپنے گھر لے جانے کے بجائے ایک انجانے گھر میں لا بیٹھا تھا۔

"بھائی! کتنے ہیں؟" ثریا نے پوچھا۔

"ایک۔"

"بڑا اچھا؟"

"چھوٹا۔"

"سچ بتاؤ، وہ بے چارہ بھی اب ساری زندگی سرفیش اٹھائے گا کسی کے سامنے۔"

تینم کے جڑے آپ ہی آپ بیچ گئے۔

"گھر سے نکلتے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ انعام کیا ہوگا۔"

"چھوڑیں بھائی آپ کن چکروں میں پڑیں۔" مدثر نے جوابی دیے سے ثریا کی دھل در معقولات کو بڑے مبروضہ سے برداشت کر رہا تھا جھلائے ہوئے تھے۔

"مجھے پتا ہے نہیں میری کھری کھری باتیں پر ہی لگ رہی ہوں گی۔ میں خود بھی بھٹی بنی والی ہوں۔ برا مت ماننا مدثر تمہاری اپنی کوئی بہن نہیں ہے اس لیے مجھے دوسروں کی بہنوں بنیوں کی عزت کا احساس نہیں۔"

"اسی بات نہیں ہے بھائی۔" مدثر کا کواری سے بولا۔

"میں تو کرتی ہوں کھری بات کسی کو بری لگتی ہے تو گلے۔"

"اب بس بھی کرو ثریا۔" نادر نے ٹوکا۔

"ثریا تو بس کر رہی دے گی، زمانہ بس نہیں کرے گا۔ ان کی اولاد بھی بیٹھے ہے گی اس بات کے کمان کے امان

اپانے پھیری جا کر اپنی مرضی سے نکال دیا تھا۔"

"اوہو! نادر بچ دکھائی دینے لگا۔"

"وہو۔" ثریا نے نادر کی شکل اتارتے ہوئے اسے گھورا۔

"اچھا یاد مدثر کی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔" نادر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ثریا نے چائے کی ٹرے سے ایک گک اٹھا کر نادر کو گھما دیا۔

"رات کو کھانے میں کوئی خاص چیز خواؤ؟" نادر کے لیے سے حائل تھا کہ یہ بات محض رسالو چور تھا۔

"نہیں نہیں، کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ اپنا گھر ہے جو موجود ہے کھالیں گے۔" مدثر نے کہا۔

"میں نے تو ادھر ہی دال چڑھا رہی۔" ثریا بولی۔

"دال بڑا ہال۔" مدثر اپنی خفت مٹانے کو چکا۔

نادر اور ثریا کے جانے کے بعد مدثر اس کا ہاتھ اپنے لیے لیتے ہوئے بولا۔ "بھائی کی باتوں کا برانہ مٹانا..... دراصلاف گوی عورت ہیں مرد کی اس کا ہاتھ اپنے لیے لیتے ہوئے بولا۔ "بھائی کی باتوں کا برانہ مجھے لگتا ہے انہیں ہمارا یہاں آنا چاہئیں لگ۔ پھر کو بھی وہ بڑی اکھڑی اکھڑی ہی تھیں۔"

"اکھڑی اکھڑی ہوں یا جی جی، انہیں اور ہمیں مجبوراً ایک دوسرے کو برداشت کرنا پڑے گا۔"

"تم مجھے اپنے گھر کب لے جاؤ گے؟"

"لے جاؤں گا ثریا..... جلدی لے جاؤں گا..... اوہو تم نے اچھا کیا جو گھر کو دلا دیا۔ می انتظار کر رہی ہوں گی فون تو کر دوں۔" مدثر نے اپنا موبائل آن کیا اپنی کامیاب گھبراہٹ لایا۔ لاؤڈ اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے تینم، مدثر کی بات پر چپت بھی بن سکتی تھی۔

"میں نہیں فون کر کر کے کھٹک گئی۔ آج کہاں غائب ہو تم صبح سے اب تک؟" اس نے می کو کہتے سنا۔ "اور ان کیوں بند کر رکھا ہے تم نے؟" مدثر نے اپنے کان کی لوسہلاتے ہوئے تینم کو دیکھا اور دھیرے سے آگے دبا کر اس سے جھوٹ بولا۔

"اسائنمنٹ تیار کر لی تھی۔ لائبریری میں بیٹھا ہوں یہاں فون بند رکھنا پڑتا ہے۔"

"کچھ کھایا یا؟"

"آپ پیسے کدھر دیتی ہو جو بندہ کچھ کھانی سکے۔"

"اچھا پیسے دے لیخیر ہی تم اتنے بڑے ہو گئے۔ ساڑھے آٹھ بجے تھے والے ہیں گھر کب آؤ گے؟"

"آج جاؤں گا آج جاؤں گا۔ ذرا کام ختم کر لوں۔" اس نے تینم کی جانب دیکھتے ہوئے دوبارہ آنکھ دوائی۔ می بات ختم کر کے اس نے دوبارہ فون آکر فاپاؤ دینے سے بولا۔

"بچت ہوئی تھی کوئی نکرنا تو براہم ہو سکتی تھی۔ وہ بیڈی کو شتم کو کھڑا تیں۔"

نوسواٹو بچے کے لگ بھگ ثریا نے گھرے کا دروازہ کھٹکا کر انہیں کھانے کی ٹرے بارے ہی پڑادی۔ ایک کھٹک مرغی کا سانس، چار چپائیاں، جگ بھائی، نگاس، پیلے ہی کرے میں موجود تھا۔

"سالن، روٹی اور ضرورت ہو تو لے لیتا۔" ثریا نے کہا۔

"بہت ہے بھائی۔"

"رات کا کیا پروگرام ہے مدثر؟" ہرے نادر کی آواز سنائی دی۔

مدثر نے ٹرے سے ایک ہاتھ میں پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے کرے کا دروازہ کھولتے ہوئے باہر دیکھ کر کہا۔ "گھر جاؤں گا یا رہا آپ لوگ میرے انتظار میں بیٹھے نہ رہنا، دروازہ تینم بند کر لے گی۔"

"بھائی سے کہنا آرام سے سوئیں، اپنا گھر سمجھ کر۔"

"ہاں ہاں، بارہ اپنا ہی گھر سمجھا ہے جی تو تمہیں تکلف دی ہے۔"

"اپنا گھر بھی کہتے ہو اور تکلف دینے کی بات کر کے تکلف کا اظہار بھی کرتے ہو۔"

"سوری یا سوری۔" نادر سے اپنے مکالے کے دوران مدثر تمام وقت ایک ہاتھ سے کھانے کی ٹرے پکڑے

رہا۔

رات بارہ بجے تک مدثر تینم کے پاس رہا۔ بارہ بجتے کے بعد وہ اپنے گھر جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے اکیلے ڈر لگے گا مدثر۔"

"ارے کی کوئی بات نہیں۔ نادر میرا جگری بار ہے۔ مجھ کو سا ہے جیسے اس پر اسی لیے تمہیں یہاں لے کر آیا۔"

"نادر! کیا بات ہے۔" نادر ہے، بھائی ہیں، سچ ہے۔"

"میں کو تو انہوں نے ہمارے گھرے میں لٹکا ہے آنے کی نہیں دیا۔"

"تمہارے سہاگ دن کی پرائیوٹ کی کا خیال رہا ہوگا یا کو۔" وہ تینم کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے

”بھائی اتنا خیال رکھنے والی نہیں لگتیں، دیکھا نہیں شام کو انہوں نے کتنی باتیں سنائیں تمہیں اچھے۔“

”اچھا خبر آؤ آ کر روز وہ بند کرلو۔“

”رنگ جاؤ تا پلیر!“ اس نے مدڑ کا ہاتھ پکڑے ہوئے لیے حاجت سے کہا۔

”بھگا دیو ارگھر میں بھی تو حاضری دیتی ہے۔“

”ایک رات سے کیا فرق پڑ جائے گا۔“

”رات بھر کمرے سے غائب رہنے کی کوئی ہنسی نہیں رہی ہے میری، جی، ڈیڈی کو ساتھ لے کر ڈھونڈنے لگا کھڑی ہوں گی اور میرے ہاتھ لگے ہونگے وہ جو تے لگا میں کی.....“ جملہ اور اور اچھوڑتے ہوئے اس نے اپنی دائیں انگشت شہادت سے باری باری دونوں کانوں کو چھوا۔

”صبح کب آئے گے؟“

”ظاہر ہے یونیورسٹی جاتے سے پہلے تک کو حاضری دینی ہوگی۔“ اس نے تنہم کو بڑی بیٹھی بیٹھی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا پھر نہ سورتے اور ایک ہاتھ سے سر جھکاتے ہوئے بولا۔ ”یار! تو یونیورسٹی پر اہم ہوگی۔ ماں کے پاس حاضری لگواؤ۔ تیکم کو چورہ دکھاؤ۔ یونیورسٹی میں حاضری لگواؤ۔“

”یونیورسٹی کیوں؟“

”یونیورسٹی کیوں؟“ اس نے تنہم کے الفاظ دہراتے ہوئے اسے یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کر دی ہو پھر اس کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ ”یونیورسٹی اس لیے کہ ہم دونوں کے ایک ساتھ غائب ہونے پر کوئی پر اہم نہ ہو اور اس لیے بھی کہ آخری سمسٹر سے کلاسز سنسن نہ ہوں۔“

”تو پھر تمہیں کچھ روز یاد دہانا چاہیے ہو۔ میری ایسی ٹولاسٹ سمسٹر ہے، ہر یوں کا پھر اس ایک سال اور دہ جائے گا۔“

”دیکھتے ہیں یار وائٹ کس کروٹ میں بیٹھا ہے..... نہ دار اور بھائی سو گئے ہوں گے، آؤ تم دروازہ بند کرلو۔“ وہ کھر کا بیرونی دروازہ اندر سے بند کرنے کو اس کے ساتھ ہوئی۔ کھر میں سناٹا تھا۔ دوسرے کمرے کا بند دروازہ دار و دربار اور بچوں کے سونے کا غماز تھا۔ دھڑنے آگئی سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں باہر نکلے ہوئے آہستہ سے بولا۔ ”کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے آرام سے سو جانا۔“

دھڑکے جانے کے بعد اس نے دروازہ اندر سے بند کیا، لیے لیے ڈنگ بھرتی اپنے کمرے میں آئی اور جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر کے قفل چڑھالیا۔ کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی سوچیں کا درکل گیا۔ اماں، ابا، بیٹھیں، بھائی سب اسے پوری طرح ٹوٹ کر یاد آئے گئے جیسے وہ صدیوں سے ان سے چھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

تمام اہل خانہ غلاب محول اب تک جاگ رہے تھے۔ ہر ایک اواس، ہر ایک مضطرب جیسے گھر میں اللہ نہ کرے کوئی مہم ہوگی اور بھائی رات کاٹنے نہ کر رہی ہو۔

”سو کیوں نہیں جاگتیں؟ ابا نہ جانے تھی بار اماں سے کہہ چکے تھے۔“

”سو جاؤ گی..... آپ تو سوئیں..... صبح دفتر بھی جانا ہوگا۔“

اباں کو تنہم کی نہ جانے کب کب کی اور کون کون سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کا دنیا میں آنا، اس کا بچپن،

کھانوں کے بل چنان، پہلی بار قدم اٹھانا، بھاگنا، بولنا، تلخانا، ہنستا، مسکراتا، شراوتیں، شوخیان، پیاری آرزوی، اوائل کھڑی سے مندی پین، بڑے ہونے پر تنگ مزاجی، بھائی بھنوں سے لڑائی جھگڑے، اسکول کا بھر پور یونیورسٹی جانا، ہر روز کی رنگ کی اس پر خصوصی توجہ اور گھر میں اس کا آخری دن! اس روز اس نے کمرے سے جاتے ہوئے کاشی رنگ کی پھولدار قمیض اور ہم رنگ شلوار اور دو پانچین رکھا تھا۔ حسب عادت، بناسلام کے، بغیر خدا حافظ کہے جب وہ کمرے سے نکلی تو انہوں نے روزانہ کی طرح آیت الکرسی پڑھ کر اس کے گرد حصار باندھ دینے کی نیت کی تھی۔ کمرے سے باہر جانے والے اپنے تمام اہل خانہ کے لیے ایسا کرنا ان کا معمول تھا۔ روزانہ کی طرح اس دن بھی اماں اپنے کمرے سے باہر نکلنے کے رخ پر غصے والی کڑکی کے بازو دیکھ کر ذلیل جیتز رہ گئی تھی۔ کچھ کمرے سے باہر جانے والے افراد خانہ کو باری باری یاد جاتے دیکھتی رہی تھیں۔ پہلے تقدیس لگتی تھی اس کے بعد تعظیم، پھر ابا ان کے بعد تقدیم اور سب سے آخر میں تنہم۔ وہ اسے اس وقت تک دیکھتی رہی تھیں جب تک وہ ان کی نظروں سے اوپر نہ ہو جاتی تھی۔ کبے جرحی کر وہ آخری مہم کر کے جا رہی تھی۔ کندھے پر سرسری رنگ کا پڑا سا رانا نیک لٹکا کر جو مسلسل استقبال اور کسبوں کا بچوں کے علاوہ نیک اب کی کواڑ بات اور بے شمار غم کے بعد بھی نہ توٹنے کے بعد ہر بار موچی کے ہاں موچی کے ہاں سے گھارنا نیک لے کر۔

اماں کا دل پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اپنی کھکھ سے جتنی تنہم کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ دل میں طرح طرح کے دایے سر اٹھا رہے تھے۔ جانے کون ہو گا وہ جس کی خاطر وہ ان سب کو چھوڑ گئی تھی۔ یہی جو نصیب تھی۔ ماں باپ کے گھر سے عزت سے رخصت ہونا بھی نصیب نہ ہوا۔ اس وقت نہ جانے کہاں ہوگی۔ دلے جانے والے نے کیا سلوک کیا ہو گا اس کے ساتھ۔ لڑکیوں کو اپنی چٹنی چھڑی باتوں سے بکا کر بھگا لے جانے والے ہمیشہ اسی سلوک ہی تو ہیں کرتے بھاگ گئے والی لڑکیوں کے ساتھ۔ یہ چوائے دن تو جوان لڑکیوں کی لاشیں بھی کسی ہل کے کمرے میں، بھی کسی دیوان کی مقام پر لاکر پٹی ہیں ان میں نہ جانے کتنی تنہم کی طرح شریف اور عزت دار گھرانوں سے بھاگ کر گئے والیوں کی لاشیں ہوتی ہوں گی۔ اماں کا دل رہ رہ کر اب تھا۔ اللہ نہ کرے تنہم کسی دھڑکے کا تھول پھس کر کسی ناگہانی ہی شکار نہ ہو جائے۔ اماں کو بول سے اٹھ رہے تھے۔ اللہ نہ کرے آنے والی صبح اخبار میں کوئی ایسی ویسی خبر نہ ہو تنہم کے بارے میں۔

”ابھی ابھی بھی میرے پیٹ کی تھی تو ہے۔ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔“ اماں تنہم پر اپنے تمام تر فیس کے باوجود اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر پول میں دل میں دعا میں مانگ رہی تھیں۔

ابا کو بھی جتن نہیں آ رہا تھا۔ بھی گروت بدلنے بھی اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ رہ رہ کر کھڑی سانسیں بھر رہے تھے۔ مجھ میں نہیں آ رہا تھا تنہم کو کہاں تلاش کریں۔ کیونکر اسے گھر واپس لائیں۔

بیٹھیں کیا بڑی کیا چھوٹی سب کی سب گھر مند اور سرفراز ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو یہی دکھ کھائے جا رہا تھا کہ تنہم اس وقت نہ جانے کہاں ہوگی اور کس مشکل میں ہوگی۔ خوش آمدی کی کو بھی نہیں تھی۔ تقدیم کو بھی نہیں۔ ٹھٹھ کا خالی کمرائیں کاٹ کھائے کو آ رہا تھا۔ اس کی چیزیں دیکھ کر خال نہ کو آ رہا تھا۔ نیند ان سب کی آنکھوں سے کود رہی۔

”تقدیم آئی اگر کسی نے پوچھا کہ تنہم باہی کہاں گئیں تو کیا کہیں گے؟“ تقدیس نے تعبیر لکھ میں پوچھا۔

”ابھی دو چار دن کوئی ٹوکس ہی نہیں لے گا۔“ تقدیم نے اسے مل دینے کی کوشش کی۔

”اس کے بعد؟“ تمہید کا پوچھ تقدیس کے لہجے سے بھی زیادہ پیچھے تھا۔

”انشاء اللہ اس سے پہلے ہی کوئی راستہ نکل آئے گا۔“ تقدیم نے تمہید کے شانے پر ہاتھ دھرنا ہوئے کہا۔

”کیسے، کیسے تفصیل گارانتہ، جب اس کا سوا بل ہی بند ہے۔“ تمہید کی آواز سے طالع چمک رہا تھا۔

”کب تک بند رہے گا..... جب گھر کی یاد کی آئے تو ضرور کھولے گی کہ اپنا سوا بل۔“

”کیا پتا کب یاد آئے۔“ کتنے دنوں بعد۔“ تمہید دھکی دھکی ہو رہی تھی۔

”یہ بھی تو ہو سکتے ہیں تقدیم کی کہ شادی والی بات کسی نے ان سے زبردستی بیچ کرائی ہو، کوئی انہیں اغوا ہی کر کے لے گیا ہو۔“ تعلیم دور کی کوڑی لائی۔

تقدیم نے چونک کر تعلیم کی طرف دیکھا۔ اس کتنے پرو شام سے اب تک کی کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ ہاں ممکن تو تھا کہ انہیں نہیں..... حالات اور واقعات سے تو یہی ظاہر تھا کہ اب نہیں تھا۔ نسیم کے سوا بل فون پر ایک نہیں بیسیوں ایس ایم ایس تھے جو تقدیم نے پڑھے تھے اور تعلیم کے اندیشے کی نشی کرتے تھے۔

”کلچر کو بخیر رکھی جاؤں گی میں، وہ ہو سکتا ہے وہاں سے کوئی سراغ مل جائے۔“ تقدیم نے کہا۔

تمہید سمیت تینوں بیویوں نے اسے انتہائی محرو سے اور یقین سے دیکھا۔ گھر میں جب کوئی چھوٹا بڑا مسئلہ ہوتا اب اسے بعد سر اسی نوعیت دہندہ کے طور پر دیکھنے لگتے تھے اور وہ عموماً اس اعتماد پر پوری ہی اتاری تھی۔ رات چھٹا پہر تک جانے کے بعد بالآخر چاروں بیویں آڑی تر جھگی ہو کر دو پٹکوں پر سو گئیں۔ کسی نے سچ کہا ہے خندہ بونہی پر چچی آجاتی ہے۔ صبح لا فتر تھیں گئے۔ تقدیم نے اپنے دفترو سے چھٹی کی اور پوچھوئی جانے کی تیاری کرنے لگی۔

☆☆☆

تقسیم کو شذر اساتط طرح سے خبر ہو نہیں سکی تھی جیسے اپنے گھر میں سویا کرتی تھی۔ نیند اور اس کی آنکھوں میں آنکھ پھولی رہی۔ تھوڑی دیر کو آنکھ کھلتی پھر کل جاتی۔ ایک فیکر گھر اسے نیند رات بسر کرنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ گوردوارہ اندر سے مقل تھا۔ کھڑکی کی دونوں جھنجھلیاں بھی اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ مدثر بھی یہ اطمینان دلا گیا تھا کہ اہل خانہ سے اسی کی نہیں اس کے گھر والوں کی بھی برسوں پرانی شناسائی تھی مگر کچھ بھی وہ خوفزدہ نہ تھی۔ کتنے بہت واقعات ایسے ہی ہوتے تھے جن میں شناسائی کا رد گرائی دکھا جاتے تھے۔ اسی خوف کے درمیان اسے رد کردہ اپنے گھر والوں کا خیال بھی آتا رہا۔ اس نے دور جبر مدثر کو بھی نہ کیا۔ پہلے کوئی ذیہہ بچے کے لگ بھگ پھر میں بچے۔ پہلی کال پر وہ کافی دیر اس سے بات کرتا رہا۔ دوسری کال پر اس نے کہا۔

”سوجاؤ کیا..... تمہاری آواز سے سردار اور بھائی د مضر بھوں گے۔“

”میں بہت آواز ہول رہی ہوں۔“

”پھر بھی۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے مدثر۔“

”مگر میں بند کر دوں سو نے کی کو کوش کرو۔“

”نیندی نہیں آ رہی..... تیرے صبح آؤ گے؟“

”نمایا تو تھا نہیں..... پوچھوئی جانے سے پہلے تمہاری طرف ہی آؤں گا۔“

”مئی ڈیڈی کو کب بتاؤ گے؟“

”انشاء اللہ بہت جلد..... اچھا اب تم سوجاؤ۔“

”میرا تم سے باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے مدثر۔“

”کر لیں گے بار۔“ باتیں ہی کریں گے اور ہم نے کیا کرنا ہے مگر اس وقت سوئے سے جاگا ہوں بکل پر اداوں اس طرح کنز راتم جاتی ہی ہو۔ دو تین گھنٹے سو جاؤں پھر فریج میں بوکر تمہاری طرف آؤں گا..... اوکے..... گڈ نائٹ۔“ اس کے گڈ نائٹ کہنے سے پہلے ہی مدثر نے فون کا کل قطع کر دی۔

”علی الصباح کسی نے زور زور سے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔“

”کون؟“ اس نے دروازے کے نزدیک جا کر پوچھا۔

”میں ہوں۔“

وہ بچپان ہی، یہ قانون خانہ کی آواز تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا پھر اسے مدثر کی بیگم کی چھٹی ہوئی نگاہوں کا سامنا تھا۔

”السلام علیکم؟“

”علیکم السلام۔“ انہما دو کھولتے چائے لے آؤں۔“ انہوں نے اسے سرتا ہتھیلی دنگا ہوں سے دیکھا۔ وہ شرم سے کٹ کر روہی کی سڑیہ پہنے گئے تھے تاہو پلٹ گئیں اور نسیم دروازہ بند کر کے غسل خانے میں جا گئیں۔ خاموشی دیر بعد واپس کرنے سے ہوئے آئیں۔ چائے کا ایک گلاس، ایک پراٹھا اور ہاف فرائی اٹھا۔ غرے کو بیڈ پر رکھ کر وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

”رات کو جب میری آنکھ کھلی، مجھے تمہارے گھر والوں کا خیال آیا۔ کیا گزری ہوگی بے جا چاروں پر۔“ نسیم کو صبح صبح ہی پچھرا بازی بری تھی۔

”ماتا تم نے ان کی سلی کو بچ کر دیا تھا، ایک مرتبہ فون بھی کر لیتیں۔“ وہ چپ رہی۔

”ہاں مگر کس منہ سے کروئی فون..... ان کی تو عزت خاک میں مل چکی۔“ دفعتاً ترچہ چوکی۔ ”اچھا کپڑے بدل لے تم نے، میں نے تو اب غور کیا۔ کپڑے لے کر لگتی ہوئی گھر سے..... کیوں؟“ ثریا کا آخری استفسار یہ جملہ جواب کا حتمی تھا۔

”جی..... ایک جوڑا..... لے آتی تھی میں۔“ اس نے سر دھپے میں جواب دیا۔

”بھئی واہ! بڑی ہو شیار ہو۔“ اس کے جی میں آیا کہ یہ سادہ تو آپ بھی نہیں تھیں مگر مصلحت کے تحت چپ رہی۔

”ایک بات بتاؤ۔“ وہ اس کے رو برو آکر کھڑی ہوئیں اور اسے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ایک گھر آڑی کے لیے اپنے گھر کو چھوڑتے ہوئے تمہیں ڈرتیں لگا۔ کورٹ جا کرتے سے شادی کرنے کے بجائے اگر مدثر تمہیں کہیں اور لے جاتا اور خراب کر کے چھوڑ دیتا تھا تو اسے تمہیں مار مورت دیتا تو؟“ نسیم کو اب ضبط دیا اندر رہا۔

”مدثر تو آپ کے سپنڈ کے دوست ہیں، کیا آپ انہیں ایسا سمجھتی ہیں۔“

”بات میرے سمجھنے کی بجائے تمہیں سمجھانے کی ہے۔ میرے سپنڈ کا دوست ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ مدثر کوئی رشتہ ہے..... انسان ہی ہے اور انسان پر شیطان آتے تھی دیر کی ہے۔ اللہ نہ کرے بدل جانے اس کی نیت تو پھر؟“ دوسری رتیں نہا کر تھیں..... اور بھی بھی کیا کہ مدثر کے گھر والے تمہیں قبول کرتے ہیں یا نہیں۔“

”نسیم نے بے ساختہ ہڑبڑا کر شریا کا دیکھا۔“

”ہاں ہاں غلط تھوڑی کبہ رہی ہوں۔“ اپنا گھر چھوڑ کر آنے والی لڑکیوں کو لوگ آسانی سے تھوڑی قبول کرتے ہیں۔ یہی لڑکے والوں کی بھی عزت ہوتی ہے آخر..... عزیز رشتے دار ہوتے ہیں، دوست احباب ہوتے ہیں۔

”جیلے والے ہوتے ہیں۔“ انہیں بھی تو منہ دکھانا ہوتا ہے۔ لوگ چوکے تھوڑی ہیں باتیں جاتے اور اگلیاں ملنے جیلے والے ہوتے ہیں۔“





تقدیم کو اپنے جڑوں پر دباؤ محسوس ہوا۔ ”مجھے تسنیم سے ملنا ہے۔“ اس نے براہ راست استفسار سے گریز کیا۔

”تت..... تسنیم.....؟“ وہ بے ساختہ ہٹلایا۔

”ہاں..... تسنیم۔“ تقدیم نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ”مجھے اوپر آپ کے ڈپارٹمنٹ میں بتایا گیا ہے کہ تسنیم سے ملنے کے لیے مجھے آپ کو تلاش کرنا چاہیے۔“

”میرا..... تسنیم سے کیا تعلق ہے؟“ وہ ٹپٹپٹا کر بولا۔

”کچھ نہ کچھ تو ہوگا جو تسنیم سے ملنے کے لیے مجھے آپ کو تلاش کرنے کو کہا گیا۔“

”کس نے کہا؟“

”اچھا خیر..... بائی داوے آپ ہیں کون؟“

”میں تسنیم کی بہن ہوں۔“

”آئی سی۔“ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی کی چین کو اپنی انگشت شہادت پر مضطربانہ نچانے لگا۔

”تسنیم کہاں ہے؟“

”مجھے کیا پتا۔“

”غلط بیانی کی ضرورت نہیں۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے غلط بیانی کی..... غلط بیانی تو آپ کر رہی ہیں..... خود کو تسنیم کی بہن کہہ رہی ہیں اور پوچھ مجھ سے رہی ہیں کہ وہ کہاں ہے۔“

”میں غلط بیانی نہیں بدقسمتی ہے میری۔“

”ایلیکٹریسی..... میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔“ تقدیم سمجھ گئی وہ فراہ کو بہانہ تراش رہا تھا۔

”تسنیم کل صبح یونیورسٹی کے لیے کمرے نکلی تھی۔ شام کو اس نے میرے موبائل پر پیج کیا۔“

”سوری..... مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ مستقل نظریں چرائے ہوئے تھا۔

”یہ نہیں پوچھیں گے آپ کہ کیا پیج کیا تھا اس نے؟“

”دیکھیں جی..... مجھے کسی کے پیج سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں یہاں پڑھنے کے لیے آتا ہوں اور بس۔“

”کاش ایسا ہی ہوتا۔“

”کیا مطلب؟“

”تسنیم کل سے گھر نہیں لوٹی ہے۔“ تقدیم نے اس کا رد عمل دیکھنے کو توقف کیا۔ ایک نوجوان لڑکی کی گمشدگی کی خبر کسی اجنبی کو بھی چونکانے کے لیے کافی تھی مگر اس نے ایسا کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ ”اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانی ضروری نہیں تو ہمیں کسی پر تو اپنا شبہ ظاہر کرنا ہی ہوگا۔“ تقدیم نے گہری نگاہوں سے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے اس قصے سے نہ سروکار تھا نہ دلچسپی۔ ”ہم پولیس کو تمہارا نام دیں گے۔“ تقدیم نے گویا شیپ کا مصراع ادا کیا۔

”میرا! میرا نام کس سلسلے میں؟“ اس نے ہڑبڑا کر تقدیم کو دیکھا۔

”تسليم کی بازیابی کے لیے۔“

”دیکھیں۔“ وہ تیوری بگاڑ کر بولا۔ ”آپ مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، آخر چاہتی کیا ہیں

”تسليم کی ویرا باؤٹس..... اس کا اتنا پتا..... کہاں ہے وہ..... ورنہ.....“ تقدیم نے اسے میز می نظر دوں سے

ہستے ہوئے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی۔

”ورنہ؟“

”پولیس خود معلوم کر لے گی۔“

قریب سے گزرتا ایک طالب علم تقدیم کی بات سن کر ٹھٹھک گیا اور اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مدثر سے

پھٹا چاہا کہ معاملہ کیا ہے۔

”کچھ نہیں یار۔“ مدثر نے ہاتھ اٹھا کر اسے اطمینان دلایا۔ وہ ایک نظر تقدیم پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

”دیکھیں یہ یونیورسٹی ہے۔ یہاں اس طرح کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ اور ہیر کرنے والے کہانیاں بتا لیتے

”ا۔“

”کہانیاں بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ ڈپارٹمنٹ گواہی دے گا کہ تسليم سے تمہاری دوستی تھی۔“

”جھوٹ..... بکو اس.....“ وہ پاؤں زمین پر مارتے ہوئے بولا۔

”چلو..... گواہی دلو انی ہوں تمہارے اپنے ڈپارٹمنٹ کے لوگوں سے۔“

وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

”اب چپ کیوں ہو گئے؟“ تقدیم آپ سے تم پر آچکی تھی۔

اس نے ایک نظر تقدیم کو دیکھا۔

”بولو؟“

”اگر دوستی تھی بھی تو آپ صرف مجھے قصور وار نہیں ٹھہرا سکتیں۔“

”تو تم اس سے اپنی دوستی تسلیم کر رہے ہو؟“

”جی۔“ وہ نظریں جھکا کر بولا۔

”وہ تمہارے پاس ہے؟“

اس نے سر جھکایا پھر آہستہ سے اثبات میں ہلایا۔ تقدیم نے ایک گہری سانس کھینچی۔

”کورٹ میرج والی بات میں کتنی حقیقت ہے؟“

”سو فی صد۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

تقدیم کا دل پھٹ پڑنے کو تیار ہوا مگر مصلحت وقت کے تحت اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا اور متحمل

”میں بولی۔“ صرف ایک بار یہ سوچ لیتے کہ وہ کسی کی بیٹی، کسی کی بہن بھی ہوگی۔

”میں اپنے پرنس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا تھا مگر وہ کہتی تھی جب تک بڑی بہنوں کی شادی نہیں ہو جاتی

پرنس راسٹی نہیں ہوں گے۔“

”اب ان باتوں کا وقت نہیں رہا..... پوچھ سکتی ہوں تمہاری اپنی کتنی نہیں ہیں؟“

”کوئی نہیں۔“

تقدیم نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تجھی تمہیں بہنوں کی عزت کا احساس نہیں۔ سوچ سکتے ہو کہ کیا گزری ہے



”جیتے جی ماریا ہی تم دونوں نے ہم سب کو تنسیم نے کبھی یہ بتایا تمہیں کہ والدہ کمزور اعصاب کے آدمی ہیں۔ والدہ بیروسوں سے ذہنی تنگی رہیں ہیں، بھائی ابھی بڑی ذمے داریاں اٹھانے کے لائق نہیں ہیں، چار بیٹیں گھر میں اور میری ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ ایک فیصلہ جی بہت سے رشتے جڑے ہوئے تھے اس سے۔ خلا میں ہیں، چچا ہیں پھوپھیاں ہیں ان کے کنبے ہیں۔ کیسے منہ دکھائیں گے ہم ان سب کو؟ جذبات کی شدت سے تقدیم کی آواز گھونک رہی تھی۔

”سوری؟“

”وہ اس کے چپ ہو جانے کے بعد اچھے سے بولا۔

”تمہارے سوری کہہ دینے سے مٹی ہوئی عزت واپس نہیں آسکتی۔ بڑے باپ اور محذور ماں کے دل کے

گدغد بھر گئیں تھیں۔“

”تقدیم نے اسے زہر خنطوروں سے دیکھا۔

مڈرنے اپنا جھکا ہوا سر اور میری جھکا لیا۔ کچھ دیر کو خاموشی ان دونوں کے درمیان حاوی ہو گئی پھر تقدیم نے گھٹا لپٹے اور بوسل آواز میں کہا۔“ اسے جو حیات کرنی تھی وہ کچل چکی۔ اب تم ایک فیور دو۔“

اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا یا اور تقدیم کو دیکھنے لگا۔

”ایک سر تیرا والدین کے گھر سے رخصت کر کے لے جاؤ گے۔“

”آپ کا مطلب ہے آپ کے گھر سے؟“ وہ چونک کر بولا۔

”ہاں۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”میری والدہ کا فیصلہ ہے اور خواہش بھی۔ وہ نہیں چاہتیں کہ تنسیم کی اس غلطی کا اثر باقی بھائی بہنوں کے مستقبل پر پڑے۔“

”یہ تو بہت پاز پیئر وچ ہے ان کی۔“

”جی جیوری ہے۔“ تقدیم کے لہجے میں تھی۔

وہ شرمندہ سا نظریں لگا۔

”والدہ جانتی ہیں اس سے پہلے کہ محلے والے اور دلہن سے دار گھر میں تنسیم کی عدم موجودگی کا نوٹس لیں۔ اسے

ایک بار گھر واپس لا کر رخصت کروا جائے۔“

نوجوان طلباء کے ایک گروپ نے ان کے نزدیک سے گزرتے ہوئے مڈرن پر آواز کی۔ ”کیا ہو رہا ہے مڈرن؟“

مڈرن نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور انگلیاں پچائیں پھر تقدیم سے بولا۔ ”میرا خیال

ہے کہیں اور چل کر بات کرتے ہیں یہاں اچھا نہیں لگ رہا۔“

”تنسیم سے کہاں لا جا سکتا ہے؟“ وہ اس کے ہمراہ چلتے ہوئے بولی۔

”سوری۔۔۔۔۔۔ فی الحال نہیں۔“

”کیوں؟“ وہ چونکی۔

”پہلے مجھے پوچھتو میں اس سے۔“

”کیا؟“

”کیوں کہ آپ ملنا جاتی ہیں۔“

وہ دھڑکتے ہوئے تھی۔ مڈرن چونکا۔ زندگی کے نقش و نگار کبھی کبھی ایک ہی جھلکے میں کس قدر بدل جاتے ہیں۔

الغی کی شدت ناقابل برداشت ہو جانے تو کبھی کبھی انسان رونے کے بجائے ہنس پڑتا ہے۔ تقدیم بھی اس

وقت ایسے ہی تجربے سے گزری تھی۔ کیا لطیف تھا تنسیم سے ملنے کے لیے اسے خود تنسیم کی اجازت دے کر کاٹھی۔

”اصل میں۔۔۔۔۔۔ تنسیم میرے ایک دوست کے گھر میں ہے۔“ مڈرن نے بتایا۔ تقدیم چلتے چلتے رک گئی اور اسے

توجہ طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔ ”میرے اپنے گھر والوں کو بھی ابھی اس سے میری کورٹ میرن کا ظلم نہیں۔“

”حیرت ہے! کس طرح تجھ سے اتنے بڑے بڑے فیصلے کر لیتے ہیں آج کل کے نوجوان۔“

وہ تقدیم سے اپنی ملاقات کے پورے دو درہائے پہنچ چکی بار دھڑے سے مسکرایا۔ ”ہر کوئی آپ کی طرح

بھگدڑا تو نہیں ہوتا ہے۔“ اس نے ایک لمحے کو توجہ کیا پھر بولا۔ ”اگر میں غلطی نہیں تو آپ تقدیم آتی ہیں۔“

”تمہیں میرا نام کیسے معلوم؟“ وہ بے ساختہ چونکی۔

”تنسیم آپ کا گھر ذکر کرتی رہی ہے۔“

”کیوں؟“

”وہ کہتی ہے اباکے بعد تقدیم آتی ہمارے گھر کی دوسری مرد ہیں، بہت محبت کرتی ہے وہ آپ سے بلکہ کبھی گھر

والوں سے۔“

تقدیم خاموش رہی۔ کیا محبت کرنے والے یہ کرتے ہیں جو تنسیم نے کیا تھا۔ کیسی محبت تھی تنسیم کو اس سے اور

باقی گھر والوں سے۔ اس بے وقوف اور عاقبت نا اندیش لڑکی کو تو شاید اپنے آپ سے بھی محبت نہیں نفرت تھی مردنہ

ماں باپ کے گھر کو اس ذلت کے ساتھ چھوڑنے کے بجائے اس گھر میں عزت سے مرجانے کو ترجیح دیتی۔ وہ ایک

بار پھر قدم بہ قدم اس کے ساتھ ساتھ چلتے گئی جس کی آستین اس کے والدین کی ناموس کے خون میں ڈوبی ہوئی

تھی۔

”تمہارے گھر والوں کے ظالم ہوتے ہوئے یہ مسئلہ کیسے کر حل ہوگا؟“ تقدیم نے ششکریہ میں کہا۔

”زیادہ آسانی سے۔“

”کیا مطلب؟“

”ڈیڑی کو تو نہیں ہی کو بتا دوں گا کہ میں نے ایک لڑکی سے کورٹ میرن کر لی ہے، بھائی بھائی کی وجہ سے

الغی میرن کا ڈراما کرنا ہے۔“

”کتنے بھائی ہیں تمہارے؟“

”بہن ایک۔“

”تمہارے پیرش راضی ہو جائیں گے؟“

”جی کیوں راضی کروں گا۔ ڈیڑی کو راضی کرنا ہی کام ہوگا۔ وہ جانیں گے، دونوں راضی ہو جائیں

گے۔ اپنے بچوں کی عزت تو کبھی کو پیاری ہوتی ہے۔ اب دیکھیں نا آپ کی اپنی مدد اپنی بچوں کی عزت کی خاطر ہی

تو اپنا ایک لپٹا جاتی ہیں۔“

”پچھن کو باپ باپ کی عزت کیوں پیاری نہیں ہوتی؟“ تقدیم نے سوچا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بارگ

الغی جا چکی تھی۔ مڈرن کا کوہِ بخت بھی ٹھک گیا۔

”اب آپ کہاں جائیں گی؟“ وہ اسے ایک متعلق سی کیفیت میں دیکھنے لگی۔

”ظاہر ہے گھر..... لیکن سوچ رہی ہوں گھر والوں کی ٹہلی کے لیے کیا ہے کر جاؤں؟“  
”میں..... میں تنہا سے بات کر رہا ہوں..... اگر وہ مان جاتی ہے تو میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے  
آپ کے گھر آؤں گا۔“

”جلد! تقدیم کے لیے میں انتظار ہے تیار رہی۔“

”انشاء اللہ!“  
”تسلیہ کو بہر صورت آمادہ کرنا ہوگا تمہیں۔ یہ ایک گھر کی عزت کا سوال ہے۔“  
”فکر نہ کریں۔ آج میں آپ کو اسناپ تک چھوڑ دوں۔“  
”تھک چکی ہوں، چلی جاؤں گی۔“  
”بیوقوف۔“

اس نے انہماک میں سر ہلایا۔ ”رابطے کی صورت؟“ تقدیم نے استفہامیہ لہجہ میں کہا۔  
”میں خودوں کروں گا آپ کو۔“

تقدیم نے مذہبی گہرائی میں اس کے فون نہ کیا! دھوکا دے کر کہیں غائب ہو گیا تو؟ مگر انڈیٹوں اور وسوسوں  
بھلا کیا تھا آدھا تھا۔ خدا کا نام لے کر گھر و سائے بچا رہا تھا۔ یہی خدا کی مدد تھی کہ وہ دل کیا تھا اور اس نے آخر  
بھی کر لیا تھا۔ اعتراف نہ کرتا تو؟..... پولیس تھانے میں جانے کا مطلب تو صرف جگ ہنسی تھی۔  
گھر پہنچی تو ہم اور جاں میں ڈوٹی کا گاہی اسے اپنی خطر دکھائی دیں۔  
”ہاں بیٹا کچھ پتا چلا؟“ ابا کے لہجے میں شکاک تھی۔  
”جی ہاں۔“ سب بہتر کوش دکھائی دینے لگے۔ اماں نے جملہ احوال سننے کے بعد کہا۔

”خدا اس شخص کو عاقبت کرے۔ اندھا کو بھی ہو کر بیٹھے..... تقدیم تو نے اسے گریبان سے کیوں  
پکڑ لیا..... ارے اس کے پروفیسر کو بتائی۔ اس کے ساتھ پڑھنے والوں میں ذلیل کرتی اسے..... بھگت  
ہماری عزت خاک میں ملائی اس کے منہ پر بھی تو کاک تھی ہوتی تو نے۔“  
”اپنا سکہ کھانا تو پرانے کو کیا دوش۔“ ابا کے لہجے میں دھمک تھا۔  
”ڈھٹائی تو دیکھو کوئی..... کروت کر کے یونیورسٹی میں دندنا پتھر رہا ہے۔“  
”غیبت ہوا تقدیم کی ماں اور نہ کیا چلا کہ وہ کہاں کی اور کس کے ساتھ گئی۔“ ابا کو شاید تنہا کام بھی

زبان پر لانا گوارا نہ رہا تھا۔  
”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔“ اماں نے ایک غصہ کی سانس کھینچی۔  
”کل سے ان دونوں کو بھی گھر بٹھاؤ۔“ ابا نے تقدیم اور تقدیس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے خلاف عادت دشمنی  
سے کہا۔

تقدیم اور تقدیس نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔  
”اب معلوم ہوا لوگ بیٹنوں کی پٹریاں پڑھیں روئے ہیں۔“ ابا کے لہجے میں تلخی تھی۔  
”تہدید تقدیم اور تقدیس کل نظر آئے تھیں۔ ایک بہن کی غلطی نے ان سب پر ابا کے اعتبار کو جھڑل کر دیا تھا  
ہمیشہ محبت سے بات کرنے والے باپ کا یہ رویہ ان کے لیے ایسی تھا۔ تقدیم بھی انہی میں سے تھی۔ تنہا کی  
کی قسمت بے خطا بہنوں کے چہرے پر لڑاؤں دیکھی تو آئیں انھوں ہی انھوں میں اس منظر سے نکل جانے کا اشارہ  
کیا۔ تینوں چپ چاپ کر کے بیٹھ گئے۔ ابا نے اپنے پاسر دونوں انھوں سے تمام کیا۔

جنوں بہنوں کے پیچھے پیچھے تقدیم بھی دوسرے کرے میں پہنچی تو تقدیم اور تقدیس سر جھکائے، منہ لٹکائے بیٹھے  
تھے۔

”ہمارا کیا تصور جو رہا ہے ہم پر پابندی لگا دی۔“ تقدیم اسے دیکھ کر چار حجاب و پجہ میں ہوئی۔  
”ابا شک میں ہیں تقدیم، اس وقت ہمیں ان سے کسی بحث میں الجھنے کے بجائے ان کی پریشانی اور دکھ بٹانے  
کی کوشش کرنی چاہیے۔“ تقدیم نے اسے رمانیت سے سمجھایا۔

”پریشان تو ہم بھی ہیں آپ۔“ تقدیس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تقدیم نے اسے گلے سے لگا لیا۔ وہ اسکے  
گلے تقدیم کا دل دھکے گا۔ اس عمر کی لڑکیوں کے لیے تو زندگی تو س طرح بہت رنگین اور لطیف ہوتی  
ہے۔ تنہا اپنے پیچھے چھوٹی بہنوں کے لیے کیا چھوڑ گئی تھی۔ آنسوؤں میں ڈوٹی اماں کی رات۔ تقدیس کو اپنے  
انہوں کے کس سے دلا سادیتے ہوئے تقدیم کو خیال آیا شام کو کھانا کھا تھا۔ صبح اس نے فون کر کے بتایا تھا کہ  
ابا کی تقریب اس کے گھر پر منعقد ہونے کے بجائے دولہا کی خواہش پر ایک فائو اسٹار ہوٹل میں ہو رہی تھی۔ کتنے  
ایمپلیوں والی ہوٹل ہیں وہ لڑکیاں جو عزت سے ماں باپ کے گھر سے جاتی ہیں اور لے جانے والے چاؤ سے لے  
جاتے ہیں۔ تنہا تنہا بد قسمت تھی۔

☆☆☆

چھوٹا سا گھر باہر سے جھگڑا تھا۔ لیکن خاندان اس وقت ایک فائو اسٹار ہوٹل میں تھے۔ کل تک تو یہی طے تھا کہ  
ابا کی تقریب گھر میں ہوگی لیکن صبح سویرے الطاف نے اسی کو فون کر کے کہا۔  
”آج سنی میں چاہتا ہوں کراچ کانٹنشن ہوٹل میں کیا جائے۔“

”ہوٹل میں۔“ امی اچانک سر پر اُڑنے والے خرپے کے خیال سے پریشان ہو گئیں۔ ”بیٹا ہم نے تو سارا  
اتظام گھر پر کر رکھا ہے۔ کھانا پکانے کا سارا سودا ملحق اسی کیا ہے۔“  
”لیکن..... ہوٹل میں اتنی جلدی بندوبست کے لیے مجھے بہت اوقات قلم علی شاہ سے صلاح کرنی ہوگی۔“

”وہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں خود بندوبست کروں گا۔ بس یہ مجھیں کہ آپ لوگوں کے مہمانوں کی  
طرح آتا ہے۔ کسی بات کی غمگینی ضرورت نہیں۔ ہوٹل میں کھانے کا بندوبست، میمنٹ سب میں کروں گا۔“  
”بیٹا یہ اچھا تھوڑی لگتا ہے۔“  
”بیٹا سنی ہیں اور مختلف ہیں۔“ الطاف نے کہا۔  
”میں نے تو قرعہ قرعہ رشتے داروں کو بھی بلار کھا ہے۔“  
”سر انھوں پر آئی جان..... کچھ اعزاز ہے کہ کتنے لوگ ہوں گے۔“  
”سب مل کر آئیں ہتھیلیں تو ہوں گے۔“  
”آپ کے اپنے گھر والوں کو بھی شامل کر کے یا ان کے علاوہ؟“

”سب گولا کرے۔“  
”کوئی مسئلہ نہیں۔ ہماری طرف سے دونوں ہمیشہ ہوں گی، ان کے شوہر، بیٹے اور میرا ایک دوست اور اس کی  
میں پیاس لوگوں کا بندوبست کر لیتا ہوں۔“  
”گھر میں ہو جاتا تو اچھا تھا ساری تیار ہو جی ہے۔“ امی نے دہلی زبان سے کہا۔  
”نہیں، نہیں آئی، ہوٹل میں ٹھیک رہے گا۔ میں اچھی تھوڑی دیر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کس ہوٹل میں

بندوبست ہوا ہے آپ سب کو بتا دیجیے گا۔ حجاب کو پارلر جانے کے لیے گاڑی کتنے بجے چاہیے؟“

”نایاب لے جانے کی اسے اپنی گاڑی میں۔“

”نہیں، نہیں جب میری گاڑی ہے تو کسی کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت؟“ اس نے گرجوٹی سے کہا۔

”میں حجاب سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے میں ہولڈ کرتا ہوں۔“

امی نے حجاب سے پوچھ کر اسے پارلر جانے کا وقت بتایا۔

زیادہ نہیں پون گھنٹے بعد الطاف کا دوبارہ فون آ گیا۔ اس نے ایک فائو اسٹار ہوٹل میں نکاح کی تقریب کا انعقاد کا بندوبست ہو جانے کی اطلاع دی۔ امی نے سب سے پہلے بھرت پھر نایاب کو اطلاع دی۔ پھر مدعو گئے رشتے داروں کو فون کرنے لگیں۔ قریبی رشتے داروں کو بلانا ضروری تھا۔ بابا کے گاؤں سے رشتے داروں کی شرکت امی نے رخصتی پر موقوف رکھی تھی تاہم انہیں اطلاع کر دی تھی کہ حجاب کا نکاح کر رہے ہیں۔ ہمایوں میں سے کسی کو مدعو نہیں کیا تھا جس کو نہ بلاتیں اسے گلہ ہوتا۔ نایاب باجی کا مشورہ تھا کہ نکاح کے بعد آس پڑوس کے گھروں میں مٹھائی بھجوا دیں گے بس۔ حجاب کے اسکول میں ساتھیوں کو اس کے نکاح کی خبر تو تھی مگر اس نے بلا کسی کو نہ تھا۔ دوستوں میں سے بھی صرف تقدیم کو دعوت دی تھی۔ مقام تقریب کی تبدیلی سے اسے آگاہ کر کے لیے حجاب نے پارلر جاتے ہوئے راستے سے فون کیا۔ تقدیم جو اپنی پریشانیوں میں الجھی ہوئی تھی معذرت خواہانہ لہجہ میں بولی۔

”حجاب اگر میں نہ آسکوں تو ناراض نہ ہونا پلیز۔“

”قل کر دوں گی تمہیں۔“

”ہتا ہے کیا آج تمہید باجی کو دیکھنے کے لیے آرہے ہیں کچھ لوگ۔ میرا گھر پر ہونا ضروری ہے۔“ اس نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لینے کی تدبیر کی۔

”ہاں..... پھر تو مجبوری ہے۔“ حجاب کا جارحانہ لہجہ یک دم مفاہمانہ ہو گیا۔ ”کسی اور دن بلالیا ہو انہیں۔“

”انہیں شاید آج ہی سہولت لگی ہو آنے میں۔“

”کتنے بجے آنا ہے انہوں نے؟“

”سات ساڑھے سات بجے۔“ تقدیم نے جان بوجھ کر وہی وقت بتایا جو تقریب نکاح کا تھا۔

”اگر وقت مل جائے تو آ جانا۔ فون کر دینا مجھے۔ میں کسی کو بھیج دوں گی تمہیں لانے کے لیے۔“

”ٹھیک ہے۔“

شام ہوتے ہی گھر کے فرنٹ پر راستہ تقے جگہ اٹھے۔ امی نے مہمانوں کے استقبال کے لیے بڑے چار سے گھر کے باہر برقی قہقوں والی جھالریں آراستہ کروائی تھیں۔ مگر الطاف کی جانب سے ہوٹل میں تقریب کے بندوبست پر انہیں میزبان کے بجائے مہمان بن کر جانا پڑ گیا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ الطاف نے شاندار بندوبست کروایا تھا۔ بہترین آرکس، پُر تکلف ضیافت، فوٹو گرافرز، مووی میکر، الطاف نے ہر بات کا خیال رکھا تھا۔ تقدیم کا نہ فون آیا نہ حجاب کو تقریب کی رونقوں میں اس کا خیال آیا۔ دلکش عروسی لباس میں ملبوس بھاری زیورات پہنے، پھولوں سے سنوری، خوشبوؤں میں لمبی وہ روشنیوں کے ہالے میں بیٹھی تھی۔ الطاف نے اس کا نکاح پڑھایا جا چکا تھا اور الطاف اس کے پہلو میں بیٹھا بار بار اسے میٹھی نگاہوں سے دیکھنے لگتا تھا۔ امی ڈاکٹر



الڑکی سے محبت ہوگئی ہے اور اس کے گھروالے اس کی شادی کسی اور سے کرنا چاہ رہے ہیں اگر ایسا ہو گیا تو میں خود کشی کروں گا۔“

”چھر؟“

”چھرا! مجھے خوشی ہے بچانے کے لیے یہی ڈیڈی کو میری شادی ہنگامی بنیادوں پر تم سے کرنا پڑے گی اور ہمارا کورٹ میرج کا کسی کو پتا نہیں چلے گا۔“

”نادر بھائی اور ژبا بھائی کو پتا ہے۔“

”ایسا میرا مطلب ہے میرے گھر والوں کو۔“

”کیوں چھپانا چاہتے ہو اپنے گھر والوں سے تم تو کہتے تھے تمہارے ہی، ڈیڈی نے منعم کی بیوی کو قبول کیا ہے تو مجھے کیوں دیکر نہیں گئے۔“

”مجھے کسی کو خوش کرنا بیزار نہیں تمہیں عزت سے اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔ منعم اور اس کی بیوی کو اگر یہ پتا چلا کہ تم مجھ سے کورٹ میرج کر کے میرے گھر آئی ہو تو وہ مجھیں بھی اپنے لیول کا سمجھے گی۔ کسی وقت بھی یہ طعنہ دے سکتی ہے کہ میں نے اگر اپنے ماں باپ کے گھر سے بھاگ کر منعم سے شادی کی ہے تو..... ہوا کیا تم بھی تو اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر مدثر سے کورٹ میرج کر کے آئی ہو۔ یہ طعنہ صرف منعم کی کوئیں ہماری آنے والی سل کو بھی دیا جاسکتا ہے تمہارے والدین صرف تمہارے بھائی بہنوں کے مستقبل کی خاطر یہ تو تمہیں چار لوگوں کے سامنے اپنے گھر سے رخصت کرنا چاہتے ہیں نا۔ ہمیں بھی تو اپنی آنے والی نسل کی فکر کرنی چاہیے ورنہ.....“

”ورنہ؟“ وہ چلنے لگا اسے دیکھتا رہا پھر اس نے یہ شعر پڑھا۔

”مناج کے قاضی کا فتویٰ ہے یہ ازل سے

لحون کے خطائی کی صدیوں سے سزا پاتی“

تقسیم اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اس کے الفاظ ثریا کے الفاظ کی عکس ارتقعی یا وہ اس سے اپنے جھوگ کو غلطی سمجھ رہا تھا۔

”ہاں یا غلطی ہوگئی۔“ مدثر نے اس کے خیال کی توثیق کی۔

”غلطی؟“ تقسیم نے ابھی ابھی دیکھا ہوں اسے اسے دیکھا۔

”میں انتظار کر لیتا تو اچھا تھا۔“

”کس بات کا انتظار؟“

”تم سے شادی کرنے کے لیے صحیح وقت کا انتظار..... آج یونیورسٹی گیا تو خود کو سٹ فٹ محسوس کر رہا تھا۔ باقی لڑکوں سے الگ تھمک سا..... مجھے کچھ محسوس پرکونی ہو پھر دکھا ہو جیسے دل میں کوئی چرنا کھسا ہو۔“

”انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہونے میں دیر نہیں لگتی تقسیم..... گناہ کا احساس گناہ کا خیال دل میں آتے ہی اٹھتا ہے۔ قائل کوئل کر کے اپنے گناہ کا احساس ہونے میں دیر کب کتنی ہے۔ اس کے بعد تو مکافات مل کر شروع

اٹھتا ہے۔ تم سے اچھے تلو اور بہتر ہیں وہی اسے مکافات مل چکے ہوں۔ ہمارے لیے تلافی کا محفوظ ترین راستہ یہ ہے جو تمہارے گھر والے جا رہے ہیں۔“

وہ جو کورٹ میرج سے پہلے اسے مکمل انکھوں سنہری پننے دکھایا کرتا تھا کورٹ میرج کے بعد دوسرے ہی دن لاش کا اموات اور پچھتاوے کا اظہار کر رہا تھا۔

سالگرہ منید کے سامنے بڑے صوفوں پر الخاف کی بہنوں اور اپنی قریبی رشتے دار عورتوں کے ساتھ بیٹھی بکھوئی تھی انکھوں میں غائب اور الخاف کی بلا میں سے رہی تھیں۔ سووی تیکر دائیں، بائیں، آگے، پیچھے زاویے، ہر رخ سے تقریب کو کر رہا تھا۔ دو نوکرانہ دھڑا دھڑا تصویریں بچھڑے تھے۔ بھی ڈاکس پر بیٹھ دوٹھا دکان کی بھی تقریب میں شریک مہمانوں کی۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ چھوٹے سے گھر میں ایک شاندار تقریب منعقد کی جاسکتی تھی بھلا۔

☆☆☆

”میں مدثر..... کسی قیمت پر نہیں،“ تقسیم نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

یونیورسٹی میں تقدیم سے لے کر مدثر سیدھا نادر کے گھر پہنچا تھا اور اس نے تقسیم کو تقدیم سے ہونے والی ملاقات کا احوال بلا کم و کاست سنا دیا تھا۔

”تمہارے گھر والے چاہتے ہیں کہ تمہیں ایک بار اس گھر سے رخصت کر دیا جائے تاکہ لوگوں کو باتیں نہ لگے۔ تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔“

”میں اب وہاں نہیں جاؤں گی۔“ اس نے کہا۔ کس منہ سے جاتی بھلا۔

”سوچ لو۔“

”کیا سوچ لوں؟ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ سر جھکا کر، بچروں کی طرح جاؤں میں دوبارہ اس گھر میں، نندہ مدثر..... یہی نہیں ہو سکتا۔“

”نہیں میں اپنے گھر تو جاتا ہے نا؟“

”کون سے گھر؟“ وہ چوٹی۔

”میری ڈیڈی کے گھر۔“

”ہاں، وہاں جانے کے لیے تو میں ابھی تیار ہوں تم لے کر جانے والے تو ہو۔“

”دیکھو..... اگر تم اپنے گھر والوں کی بات مان لیتی ہو تو میں بھی کو مجبور کروں گا کہ وہ ڈیڈی کے ساتھ تمہارے گھر جا کر میرے لیے تمہارا رشتہ بنائیں۔ اس طرح منعم اور اس کی بیوی کی زبانیں بھی بند رہیں گی۔“

”تمہارا کیا خیال ہے ایک ہی دن میں رشتہ، نکاح سب کچھ ہو جائے گا؟“

”ہاں یا یہ مسئلہ تو ہے۔“ مدثر جوش میں پڑ گیا پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ”میری کوئیں کا فیصلہ میں لے کر تیار ہوں گا سب کچھ۔“

”سب کچھ کیا؟“

”میں کب ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بچا ہو گیا تھا۔ ہم نے کورٹ میرج کر لی۔ اب صرف تمہیں گھر لانے کے لیے دوبارہ کرنا ہے۔ وہ ڈیڈی کو لے کر تمہارے گھر جائیں، رشتہ بنائیں اور میں کسی بھی بہانے سے خدا

ڈال دوں کہ مجھے تو فوری شادی کرنی ہے۔“

”مشائ..... کیا خدا ڈالو گے؟“

وہ ایک بار پھر جوش میں پڑ گیا۔ پھر جھکی بچا کر بولا۔ ”میں خدا کیوں ڈالوں گی میں سے کیوں نہ کہوں کہ وہ ڈیڈی سے کہیں لڑکی ابھی ہے جس کی بچائی نکاح بڑھا کر ہے گھر لے جاتے ہیں۔“

”فارغا ڈسک مدثر، بچہ جلی بننے کی کوشش نہ کرو۔“ وہ پھر سوچنے لگا اچھا تو پھر یہ کرتا ہوں کہ منعم اور اس کی بیوی کے سامنے میں ہی سے کہتا ہوں مجھے ایک

کناج کے دوسرے ہی دن الطاف تصویریں پہنچانے کے بہانے گھر آگیا۔ ”آئی، نوٹو گرافری دکان سے تصویریں اٹھائیں اور سیدھا یہاں آگیا ہوں۔ میں نے خود بھی دیکھی ہیں ابھی۔“

”تو بیٹا پہلے تم خود دیکھ لیتے بہنوں کو دکھاتے۔“

”پہلے چاب دیکھ لے۔ تو نوٹیشن والی اہم ابھی تیار نہیں تھی۔ کل شام ملے گی تو وہ بھی لے آؤں گا۔ آپ کے گھر میں رشید کر کے میں بہت خوش ہوں۔“

”خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔“

”چاب تو خوش ہے نا؟“

”ہاں..... خوش یوں نہ ہوگی بھلا..... تم نے بہت عزت دی ہم لوگوں کو۔“

”کل چاب کے اسکول سے بھی کوئی آیا تھا یا نہیں؟“

”نہیں بیٹا اس نے ابھی کسی کو نہیں بلایا، ابھی ہے رخصتی پر پوزیشن ہوگا تو بلائیں گے۔ ویسے اطلاع تھی اس کے اسکول میں۔“

اس نے جیب سے والٹ نکالا، ہزار ہزار کے پانچ گرامی کے نوٹ والٹ سے نکال کر امی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”چاب کو دے دیجیے گا اسکول والوں کو کم از کم منہائی تو کھلا دے۔“

”کھلا دے گی بیٹا اس کی کیا ضرورت؟“ اسی اس کے ہاتھ سے پیسے لینے میں متردد ہوئیں۔

”یہ میری خوشی ہے۔“

”میں بتاتی ہوں اے۔“

”تصویریں بھی لے جائیں۔“ امی پیسے اور تصویریں لے کر بیٹھک سے چلی گئیں۔ رباب تصویروں کو دیکھتے ہی چٹائی امی نے چاب کو پیسے دیے اور بولیں۔ ”یہ الطاف نے دیے ہیں کہ تم اپنے اسکول والوں کو منہائی کھلا دینا۔“

”پانچ ہزار“ رباب نے آنکھیں پھاڑیں۔ ”استے پیسوں میں تو پوری دعوت ہو جائے گی۔“

”پیسے لینے کی کیا ضرورت ہے امی۔ اسٹاف کو منہائی میں خود اپنی جیب سے بھی کھلا سکتی ہوں۔“

”میں نے تم سے پہلے خود یہی بات کہی اس سے گمراہی نہ کہنا میری خوشی ہے۔“

”رکھیں، رکھیں۔“ رباب چکی۔

”ہاں اب تو تمہارا شوہر ہے وہ۔ حق ہے تمہارا اس پر کچھ دیتا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں۔“

”ابھی تو آپ دیکھیں گا دینی سے آپ کے لیے کیسے کچھ آتے ہیں۔“ رباب مسکرائی۔

”امی چائے بنے گی یا.....؟“ چاب نے پوچھا۔

”ہائے کیسے خیال ہے؟“ رباب نے شرارتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”پوچھ کر بتاتی ہوں۔ جب تک آپ تصویریں دیکھیں۔“ رباب نے دیکھی ہوئی تصویریں چاب کو تھما دیں۔

چاب اس خیال سے کہ اسے الطاف کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرنے کو اٹھنا ہوگا جلدی جلدی تصویریں دیکھنے لگی۔ حیران کن بات تھی کہ ایک نہیں کی تصویروں میں الطاف آؤٹ آف فوکس دکھائی دیتا تھا اور

ان تصویروں میں اس کا سر اسی طرح غائب تھا جیسے چاب نے استسما کرنے پر خواب میں دیکھا تھا۔

”بیٹا! اگلے ماہ پڑھیں“



## آئینوں کی تپتی بین

عطیہ عمر

میں اور زہرت دو بہنیں تھیں اور ایک بھائی عبداللہ

.... جو ہم دونوں سے چھوٹا تھا۔ اما سرکاری ملازم تھے۔

محمد وداعی لیکن بہت سی قناعت اور اس قناعت کے

صلے میں عطا ہونے والا اطمینان اور سکون! جس کے

باعث ہمارے گھر میں کبھی افراتفری نہیں دیکھی گئی۔

اماں بھی ابا کی طرح تھیں اس لیے دونوں

میں خوب بنتی تھی۔ میں ان دنوں تازہ تازہ کالج میں

آئی تھی کہ بچھو کی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ ملا۔

ہماری اماں کنواری لڑکیوں کے ہر تقریب میں جاتے تھے۔ خلاف ہمیں۔ لیکن یہ قریب رہتے داری کا معاملہ تھا۔ اس لیے ہم سب نے اس شادی میں شرکت کی۔ شہر بانو باجی کی رخصتی کے بعد جب ہم لوگ واپس آئے تو یہ تو ایک خاتون، جنہوں نے خوب پچھلی ساڑی پہنی رکھی تھی اور ڈھیر سا زور دے مجھے بہت پیار کیا۔

پھر ایک شام ان خاتون کو میں نے اپنے گھر میں دیکھا۔ ان کے جانے کے بعد اماں کافی خوش لگ رہی تھیں۔ جانے کون خاتون کھوئی دور کی رشتہ دار ہوں گی۔ میں نے تو پہلی بار دیکھا تھا مگر جلد ہی عقدہ کھل گیا اور جب جان کو تو میں پکا جان بگائی۔

”ایں..... ایسا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا“ اماں، ابا باتیں کر رہے تھے۔ میں بڑا بے میں پڑ رہی تھی کساں کی آواز آئی۔ ”ستے ہیں، شہر بانو کی شادی پر ایک خاتون نے ہمارے گھر آنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا۔ ان کا بیٹا اسی میں ملازمت کرتا ہے۔ ہماری ہی ذات کے ہیں انہی حال ہی وٹنٹس میں ہزار کروڑ کا..... بگلا بنایا ہے۔ انہیں ہماری زہرہ بہت اچھی لگی کہہ رہی تھیں شادی بے شک سال بھر بعد ہو مگنی اچھی کر لیں گے۔ اور اگر آپ لوگ ابھی تیار ہو جائیں تو ہم تو بہت خوش ہوں گے۔ ہم نے کون سا بوسے نو کی کروائی ہے۔ اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔“

”میدہ تیمم ایسا نہ کہتے ہیں کہ پہلا رشتہ اور پہلا کاک اللہ کی نعمت ہوتا ہے۔ معمولی وجود کو برباد بنا کر انکار کرنا فقر ان نعمت کے زمرے میں آتا ہے۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس کی ناشکری سے، غرور، تکبر اور بڑے پولوں سے۔ بے شک ابھی زہرہ کم سن ہے، تعلیم بھی نامکمل ہے لیکن رشتے سے انکار کے لیے یہ کوئی معقول وجہ نہیں۔ دینی میں ملازمت ہونا ہی

کافی نہیں، لڑکے کی تعلیم، عادات، مذہبی رجحان وغیرہ کی معلوم لیں گے۔ ضرورت محسوس ہوئی تو دینی سے بھی تحقیق کر لیں گے۔ آخر بیٹی کی زندگی کا معاملہ ہے لیکن سب سے پہلے تم اور میں استخارہ شروع کرتے ہیں۔ بلکہ پھر زہرہ سے بھی کہو.....“

زہرہ بھائی، ابا کے رشتے کے بھائی کی بیٹی تھیں۔ عمر میں ابا سے دس، بارہ سال چھوٹی تھیں۔ ان کی سرال میں گھر کے قریب بھی تو اکثر آتی رہتیں۔ اس روز بھی ہمارے گھر میں موجود تھیں کہ زہرہ خالہ دینی والے بیٹے کی اماں ہمارے گھر آئیں۔ وہ عائشہ اپنے سوال کا جواب لینے آئی تھیں کیونکہ اماں نے کہا تھا ہم استخارہ کر لیں پھر باتیں گے۔ اس بات کا انہوں نے کچھ برا بھی مانا۔

”میدہ، بین، ساری برادری ہمیں جانتی ہے اور میرا ماجد تو ایسا بکھر و جوان ہے کہ جس جگہ کھڑا ہووے جگہ بار بگ بگے، پھر ہزاروں روپے تو اس کی تجواہ ہے، پڑھ، دو سال کے اندر فیض میں بگلا بن گیا۔ جو کچھ بھی ہے سب آپ کے سامنے ہے۔ پھر آپ نہ جانے کون سی بی بات کر رہی ہیں۔ ہم نے تو یہ بھی نہیں سنا۔“ اماں نے بھجایا۔

”بین، ناراض مت ہوں، خدا خواستہ ہم آپ پر کوئی کنبہ، شہر نہیں کر رہے۔“ مگر آج وہ آئیں تو ادھر، آدھری کا ہاتھ کرتی رہیں۔ صبح تو یہ کہ میں نے بھی استخارے کے نواں پڑھ لیے تھے لیکن ذہن میں ابھی سی تھی۔ اطمینان نہ تھا۔ اماں، ابا نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔ میں نے جانے لاکر کھئی تو زہرہ خالہ بہت تپاک سے مجھے پیار کیا پھر اماں سے زیادہ زہرہ بھائی باتیں کرتی رہیں، پھر ہمارے گھر سے دونوں اکٹھے باہر نکلیں۔ اس کے بعد زہرہ خالہ ہمارے گھر نہ آئیں۔ کچھ عرصے بعد زہرہ خالہ کے بیٹے ماجد کی

شادی زہرہ بھائی کی بیٹی سے ہو گئی۔ اماں نے مجھے بتایا کہ تمہارے ابا کو ایک تو یہ ابھی تھی کہ ابھی تم چھوٹی ہو، تعلیم نامکمل ہے، اس کے باوجود استخارہ کیا لیکن اطمینان نہ ہوا۔ ماجد کے بارے میں معلوم ہوا کہ میٹرک پاس ہے..... اور ٹرک اور ٹریک کا ڈرائیور ہے۔ ہمارا ارادہ انکار کرنے کا تھا کیونکہ تمہارے ابا کے ایک جاننے والے کا بھائی اس کبھی میں ملازمت کر رہا ہے جہاں ماجد کا کرتا ہے۔ اسی نے ماجد کی تعلیم کے بارے میں بتایا جبکہ اس کی اماں نے بی بی ایک تعلیم بتائی تھی تمہارے ابا کا کہنا ہے کہ رشتے لے کر تے وقت رہا بات صاف اور سیدھی بتانے سے اعتبار قائم رہتا ہے۔ جب ابتدا میں ہی جھوٹ بولا جائے تو اعتبار مت کر لے رہا ہے۔

زہرہ بھائی کافی خوب صورت تھیں۔ ان کی بیٹی ورودہ بھی ان کے جیسی بلکہ ان سے بھی بڑھ چڑھ کر تھی۔ مجھ سے تین، چار سال چھوٹی نہ تھی۔ اور ورودہ تقریباً اس کی ہی عمر ہوئی لیکن قد کھانڈ میں اس سے چند سال بڑی تھی۔

ماجد سے میرا رشتہ نہ ہو سکا مگر اماں، ابا بہت مطمئن تھے۔ زہرہ بھائی یا زہرہ خالہ سے کسی قسم کا گلہ یا شکایت نہ تھی۔ بقول ابا کے جہاں اللہ کا حکم ہوگا، وہیں ہوگا۔ اس لیے انے کرنے کے بعد میں یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا سوچ رہی تھی۔ نہایت کال کالج میں تھی اور عبداللہ اسکول میں۔ ہم دونوں نہیں تو گھر میں ہی پڑھ لکھتیں لیکن عبداللہ تعلیمی میدان میں کچھ کمزور تھا۔ اس کے کلاس ٹیچر کے مشورے سے ابا نے اسے ٹیوشن کے لیے بھیجا شروع کر دیا۔ یونیورسٹی میں داخلہ تو نہ لے سکی گھر میں ہی کچھ بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ انہی دنوں دور پرے کے اماں کے بھائی، ماجد ہمارے گھر آنے لگے۔ عارف ان کے بیٹے تھے۔ دہلے، پتلے، قدرے سانولے اور درمیانے قد

کے مالک عارف ایک سرکاری محکمے میں ملازم تھے۔ تعلیم یافتہ تھے لیکن ظاہر ہے عمر اوپر بڑے ان مناسبت سے فی الحال کی اعلیٰ مہدے پر فائز نہ تھے۔ مشترکہ خاندانی نظام کے تحت اپنے چھوٹے سے آبائی مکان میں اپنے والدین اور دو بڑے شادی، شدہ بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے۔

عارف کے والدین اور بھائیوں نے مجھے اور میرے والدین نے عارف کو پسند کیا اور سادگی سے شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ عین نکاح سے کچھ دن قبل اطلاع آئی کہ عبداللہ خاتون میں ہے۔ بات تو پریشانی کی تھی مگر اب ان کا نکاح ملتی نہیں کیا۔ نکاح، رخصتی سے ایک روز پہلے سجدہ میں ہو رہا تھا۔ اس لیے ابا نے اپنی پریشانی اپنے تک رکھی اور نکاح کے بعد پچھا اور ماموں وغیرہ کے ساتھ خاتون کے معلوم ہوا کہ ٹیوشن سینٹر میں عبداللہ کی دوستی چند لڑکوں سے ہوئی۔ جو چھوٹی موٹی چوریوں میں لوٹ تھے۔ تین روز پہلے ان لڑکوں نے عبداللہ کو سہارا کر ایک بڑی چوری کی کوشش کی۔ عبداللہ پہلی بار ان کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ ایک لڑکے کے پڑوسی دوسرے شہر گئے تھے۔ ان لڑکوں نے اس گھر سے زور و غبرہ لوٹنے کا پروگرام کیا تھا۔ ابھی ان لوگوں نے زور، وغیرہ وغیرہ اعلیٰ کی ہی تھی کہ مالک مکان کا بیٹا واپس آ گیا۔ افراتفری میں اسے لڑکے کے ہاں سے لٹا کر چوری کا مال واپس چھوڑ گئے۔ مگر بھاگتے ہوئے ایک لڑکا نظر میں آ گیا۔ خاتون میں رپورٹ درج ہوئی تو تفتیش کے دوران عبداللہ کا نام بھی سامنے آ گیا۔ چونکہ نقصان نہیں ہوا تھا اور پھر مالک مکان ان لڑکوں کا پڑوسی تھا۔ اس لیے ان لڑکوں کے والدین کی منت سماجت سے بچ گیا اور اس نے معاف کر دیا۔ حالات سے یہ سب چھوٹ کر گھر دو کو آ گئے مگر زہرہ بھائی اور ان کے جیسے چند اور عزیز رشتہ





بڑے بھی بہت لائق بخشنے اور سنبھالنے ہوئے  
بچے ہیں اور ماشاء اللہ بچوں ہی نقلیں  
میدان میں نمایاں ہیں۔ ایسہ ہماری بھائی محبت کرنے  
والی، لیتے شاعر خاتون ہے جس نے ہمارا میکا آباد رکھا  
ہے۔

نہت نے کم عمری کے باوجود ازدواجی زندگی  
کے اتار چڑھا بہت طریقے سے سنبھالے۔ شادی  
کے بعد اس کی ساس جو ابھی خاصی صحت مند نہیں ایک  
دم فالج کا شکار ہو گئیں۔ نہت کی اپنی طبیعت ان  
دنوں ٹھیک نہ تھی۔ ماں بننے کا پہلا تجربہ تھا مگر اس نے  
حتی المقدور اپنی ذمے داری نبھائی۔ دونوں چھوٹی  
سندیں، اس کا ساتھ دیتیں مگر ایک کالج اور دوسری  
اسکول میں پڑھتی تھی۔ دن بھر مگر اور ساس کی دیکھ  
بھال ایکلی نہت کی ذمے داری ہوتی۔ تب ہماری  
اماں حیات تھیں اور صحت مند بھی۔ وہ ہر دوسرے  
تیسرے روز نہت کے ہاں جاتیں، کھانا بنادیتیں،  
اس کی ساس کو بھلانے دھلانے میں اس کی مدد کرتیں  
پھر ایوب کے لیے ایک مختصر ملازمہ رکھ لی۔ وہ بہو  
کی حالت دیکھ رہے تھے۔ وہ خود بھی ملازمت کر رہے  
تھے اس لیے پورے گھر کا مالی بوجھ اکیلے ایوب پر نہ  
تھا۔

رفتہ رفتہ دونوں ہندوں کی شادی ہو گئی۔  
نہت نے نہ صرف بھائی بلکہ بڑی بہن اور ماں کا  
کردار ادا کیا۔ اس بات کا اظہار بارہا اس کی بڑی ہند  
نعمینہ نے کیا۔ اپنی اماں کی دیکھ بھال میں وہ بھی  
نہت کا ہاتھ بٹائی تھی لیکن ایک تو اس کی سرال ذرا  
فاسلے پر تھی پھر اس کی ساس کو نعمینہ کا روز روز دیکھ جانا  
پسند بھی نہیں تھا۔

نہت کی شادی کا دسواں سال تھا، اس کی  
ساس کا چاند پہلے انتقال ہوا تھا اور وہ اب تین بچوں  
کی ماں بھی گرا جا چکا ایوب بھائی پر شین کا الزام لگا اور

ان کی جاب ختم ہو گئی۔ حالانکہ انکواری میں یہ بات  
ثابت ہو گئی تھی کہ ایوب بھائی کو چھپانے کی کوشش کی  
گئی ہے تا کہ اصل جرم کو بچایا جاسکے۔ لیکن ایوب جیسے  
ایماندار شخص کے لیے جھوٹے الزام میں نام آنا ہی  
بہت زیادہ ہے غرضی اور شرمندگی کا باعث تھا۔ وہ بہت  
زیادہ پیار ہو گئے اور کسی حد تک نفسیاتی مسائل کا بھی  
شکار ہو گئے۔

یہ حالات نہت اور اس کے سر کے لیے بہت  
زیادہ پریشانی کا باعث تھے۔ اب تو سبھی ریناز ڈ  
تھے۔ صبح پوچی روزمرہ اخراجات کے لیے کافی تھی۔  
نہت نے اجرت پر سلائی شروع کر دی لیکن  
ظاہر ہے اس سے اخراجات پورے ہونا تقریباً ناممکن  
تھے۔ نہت کا زبردستی ایک ایک کر کے کب گیا۔ اس  
روز ایوب بھائی کی طبیعت بہت خراب تھی اور وہ بہت  
بایوسی کی باتیں کر رہے تھے۔

”ہمیشہ نہت اور ایما نداری سے کام لیں صلد  
کیا ما؟ ایک جھوٹا الزام، جگ بھٹائی اور آج بھر سے  
یو پی بنے ڈھنگ کے روٹی پکڑے کو ترس رہے ہیں؟  
میں کیا کروں؟ کھر جاؤں؟“

”تو یہ کریں ایوب، سوچیں، اللہ نے ہم پر کتنی  
کرم نوازیوں کی ہیں۔ ہم میاں، بیوی میں پیار،  
محبت، اعتماد کا یقین دیا۔ اب کے اور میرے  
والدین، بہن بھائیوں بچوں کی تحقیریں دیں اور سب  
سے بڑھ کر ہمیں مسلمان بنایا۔ ایمان کی دولت دی،  
کیوں ناشکری کرتے ہیں؟“

برآمدے میں بیٹھ نہت کے سر کی آنکھوں  
میں آنسو آ گئے اور دل سے دعا نکلی۔ ”اے الہی! میں  
اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے تجھ سے ہی مدد مانگا  
ہوں۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تو ہی ہمارا  
مددگار ہے، ہم تجھ پر بھروسہ کرتے ہیں، تجھے ہی  
پکارتے ہیں۔“

اور پھر انہی پریشانیوں کے دنوں میں ایوب کا  
پرانہ دوست برہان ان سے ملنے آیا۔ وہ کھانا چپا  
کا رو بارہی شخص تھا۔ ایوب کی بے روزگاری اور غم  
کے الزام کے بارے میں چند دن پہلے ہی اسے معلوم  
ہوا تھا۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا۔  
واپس آیا تو یہ اطلاع ملی۔ پہلے تو اس نے ایوب سے  
شکوہ کیا۔ ”سال، ڈیڑھ سال سے تم بے روزگار ہو،  
پیار ہو گئی۔ اپنی رقم سے ملاقات ہو گئی مگر تم نے ذکر نہ  
کیا..... کیا غیر سمجھتے ہو یا قایل بھر دیا نہیں جانتے؟ یہ  
تو ابھی اتفاق سے معلوم ہو گیا اور اب رائے نہ کہیں۔“

”ابھی کوئی بات نہیں، میں نے اپنی پریشانی سے  
دوسروں کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ برہان کہنے  
لگا۔

”تم کیا سمجھتے ہو، تمہاری پیاری، پریشانی ہم  
سے چھپ سکتی ہے اور پھر دوست کا فائدہ کیا اگر مشکل  
میں کام نہ آئے۔ فی الحال تو میرا ایک کام ہے۔ تم  
نفاذ اپنی پیاری بیگم کو کیونکہ مجھے ایک ایماندار اور  
معتقل بندہ چاہیے، نورانی برہانہا ر خیال آیا۔ فیضان  
(برہان کا بھائی) نے بھی تمہارا ذکر کیا تھا لیکن ہم  
دونوں یہ سوچ کر جب ہو گئے کہ تمہاری اپنی جاب  
ہے۔ نہ جانے یہ کام چلے نہ چلے کیونکہ کاروبار میں  
رنگ تو لینا پڑتا ہے اور تم اپنی جاب سے بھی جاؤ لیکن  
اب تو تم فالج ہو، کیا خیال ہے میرے ساتھ کام  
کرو گے؟ میں اور فیضان تو اپنے کاروبار میں بہت  
مصرف ہیں لیکن پر دیکھتے ہماری نظر میں ہے۔ امید  
تو ہے کہ انشاء اللہ فائدہ مند ہو گا لیکن بس یہ سوچ کر  
خاموش تھے کہ ہمارے پاس وقت نہیں اور کسی غیر شخص  
پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اب جب تم یہ کام دیکھو گے تو  
میں کوئی فکر نہیں ہوگی۔“ برہان نے بغیر احسان  
کئے، اس طرح ان کی مدد کی پیشکش کی کہ اب اکی  
اگلوں میں آنسو آ گئے یہ شک وہ رحمن و کریم اس

طرح اپنے بندے کی مدد کرتا ہے کہ وہ سوچ بھی نہیں  
سکتا۔ ایوب کہنے لگا۔  
”مگر کیا مجھے کاروبار کو اپنی تجربہ نہیں، پھر میرے  
پاس ایک ویلانا نہیں تو بغیر پیسے کے کس طرح.....“  
برہان نے اس کی بات کاٹ دی۔  
”تجربہ میرے پاس ہے، برہات میں مشورہ  
دوں گا، مگر ابھی بھی کروں گا اور چہرہ تو ہم دیکھے  
لگاتے کو تیار تھے۔ مسئلہ تو صرف ایک گران کا تھا جو  
تمہاری صورت میں چل رہا ہے۔“  
پھر اللہ نے کرم فرمایا۔ ایوب بھائی کی پیاری کی  
اصل وجہ پریشانی تھی۔ جب اللہ نے پریشانی دور  
فرمائی تو صحت بھی مل گئی۔ ایوب بھائی نے نعمت کی،  
اللہ نے مدد فرمائی اور کام ابھی طرح چلے گا۔ ایوب  
بھائی کے ابا نے مشورہ دیا کہ اپنا گھر کچھ کر یہ سرمایہ  
کاروبار میں لگا دو۔ اگرچہ پہلے بھی برہان بھائی انہیں  
اچھا خاصا منافع دے رہے تھے یہ کہہ کر سرمایہ ہمارا  
اور نہت تمہاری۔  
یوں رفتہ رفتہ مشکلات کم ہوتی گئیں۔ اور اللہ  
نے آسانیاں زیادہ کر دیں۔ اللہ نے ایوب بھائی کے  
کاروبار میں اچھی برکت دی کہ بچوں کی تعلیم، مگر کی  
تعمیر، سب کام ہوتے گئے۔ آج زربہ بھائی نے  
جب میرے سامنے رنگ اور کی قدر و حرمت سے  
وردہ اور نہت کا مقابلہ کیا تو مجھے کڑوا وقت یاد آنے  
لگا۔ میں نہت، عبد اللہ، گئے دنوں میں انہیں کتر  
گلتے تھے۔ ہمارے منہ پر بھی ہمارا مذاق اڑانے سے  
باز نہ آتی تھیں۔ آج ہمیں رنگ سے دیکھ رہی ہیں  
اور خود کو کتر اور بے چارہ سمجھ رہی ہیں تو میرا دل چاہتا  
ہے انہیں سمجھاؤں کہ دوسروں سے حد کر کے والا خود  
کبھی خوش اور مطمئن نہیں رہتا مگر میں سوچ رہی ہوں  
کہ انہیں کس طرح سمجھاؤں کہ بعض لوگوں کو سمجھانا  
واقعی مشکل ہوتا ہے۔ ہے ناں؟



تم ناحق گلوے جن چن چن کر  
دامن میں چپائے بیٹھے ہو  
شیشوں کا سیخا کوئی نہیں  
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

اس ناول میں شیشوں سے مراد صنم نازک ہی ہے کہ جس کے ساتھ مرد نے کبھی بھی اور کسی بھی دور میں ایسا سلوک روا نہیں رکھا، جیسا کہ رکھا جانا چاہیے تھا۔ تخلیق کائنات سے لے کر اب تک مرد اور عورت کے مابین نت نئے رشتے قائم ہوتے رہے ہیں، یہ رشتے جو محبت اور احترام کے متقاضی بھی ہوتے ہیں، کبھی انہیں یہ محبت اور احترام میسر آتا ہے اور کبھی نہیں... ان دونوں کے مابین ایک ازلی رشتہ ہوس کا ہے، عورت ہمیشہ مرد کا پسندیدہ شکار رہی ہے اور رہے گی۔ عورت کا احترام عموماً مرد نے جن رشتوں میں کیا ہے وہ ماں، بہن یا بیٹی ہیں... بیوی کم کم ہی احترام کی حقدار نہہرتی ہے، وہاں بھی جہاں محبت کے بلندو بانگ دعوے کیے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے بہت سی ایسی صورت حال بھی آجاتی ہیں، جب عورت کا احترام بالکل ہی نہیں کیا جاتا، خواہ وہ ماں ہو، بہن یا بیٹی... مرد پر جب غصہ سوار ہو یا اس کی انا اور ضد کا معاملہ ہو تو سبھی رشتے ناتے ہیں پشت ڈال دیتا ہے۔ غصہ مرد کے دماغ پر حکمرانی کرتا ہے تو وہ عورت کو اپنی چنگیوں میں مسل کر اپنی مردانہ حس کی تسکین کرتا ہے۔

شیریں حیدر

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں





سکھانے اپنی بیوی کو نظردیکھ کر پچھتاہمی نہ تھا۔ اسے لگدھو ہو جاتی تھی، تار تار لباس، نچا ہوا بدن، چہرے پر خراشیں، لوہانہ..... اسے یہی اندازہ ہوا کہ وہ زندہ نہ رہی، مگر اس کے تحفے سے وہود سے ایک کراہ بڑھ جاتی تو اس سے لپٹ کر سکھان اور کی د باؤں مارنے لگی۔ اس کی پیچیں سن کر اڑوس پڑوس کے لوگ جمع ہو گئے اور اس کی حالت دیکھ کر سکھان سے ہمدردی کرنے لگے۔

کوئی بھاگ کر کسی کہاؤد گولیا یا اس نے اس کے زخموں کو صاف کر کے ان پر مرہم بنی کی اور بتایا کہ اسے زہد کی بڑے قصبے کے اسپتال میں لے جانا پڑے گا۔ تاکہ تانگ کر پیڑھجی میں کیا اور اسے لے کر وہ اسپتال روانہ ہوئے۔ مدت ساجت کر کے، اللہ اور رسول کے واسطے دیئے گئے، ڈاکٹر کی اس کی بگڑی ہوئی صورت حال دیکھ رہا تھا، کچھ لوگوں کے مجبور کرنے پر بغیر رپورٹ درج کروائے اس کا علاج شروع کر دیا گیا۔ پچھو ضائع ہو گیا تھا، جسم پر تشدد کے آثار جابر زیادہ تھے، لیکن ایک اسے خود کی میں ہی رکھا گیا تھا کیونکہ صرف جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بہت متاثر ہو چکی وہ.....

اس کے بھپوں کے کل نوٹ کر چکی کر چکی ہو گئے تھے، اسے تو معلوم ہی نہ تھا کہ کو توں کی طرح اسے بھینچوڑ رہے تھے، اس کی تبدیلی کر رہے تھے، اسے نوح کھوٹ رہے تھے۔ ان سب سے عاری ہو گئی تھی وہ..... اسے فقط وہ الفاظ ذہن کے ایوانوں میں گونج کر گھر میں چلتا رہے تھے جو اس کے دل پر تار مچوب نہ تھے کہے۔ اس نے کہا تھا..... کہ وہ جانے کا کچھ نہ پوچھا اور اسے اس کے سر پر زہر کی سی، اس نے کہا تھا کہ جسے چاہو اس سے کیا پ بنالو..... کیونکہ وہ پچاس کا ہو ہی نہیں سکتا..... اس نے اسے بدکار کیا تھا، ہوا پر اڑام لگایا تھا کہ اس کے جانے کس کس سے تعلقات ہیں۔ وہ تو اندر تک نوٹ کی تھی، مگر کئی تھی، اس نے ہر کسی کی بھینچوں کو فراموش کر دیا تھا، ماں کی، بگلی کی، شش کی..... وہ سب راہ پر چل نکلی تھی اس پر اسے پھول ہی پھول نظر آتے تھے اور یہ سب لوگ کہتے تھے کہ وہ کاخوں کی راہ پر چل رہی ہے۔

واہی قسمت..... کیا میل کھلاتے تو نہ محبت کی ماری کے ساتھ! وہ اپنے ہوش و دواس کو بیٹھی تھی۔

☆☆☆

جانے کیوں نکاح کے بندھن میں بندھنے کے بعد قائم علی کے ضمیر پر بوجھ سار گیا تھا، تنہائی میں وہ سوچتا تو اسے معراج کا قصور بھی اتنا نظر نہ آتا، جتنی اسے سزا قائم علی نے دے دی تھی۔

اس کے دل میں ابھی تک معراج کے لیے محبت کا سمندر فغاہیں مارتا تھا، اسے اس کی ہنسی، اس کی باتیں، اس کا انداز بار بار یاد آتا..... "کاش وہ مجھے سے طلاق کا مطالبہ نہ کرتی! میں اسے منا کر لے آتا، میں اس سے معافی مانگ لیتا۔ مگر وقت کا یہاں ہمیشہ آگے کی طرف دھرتا ہے، ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم اس سے ہمارے کار کا موز کر واپس لے سکیں میں چلے جائیں۔ اگر ممکن ہوتا تو میں اس وقت کو واپس لے آتا جس دن میں شہر کیا تھا، یہاں شہر جاتا، نہ معراج کا کسی اور جگہ..... اور ہماری بیٹیاں ہماری پاس ہی ہوتیں....."

ماتہ کاے کاخوں کا کوئی سراغ نہ ملتا تھا کوئی اور آتا، اور اس کی موت جیسی بھی عیا کی کسی مگر اس پر اب اسے صبر آ گیا تھا کیونکہ معلوم تھا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں..... نہیں صبر آتا تھا تو ماہ پارہ اور حسن آرا کی کشدگی نہیں آتا تھا۔ اگر اسے اس کا دکھ تھا تو کیا معراج کو نہیں.....

"میں نے اس کے ساتھ کیا رہا کیا! وہ سوچتا اور مزید پریشانی میں مبتلا ہوتا جاتا..... ہم اٹھے اس دکھ کو جو گئے تو اس کی شدت نکلی کہ ہوتی..... میں نے اپنے لیے مشکل راہ کا انتخاب کیا اور اسے بھی آ زماش میں ڈال دیا۔ وہ تو اس آ زماش میں پوری آزی کر کتنے برس سے اس نے آج تک نہیں بھری اور میں..... میں کیا کمزور لگا کر اپنے نفس کے ہاتھوں کس دلہل میں آ کر گیا..... اب میرے لیے کوئی آ زماش بیشتر ہے، بیٹا ہو گیا یا بیٹی! میری بیٹی اس کو کھٹے

کی زینت ہے کی؟ چٹا ہوا تو دھجھل جاتے گا..... مگر میں اس کو کیے پاؤں گا؟ کیا معراج لوٹ آئے کو تیار ہو جائے گی اور اس بیٹے کو پالنے کی ذستہ داری قبول کر لے گی؟ کیا وہ میری دوسری شادی کا سن کر بھی لوٹ آئے گی؟ اب تو رات ج بھی سمجھا رہے، وہ اس سارے قصے کو جان کر کس توکل کا اظہار کرے گی؟ اسے ماں سے جدا کر کے میں نے اس پر اور اس کی ماں، دو بول پر ظلم کیا..... مجھے معاف کر دے میرے مولا!..... وہ چکوں پہلوں روئے لگا..... مجھ پر میری استطاعت سے بڑھ کر آ زماش نہ ڈالنا! معراج کے دل میں میرے لیے نری پیدا کر دے، میرا لڑا ہوا اور کھڑے سے جاتے..... اور..... میرے مولا..... الماس سے مجھے بھی نہ دینا..... میں اپنی بیٹیوں کی پیدایش پر بھی نالاں نہ تھا تو جاسا ہے! میں تو اس بات پر خوش تھا کہ میرے بیٹے کو بھی تو نے بیٹیاں دیں اور مجھ کا پیڑ کا بھی! میرا اسی کوگی اس قابل جانا کہ میں ان بیٹیوں کی پرورش کر کے، ان کے فرض سے قاصر ہو کر، روڈ قیامت اپنے بیٹے کی قربت پاتا، مگر میرے نصیب ایسے نہ تھے۔ شاید میرے لیے یہ آ زماش بھی اور میں اس میں صبر کا مظاہرہ نہ کر سکا..... مجھے معاف کر دے اللہ! اور میری بیٹیاں اگر زندہ ہیں تو انہیں کی نیک کی پناہ رکھنا، ہماری آ زماش کو طویل نہ کرنا اور ان میں ان سے جلد ملا دینا!" درود کر اس کی ڈاڑھی بھیک مٹی تھی، اس نے اٹھ کر رضویا اور صلے پر کھڑا ہو گیا، اسے یہی معلوم نہ تھا کہ وہ کس وقت کی نماز پڑھنے لگا تھا۔

☆☆☆

"زور تاج بائی کس چیز کا امتحان دینے ہیں شرمایا بی؟" اس نے پوچھا، ہاتھ اس کے لیے سے عیاں تھی۔ "اس کے ہاتھوں جماعت کے دو پرچے رہ گئے تھے، چھپلی باراس کی تیار کی تھی اور پھر باہر سے اس کے مامے بھی آ کرے ہیں بچوں کی چھٹیوں میں، اس لیے وہ پچھون اور رہے کی وہاں!" معراج بی بی نے وضاحت سے بتایا۔ "تو تاباں کے کیا محسوس کر رہی ہے؟"

"بہتر ہو مامی....." اس نے کراہی سی آواز نکالی۔

"اس کم بخت نے تو کوئی کر نہیں چھوڑی مگر مارنے والے سے بچانے والی ذات بڑی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس بچے کی حفاظت کی ہے جو تمہاری کوکھ میں رہا ہے....."

"مگر میرے پورے جسم میں بہت درد ہے..... وہ آ زماشیں، میرا پوچھے؟" اس نے پوچھا۔

"بڑا ہو گا نہیں فکر کے....." معراج نے غصے سے کہا۔

"میں کب تک اٹھ کر اپنے کھر جانے کے قابل ہو جاؤ گی؟"

"دکھو..... تیرے کھر کو مامے آلا لگا کر چانی مجھے دے گئے ہیں اور اسے انہوں نے دیکھے دے کھر سے ڈال دیا ہے!"

"مگر وہ کہاں جانے گا، کہاں موئے گا کہاں سے روٹی کھائے گا؟" اس نے پریشانی سے پوچھا۔

"وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ تو اس کے لیے پریشان ہو....." معراج نے کہا۔ "میں نے تیری بھلائی کے لیے کچھ سوچا ہے..... تو کھجک ہو جا مگر تاؤں کی اور اب میں تجھے اس وقت تک تیرے کھر نہیں جانے دوں گی، جب تک اسے اپنی زیادتی کا احساس نہ ہو اور وہاں کہ گزر کر تجھ سے معافی نہ مانگے آئے....."

"ایسا نہ تو میں نہیں آئے والا، سارا..... مجھے واپس جانا ہی ہوگا، وہ جیسا بھی ہے..... میرا شوہر تو ہے اور میں اس کا مال نہ رکھوں گی تو اللہ کو کیا نہ دکھاؤں گی؟"

"لعنت اپنے شوہر پر..... جانے تیرے ماں باپ کے کس کناہ کے سرا کے طور پر یہ تیرے پلے پڑ گیا ہے، تیری ماں سے میرا بڑا رقا اور اس نے مجھے تکلیف ہوئی ہے جب میں تجھے تکلیف میں دیکھی ہوں، تجھے دیکھ کر مجھے میری آواز یاد آ جاتی ہے....." معراج کی آنکھیں بھرا آئیں۔

سالگرہ نمبر ”کہاں ہے ماہ تاج اب؟“ کلثوم نے پوچھا۔  
”دوسری ہی تھی۔“

”کیسے؟“ حیرت سے اس نے پوچھا۔  
”اسے کسے قتل کر دیا تھا۔“ معراج نے سنبھل کر کہا۔ ”سات برس کی تھی کہ وہ اب ہوئی تو تیرے معنی ہوتی؟“  
”اس لیے چاری سے کسی کی کیا دشمنی تھی جو اسے قتل کر دیا؟“ حیرت سے کلثوم نے پوچھا۔  
”لڑکی کا لڑائی ہوتا۔۔۔۔۔ اس کا گھر وہ بونا مردوں کو اس کا دشمن بنا دیتا ہے۔“ معراج نے بی بی نے کہا، جسے کلثوم کچھ نہ سمجھتی تھی۔

”اوہو۔۔۔۔۔ بڑا دکھ ہوا سن کر۔۔۔۔۔ آپ مجھے اپنی بیٹی بھی سمجھیں ماما“ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”میرا بھی اس دنیا میں ہے کون!“

”تو میری بیٹی ہی تو ہے، اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اب تو یہاں سے اس وقت تک نہیں جا سکتی جب تک میں نہ کیوں۔“  
”مگر میں یہاں کیا کروں گی، کیسے کر سکتی ہوں اور کتنا عرصہ۔۔۔۔۔“

”میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے کلثوم۔“ معراج نے کہا۔ ”اب جلد ہی رات جگ کی شادی ہو جائے گی، اسے میں نے کھانا دیا ہے اور کچھ دیکھ رہی ہے۔ اسے بڑے طور پر اس نے کوئی کیس نہیں کیا مگر اس کی مدد میرے کام کو آسان کر دیتی ہے۔ مجھے تو اس عداوت ہے کہ وہ اپنے طور پر کیس لے سکتی ہے مگر وہ ڈاکٹر بنی ہے۔“

”چلیں جب ان کے سر پر بڑے کی وہ وہ ڈوٹی شروع کر دیں گی۔“ کلثوم نے کہا۔  
”کلثوم! تو کتنی جانتی ہو یہی ہے بیٹا۔“

”ماما میں تو صرف پانچویں تک ہی پڑھ سکی ہوں۔۔۔۔۔ اس کے انداز میں شرمندگی تھی۔“ لالے کو میرا گھر سے باہر چاہنا پسند تھا!“

”میرا باہر جانا اسے کیوں ٹھکاتا تھا، خود وہ۔۔۔۔۔ باہر منہ بنا رہتا تھا اور تیری زندگی کو عذاب بنا گیا اور تیری ماں کو بھی اسی کی حرمیں لے ڈھیں۔ وہ غریب تو اپنی زندگی کی بازی ہار گئی اور سرائیں ساری تیرے لیے رہ گئیں۔“

”اس کا شادی ہی وقت تھا جانے کا۔۔۔۔۔ مگر میرے لیے واقعی جانے ہی کیوں قسمت میں لکھا تھا، میں نے کیا گناہ کیا تھا؟“ وہ رونے کی معراج نے اسے ساتھ کر کے لڑکی کا اور اس کے آسوپہ لپچے۔

”بس میں نے سوچا ہے کہ تجھے بول سے ہی کی زندگی نہ گزارنے دوں گی، میں تجھے اپنا کام سکھاؤں گی اور شہر سے نکالیں لاؤں گی تاکہ تو کچھ آگے پڑھ سکے، رات جگ تجھے پڑھانے کی اور میں ڈوٹی کی!“

”آپ پڑھ لکھی ہیں ماما؟“ حیرت سے اس نے سوال کیا۔  
”ہاں۔۔۔۔۔ کچھ پڑھا ہی تھا اور دیکھتے وقتوں میں!“

”تو کتنی جانتی ہیں پڑھیں آپ نے؟“  
”کبھی تو نہیں۔“ معراج نے ہنس کر بات ٹالی۔

”اس کا مطلب ہے کہ بہت سی جانتیں پڑھیں ہیں آپ نے!“ وہ بھی بہت دن کے بعد کھلکھلا کر ہنسی تھی۔  
”تو مجھے بہت سارے ہتھیارے ہیں کلثوم۔ اور بہت کچھ دیکھ سکتی ہے، سمجھنے کے لیے عری کوئی نہیں ہوتی۔“

”پر اب تو مجھے کھانے دین ماما!“  
”کیوں تو اپنے بچے کے پیچھے ہاتھ دوڑھو کر پڑھتی ہے؟“ معراج نے اسے ڈانٹا۔ ”چنگی پڑی رہ اور اب تو بے اس کا

نام اپنا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا!“ ڈانٹ سن کر کلثوم ہم گئی۔

☆☆☆

## شہینوش کا مسیحا کوٹھنی

”آپا۔۔۔۔۔ دو ایک دن کے لیے اگر آپ کو رحمت نہ تو جس کی کام سے کہیں جانا چاہ رہا تھا، بسا کو ساتھ نہ لے جا سکیں گا۔“ شکار نے سبکی سے بات کی۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنی بیویوں سے مل کر آئے اور ان کی کوئی بات نہ۔۔۔۔۔ بھی کر آئے گا، مگر سبکی کو یہ بتا کر اپنی بیویوں سے ملنے جا رہا ہے تو وہ یہ سوچتی کہ اس بچی کو لے کر وہ اپنی بیویوں کے پاس کیوں نہیں گیا۔ بہت سے سوالوں سے بچنے کا یہی طریقہ تھا جو اس نے اختیار کیا تھا۔

”کب تک لوٹ آئیں گے؟“ سبکی نے پوچھا تھا۔  
”جتنا جلد ہو سکے۔۔۔۔۔ کچھ تو سیرا کی وجہ سے اور کچھ اپنے کام کی وجہ سے بہت دن کے لیے جا ہی نہیں سکتا۔“ اس نے کہا۔

”میں کوئی ہتھیار نہیں چلندی۔۔۔۔۔ اب آپ اپنا گھر سائیں، اگر گاؤں جا رہے ہیں تو اپنی شادی کا دن غمگین کر کے ہی لوں، ابھی تو سیرا بھی ہے اور اس کے لیے میرا عورت کو ماں کے روپ میں ڈول کرنا آسان ہو گا، جوں جو بی بی ہوتی جائے گی تو سن لوں، بھھار ہوگی اور اسے رشتوں کی بھجھ بھجھ ہو جائے گی۔ اس کے لیے جب تک اس اور سونیلی کا منہ بوم بھستا آسان ہو جائے گا تو۔۔۔۔۔“

”میں خود بھی ان باتوں کو سمجھتا ہوں آپ اور جلد ہی کوئی فیصلہ کروں گا گاؤں جاؤں گا تو آپ میرے ساتھ ہی جائیں گی، میرا گاؤں بھی دیکھ لیں گی اور باقی کام تو ہوں گے ہی!“ اس نے مسکرا کر کہا تھا مگر سبکی کو اس کے چہرے پر شرم کا لال رنگ پھیلنا نظر آ رہا تھا، بھلا میرا شرماتے ہیں، اس نے سن رہا تھا۔

☆☆☆

”ہاں تو پروردگار صاحب۔۔۔۔۔“ گلاس ٹرے میں رکھے ہوئے جاوید نے پوچھا۔ ”کیا کام کرتے ہیں آپ؟“  
”ہر کام کر لیتا ہوں جاوید صاحب۔۔۔۔۔ زیادہ خوشی تو مجھے آپ جیسے دوستوں کی خدمت کر کے ہوتی ہے!“ اس کی آواز معتدل تھی کیونکہ چنانچہ اس کا روز کا معمول تھا جبکہ جاوید جیسے لوگ جو بھی کمزور اور چھپ چھپا کر پیتے ہیں، انہیں دوست بن لگاتے ہیں۔

”سارے جاوید سے کہا تھا کہ وہ بی۔ کے کے بارے میں جانچ پڑتال کرے اور اس جانچ پڑتال کے عمل میں دو سال ملا تو سن میں ہی پڑوڑ جان گیا تھا کہ جاوید کی کھیت کی موتی ہے۔ اسے اسی کے مزاج کے مطابق خراب و شایب کے دو جلوسے لکھا ہے کہ وہ اس کا مرید ہو گیا تھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ سارے نے اسے کیا ڈتے داری تو فیصلہ ہی کی اور اس کے نظر سے پڑوڑ کر جانا تھا، مریم۔۔۔۔۔ جسے اس نے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹی کہا تھا، اس کے ساتھ شادی کے لائق وہ تھا کہ نہیں؟ مگر اس نے اپنے شوخ اور ہنسنے میں انصاف سے کچھ نہ جانچا، اسے پڑوڑ رہا نظر نہ آچکا تھا۔ خود جو ان قضا کو مارتا تھا۔۔۔۔۔ کمانی کا زور یہ کیا تھا؟ یہ تو وہ پوچھتا جو مریم کا گھر ہوتا۔ وہ مریم کو خوش رکھے گا اور اس سے بے وفائی تو نہیں کرے گا؟ اس کی فکر تو ہوتی جس کا مریم سے کوئی رشتہ ہوتا۔۔۔۔۔ خوشی یا غلاظی۔“

اور یوں ایک مریم قربان ہو گئی۔ ایک لالچی آدمی کے ٹھکانا جانتی کی نذر کر دی گئی، وہ جو اسے زیر کرنا چاہتا تھا، اسے ہریت پر حاصل کر لے جاتا تھا۔ اسے تو شادی سے کوئی غرض نہ تھی، فقط چار دن اس سے تعلق رکھتا اور پھر اس کا روزی کا مقاصد کے لیے استعمال کرتا مگر اسے علم ہو گیا تھا کہ وہ شادی کے بے گناہ حاصل ہونے والی ”بچہ“ تھی۔

سارے مطمئن تھیں مریم کے لیے، یہ صرف جاوید نے انہیں سب اچھا کی رپورٹ دی تھی بلکہ مریم بھی اس سے ملاقات کے بعد کسی شک و شبہ میں مبتلا نہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب سارے اور جاوید کے مابین تعلقات بالکل ٹھیک تھے، اس وقت تک سارے کو علم نہ تھا کہ جاوید کی کن کن عری عادات میں مبتلا تھا۔ مگر اور باہر کی ڈتے داریاں وہ دونوں ل بابت کر پاتے تھے اور زندگی بھر ان کے انداز میں گزر رہی تھی۔

سادگی سے شادی ہوئی مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ تاریاں تو کی جانی تھیں، جو کہ خفیہ طریقے سے کی جاتی تھیں۔





سب سے برا حال تو رابعہ کا تھا، جس کے لاڈ اٹھانے والے بابا کا قتل..... اسے غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

[illegible]

”میں نے نہیں کیا جانا۔“ وہ ٹھانہتے ہوئے، مزاح کہتا تھا اس نے مضبوطی سے تمام رکھا تھا۔  
 ”مجھ پر یہ کیا۔۔۔“ مزاح نے اس کا پسینہ میں ہیکلہا بچے دونوں ہاتھوں میں تمام کیا۔ ”محبیب ہو  
 جائے گا، مجھ پر دباؤ نہیں جائے گا۔“  
 ”جہانگیر کو بلا لیں ماسی۔“ وہ کراہی۔ ”مجھے مت بھیجیں۔۔۔ اس طرح!“ وہ مزاح کے سامنے یہ کہتے کہتے  
 لڑکھی، مزاح کے ساتھ۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا میری بچی، میں ہوں نا تمہارے ساتھ.....“ اسے ایسی کی ٹیلی دلا سے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اپنے استراحت خانے کے آسودے میں بہاری تھی۔ مگر گاڑی چل پڑی تھی..... اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے قتل کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔

”میں مر جاؤں گی ماما“..... اس نے ہولے سے فریاد کی، ڈرائیور کے سامنے بیچ بھی نہیں سکتی تھی، خاندان کی عزت اور بھرم اسے سب سے زیادہ عزیز تھا۔

”اللہ سے خیر مانگو میری بچی، یوں اس طرح کی باتیں نہیں کرتے.....“ معراج نے کہا۔ ”درد و شریف پڑھو دل

فدا میں.....“ وہ اس کی گریہ پر انہوں نے مساج کرنے لگی، رابہ پر غمخوئی میں چاری تھی۔  
 پہلی نشست پر بیٹھا خجائ..... اس وقت تصویر جس پر وہ بیٹھا ہے اس سے کئی غرض سے کسی کی کچھلی نشست پر  
 کن بیٹھا ہے اور کون..... اس وقت وہ قسط دہ سو فیہ پر تھا کہ کس طرح چوری پیچھے وہیں گاؤں جا کر وہ اپنے باپ کے  
 کے کا بدلہ لے گا۔ جیسے جیسے اس کے دل میں تھی، انتقام اس کے آگے صرف اس کے طور میں بھڑک رہی کی کیونکہ  
 کے طور میں لے گا تو کون سا بیٹھا تھا۔

☆☆☆

”میں ایک بار معراج سے ملنا چاہتا ہوں.....“ زرتاج کو چھوڑنے آیا تو قائم علی نے نعیم سے التماس کی۔

”میں اس سے پوچھ کر بتاؤں گا.....“ نعیم نے مختصر اُکھا تھا۔ اگرچہ اس کے دل میں قائم علی کے لیے بڑی ناراضی

”صرف لو جھٹا نہیں..... میری سفارش کرنا ہوگی تمہیں!“ اس نے زور دے کر کہا۔

”اس کی زندگی کو سزا میں تم نے تبدیل کیا اور اب بھی چاہتے ہو کہ لچک اس کی طرف سے ہو؟“

ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء 109

**سالگرہ نمبر** "وہ کبھی اس شادی پر آمادہ نہ ہوتا تھا جو اپنی آنکھوں سے طلاق نامہ نہ دیکھ لیتے اور اس پر مستزاد ہنگامی طور پر ہونے والی شادی کے شادیانوں کی آوازیں اپنے کانوں سے سن سکتی تھیں۔ اس کی بربادی کسی کی شادی کے جشن کے طور پر منائی جا رہی تھی۔"

جلدی میں پیش بنی کے طور پر اس کے خاندان کے بزرگوں نے اچھی سی بات چیت طے کی اور اس کی اور بڑا کی شادیاں ایک ہی دن ہو گئیں۔ شادی سے قبل اسے علم ہو چکا تھا کہ وہ سلطان سے محبت اور ایثار کے حقدار تھی مگر یہی شان راز اس کے خونگھور دکھاتا تھا کہ یہ کیا سیاست سب کو علم تھا کہ اس کا اور سلطان کا بندھن صرف نیکوئی کا تھا۔ علم میں یہی بات لا کر وہ اپنے مستقبل پر اسے نہیں بچا سکتی تھی اور اس نے اپنی ساری زندگی طہر کے ساتھ غلو سے گزاری، اس طرح کرم کیمر کی ذرا لٹ اور فتن پیدا ہوئے جس کی کوئی فکر میں چلا نہ کیا کہ وہ اپنی طہر کی تھیں۔

[illegible]

ہوا؟“ اس کا سوال منطقی تھا۔

”جب سرگرم جوان ہوئی تو اسے اپنے مذہب کے بجائے اسلام کی محبت میں جلا دیکھ کر کسی کو اعزاز نہ ہوا کہ اس کے خون میں اس قدر ہمت تھی کہ اور وہ بھی چاہے اسے اسلام مذہب سے دور نہ رکھ سکے۔ اس لیے اس نے اسے خود سے دور بھی کر دیا اور ارادہ کیا جہاں سینا آئی اور ڈیڑھ اٹکل کے پاس اس کے آواز ماحول سے نہ جواسے صیانت کی طرف راغب رکھے گا شہر بچ کر گیا انہوں نے میرے لیے آسانی پیدا کر دی تھی۔ یہاں آکر میں نے قاعدہ اسلام قبول کر لیا اور چوری پچھپائی عبادت کرنی رہی۔ اس کے بعد میں نے اپنی ماں کو اپنے قبول اسلام کے بارے میں بتایا تو جب اس نے مجھے بتایا کہ میری رگوں میں ایک مسلمان باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ اس کے بعد میری کوششیں بھی کتنی کی چھا آ دیں لی جاتے۔۔۔۔۔ تو میں اس سے شادی کر لوں، اس سے مل کر میری شادی کسی عیسائی سے نہ طر کی جائے۔۔۔۔۔“

”تو تمہارے خیال میں میں ایک اچھا آدمی ہوں؟“ وہ زربل مسکرایا۔ ”سرمہ اچھا آدمی ہے۔ کہ اوپر لیتے ہیں۔“

”صرف وہ جو مجھے چاہتا ہو اور میرے ساتھ ہر مشکل میں نہا کر سکے..... زمانے کے خلاف میرا جانتا ہے؟“

”مگر“، خصوصاً جو مشکلات اس سے شادی کرنے کے نتیجے میں درپیش ہوں گی!“ اس نے سادگی سے اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔

”مکمل ہے کہ تم مجھ سے زیادہ توقعات وابستہ کر بیٹھی ہو، میں وہ نہ ہوں جو دکھائی دیتا ہوں.....“ اس نے سوال

”مجھے کیا کرنا ہے؟“

بھئی نے پاس میں زیادہ دیر نہ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا.....“ اس نے فوراً کہا۔ ”بس اسے میرا.....“

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں صرف میری محبت کی ضرورت ہے؟“ اس نے زم زمہ کا آؤنگھوٹ مٹا کر نکھنر دیا۔

چھاتا اور وہ بے طرح شرما گئی تھی۔

☆☆☆

چوہدری مراد علی کاٹل ..... اور وہ بھی اپنے بھتیجے کے ہاتھوں، بلاشبہ مراد نگر کے علاوہ ارد گرد کے دیہات کے

108 ماہنامہ پاکیزہ: اپریل 2012ء

”آپ نے بھی تو نفیسات ہی پڑی ہے نا؟“ کرن درود بدو رہا۔  
 ”میں نے خود پر حاوی نہیں ہونے دو نفیسات کو، اسے بڑھا دو راز رہتا عیا عاش کا، جبکہ تم..... تم کچھ زیادہ ہی اور اٹھتی ہوگی، سید کی بات میں بھی کنی نہ کوئی نکتہ اپنا نکال سکتی ہو گا کہ پریشان ہو جاتا ہے۔“  
 ”نہیں نہیں..... آپ اتنی جلدی غصے میں کیوں آگئی ہیں، میں نے اپنا خیال غا کر کیا ہے اور آپ بد بنائی ہو گئیں، اس میں اتنا تشوید و غم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟“  
 ”ج تو یہ ہے کہ میں کبھی بہت اچھا لاکا لگا ہے اور میں نے سوچا ہے کہ میں نیا کو اچھی طرح جانتی ہوں، کہیں اہل فرید میں نکل کر رشہ کرنے سے، بہتر ہے کہ میں ایک نئی کارشتہ نہیں سے کروں.....“ ٹھونڈے سنجیدگی سے کہا۔  
 ”تم بڑی وہ تو میری سوچ پیچھے ہار ہی طرف ہی آ اور میں نے تم سے کہا کہ اس سے دوستی بڑھاؤ، اگر نہیں میرے انتخاب پر اعتراض ہے تو حل کر کہ دو، میں تو دل کے لیے.....“ وہ رکیں۔ ”حقیقت یہ ہے کہ میں سبیل کو کھنچتا ہوں جی“

☆☆☆

”کیا.....“ حیرت سے جہانگیر نے جیسے حج کر پوچھا۔  
 ”جی سرکار.....“ فیضی نے سر جھکا کر کہا۔ ”حقیقت یہی ہے“  
 ”مگر کیوں، کیوں کر رہے ہیں لوگ ایسا؟“ اس کے کھٹے لبس سے یقینی تھی۔  
 ”سرکار..... سب ڈرتے ہیں ان سے، ان کے خلاف کو ایی دینے سے!“ فیضی نے کہا۔ ”اور پھر چھوٹے ہمدردی صاحب کا لوگوں کو ڈر ہے، ان کے شہر طرے جانے سے انہیں احساس ہو رہا ہے کہ اگر وہ کو ایی دین کے تو ہمدردی سے روٹی اور ان کے بیٹے ان کا بیٹا حرام کر دیں گے اور آپ تو ان کا بچہ نہیں بگاڑ سکتے، آپ میں شرافت ایک ایسی کو پی ہے جو اچھے اچھوں کو بزدل بنادیتی ہے!“  
 ”یہ کیا بات ہوئی، بات قانونی کا ردروائی کی ہے اور اگر وہ لوگ کو ایی دیں گے تو قاتل گرفتار ہو جائیں گے، پھر انہیں کس کا اور کس بات کا ڈر ہے؟“

”سرکار..... کو، کوں گرفتار ہوگا..... ان کے ہاتھ بہت لیے ہیں، جہاں پشہروں کوں کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا ہے اور ہرگز ان کے لوگوں کی عزت محفوظ ہے ان کے ہاتھوں نہ جان.....“ فیضی نے وضاحت کی۔ ”میں ٹھوڑے دن ان کی بات سے جو اس جوان لڑکی کے ساتھ انہوں نے کیا اور کوئی ان پر ہاتھ بھی نہ ڈال سکا..... انہیں ان لوگوں نے ان کے لڑاؤں دیا ہوا دیں۔“

”کیا وہ ان کو؟“ جہانگیر نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔  
 ”معلوم نہیں سرکار..... وہ لوگ تو ظفر نہیں آئے کسی کو اس دن سے!“  
 ”کیا؟“ جہانگیر اٹھ کر کہا ابوا..... ”کیا ان لوگوں نے کو ایی کہا اور یا؟“  
 ”معلوم نہیں سرکار.....“ فیضی نے کہا۔ ”سرکار میں تو کہتا ہوں کہ آپ فوراً چھوٹے چوہری صاحب کو داپس بلا پھر دیکھیں کہ کوں کو ایی دے تو تار تار نہیں ہوتا!“

”فیضی، میں تو سارے معاملات کو قانونی طور پر ہی حل کرنا چاہتا ہوں، نہ کہ انسانی کارروائیوں میں اچھے کارائی اندہ ل کے لیے مسائل چھوڑ جاؤں.....“ جہانگیر نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ کجیاج اس وقت انتقام کی آگ میں ہوا گا، ہاں ایسی تو اس کو میں نے نہیں جھگڑا ہوا ہے، میں اس جہالت کے مائل سے دور رکھنا چاہتا ہوں!“  
 ”تو پھر سرکار آپ بھی شہر طرے جائیں اور جو مل جائیں اس بات کو مکمل حل انہیں اے مانو لکھ سکتے ہیں، جہاں قانون کا حکم اور قانون کے رکھوالے کے ہاں آپ اس بات میں امید لگائے بیٹھے ہیں کہ کوئی اپنی جان خطرے میں ڈال کر حق میں کو ایی دے گا، وہ بھی چوہری روٹی اور اس کے بیٹوں کے خلاف.....“

”اس میں بہت شرمندہ ہوں.....“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”اے نے کسی مگر رواج کے لیے!“  
 ”میری بہن کی نعلی اتنی ارزا نہیں قائل کی کہ اسے کسی کھلوئی کی طرح جب چاہے دل پہلانے کے لیے استعمال کر لیں اور جب چاہیں گی پکار چیر کی طرح کرے باہر جھگ دیں.....“ فہم کے کھٹے لبس میں بھی۔ ”اب بھی تم فقط اس لیے سے سنا چاہتے ہو کہ تمہیں اپنی جوانی ہوتی ہے کے لیے کھر پر ایک عورت چاہیے!“  
 ”کوئی عورت نہیں.....“ حراج صرف اس کی اپنی ماں! ”تم غلطی نے شرمندہ سے لیے میں کہا۔  
 ”میں وعدہ نہیں کر کہ تو کبھی عورتی اس بار سے میں بات بھی نہیں سنا جاتی.....“  
 ”فیضی..... تمہیں میری دوستی کا واسطہ.....“  
 ”مجھے واسطہ دینے سے پہلے چوہرے تم سے خود اس دوستی کا کتنا مان رکھا!“  
 ”بھائی سے کہنا میری سفارش کریں، مہراجن ان کی بات کو بہت اہمیت دیتی ہے!“ اس نے اپنی سفارش کو مزید مضبوط بنایا۔

”میں کہہ دوں گا اس سے تمہاری طرف سے مگر مجھے کچھ زیادہ توقع نہیں ہے.....“ دل میں لاکھ چاہتے اور امید رکھنے کے باوجود جی فیضی نے قائل کی اور یہ گمان نہ پڑا تھا۔  
 ”تم میری دوستی کی خاطر میرے لیے کو شکر کرنا فہم، مجھے امید ہے کہ مہراجن مجھے معاف کر دے گی..... اس کا دل بہت بڑا ہے!“ وہ جیسے سکھایا ہوا تھا۔  
 ”کاش تمہارا دل میری بہن جیسا ہوتا.....“ فہم سوچ کر رہ گیا۔

☆☆☆

”مہراجن کیا چننے سے آپ کی دوست کا بیٹا؟“ کرن نے چکر ماں سے پوچھا تھا۔  
 ”کیوں کیا ہو؟“ ٹھونڈے چوٹن چڑھا کر سوئی کیا۔ ”سبیل پہلے تو دنیا کے ساتھ آتا تھا مگر اب وہ اکیلا بھی ان کے باپ آ جانا شروع ہو گیا تھا۔“ دنیا تو اس بات پر خوش تھی کہ چلائی یہاں سے ٹھونڈے غیر محسوس طریقے سے اس کا علاج بھی کرے گی۔

”ہاں ایسے ہی گھما سزا.....“ کرن نے کندھے اڑکا کر کہا۔ ”میں شرماتا ہے جیسے کوئی لڑکی ہو!“  
 ”تو بیٹا شریف کردوں کے لڑکے تو ایسے ہی ہوتے ہیں نا.....“ ٹھونڈی ہی دل میں اس بات پر خوش ہوئی تھی۔  
 ”تم ڈرا سے شک نہ کرو نا!“

”وہ شرمایا نہیں تھا.....“ کچھ سوچے ہوئے کرن نے کہا تھا۔ ”کچھ عجیب سا ہے..... میں نے اس کا ہاتھ تھا تو اس نے اپنے لیے میرا ہاتھ جھکا جیسے اس کے ہاتھ میں کوئی.....“ کرن کو الفاظ کا نہیں سوچ رہے تھے۔  
 ”تم حد سے زیادہ بے تکلف نہ ہو اس سے ڈیر.....“ ٹھونڈے نے کہا۔ ”لڑکیاں شرماتی لپائی اچھی لگی ہیں اور ڈر فاصلہ رکھو..... ہر دیکھ لیا پھر ہے جو جورت کو کھلونا سمجھتا ہے اور اس کھلوئے کی طرف زیادہ لپکتے ہے جو اس کی دسترس میں نہ ہو!“

”اوہ ما..... میں نے اس کے ساتھ کوئی ایسی دیکھی بے تکلفی کا مظاہر نہیں کیا، بس یونی جیسے دوست ایک دوسرے کا ہاتھ تھا ہے!“ کرن نے کہا۔ ”اور وہ..... اس کا ہاتھ کاٹنے کا اور صرف ہاتھ ہی نہیں، اس کا پورا جسم!“  
 ”تو اس سے اندازہ کرو کہ اتنا شریف لڑکا ہے.....“ ٹھونڈو کو اپنی نظر انتخاب پر منحوس ہوا تھا۔  
 ”مہما.....“ اسے جیسے نہ آیا کہ وہ کسی طرح اپنے خیال کی وضاحت کرے۔  
 ”میں کرن..... بہت ہو گیا نفیسات پڑھ پڑھ کر مہراجن داغ و خراب ہو گیا ہے، سیدھی ساوی بات میں بھی کوئی نہ کوئی انہیں کا پہلو نکال لیتی ہو!“



☆☆☆

شعبان بخار میں چمک رہا تھا، کھینچ کر ملازموں نے اسے سہارے پر کراڑی سے نکالا تھا۔ کونیکس اس کا جسم مارا۔  
 میں اندر دنگر خانہ میں آ کر ہوا کا تھکا کر دیا تھا تو میری ہنسنی میں تھا۔ راجہ میرے سامنے بیٹھی تھی، اپنا خوف کیسے اسے  
 بیان بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جب تک کہ اس کی شعبان کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا تھا اور دو دفعہ ہلا کر ڈالی تھی۔ راجہ نے کہا کہ  
 عمر ان کو بچا دے گا۔ راجہ صاحب نے کہا کہ میں نے اس کی گردانی کی اور اسے آرام کرنے کو کہا  
 راجہ نے حقاً باقاعدہ طور پر میری بی بی کی جانی بانی اسے کرنے سے نکلوانی تھی۔

میں کے خوف سے اسے تین دنوں تک بھی وہ کھنکھوڑاؤں کے زمر اثرات شریعی کے کمرے میں بسدھ رہا تھا۔ اسے ڈاکٹر نے تین دنوں تک نندی بوش کو دیا تھا۔ کرا کر اس پر اٹھایا۔ دو تباہی بوش دوسرے بچے کا تھم کر مارا۔ بوش کو اس بات سے بڑا اذیت ہے کہ آج نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا، پھر اس کے اندر کا دوسرہ بوش اٹھے گا۔ میں اسے ابھی دیکھ رہا ہوں۔ وہ کس طرح خود کو محفوظ رکھے گا، اسے اب جانتا ہوں۔ یہ بتانا ہے۔ جب تک جانتا ہوں کہ کون سا کھانا کھائے گا۔ اس کا دل راجدیشی طرف سے صاف ہو جائے گا۔ جو یہ جانتا ہوں کہ راجدیشی وہجہ کے بغیر شیان کو کھانے نہ کھائی تھی۔ ایک دوسرے کے کھانے کے دشمن بن جائے گا۔ جو یہ جانتا ہوں کہ راجدیشی

[illegible]

”تم ٹھیک تو ہو بیٹا؟“ انہوں نے راجہ کے ہنگامی پانچنی بیٹھ کر پوچھا۔  
 ”میرے ماما جی مجھے تھما چھوڑ کر چلے گئے مامی..... اب کن میرا سہارا ہے مامی!“ وہ زور زور سے رونے لگی  
 مہراج نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”اللہ مالک ہے، بیٹا، چل تو بھی محسوس ہوتا ہے کہ ہم کس طرح جنمیں گے۔ مگر یہ تکلیف دینے والا جانتا ہے کہ ہم اس کو کس طرح براہ راست کریں گے، ہم حوصلہ کر دیتا، ہماری حالت ایسی نہیں کہ تم اس طرح رو دو؟“

”ہاں ان ظالموں کو ذرا ترس نہیں آیا، میرے ماما جی تو کسی چوٹی کو بھی نہیں مار سکتے تھے اور ان ظالموں نے ماما جی کو کسے جی سے مار ڈالا.....“

”خوصلہ کو میری بیٹی“..... مہراج کی آنکھیں بھی ڈبڈبائیں، وہ کیا نہیں جانتی تھیں کہ چودری مراد علی کتنے شفیق انسان تھے۔ گاؤں بھر کے لیے شفیق باپ جیسے۔ ان کی موت سے پیدا ہونے والا ناکوئی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کے لیے رابو کو سنا ان شکل کو ہاتھ دے، دوسری چیز تھیں کہ کسی کو کھیر کر رابو کی اماں کو بلیو لیا گی، عابدہ بیگم کے لیے تو کھانہ نہ تھا کساں وقت خیرات تھی مگر رابو کی اماں بھی آج چائے تو بڑا حوصلہ ہو جاتا۔

عابدہ عظیم کا پورا وجود ہی اُن کے اتھاہ سمندر کی طرح ہو گیا تھا، بے یقینی کی کیفیت میں وہ سب کے چہروں کو دیکھ رہی تھیں، ان کا نقصان ناقابلِ تلافی تھا، شوہر کو کھو دیا تھا، اب بیٹے کو کھونا نہیں چاہتی تھیں اسی لیے انہوں نے علیحدگی

## شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

اگر جہانگیر سے کہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شجاع کو شہر بھجوادیں، جہانگیر نے رابعہ کی طبیعت کا بہانہ کر کے اسے زبردستی اٹھاتا تھا حالانکہ رابعہ کب جانا چاہتی تھی۔

☆☆☆

[illegible]

”کہاں تیار ہو کر باورچی خانے میں مصروف رہو گی، میں اسی وقت جا کر تیار ایشیا لے آؤں گا!“ اس نے محبوبیت سے کہا تھا۔ ”تمہارے ہاتھ کوئی کام کاج کرنے کے لیے تھوڑی لڑیں۔“

”دنیا کی ہر عورت اسے گھر کا کام کرتی ہے۔۔۔۔۔ اور عورت کی اصل خوب صورتی بھی یہی ہے کہ وہ کتنی سلیقہ مند

”میں آج تو میرے بارود سے پہلی دفعہ سے ملے آ رہے ہیں، انہیں تمہاری خوب صورتی سے متاثر کرنا ہے، یہ تو حلیہ بعد میں دکھائے گا۔“ مگر ہم اس کی بات پر ہنس دی تھی۔ پھر اس نے ایک نئی فہرست تیار کی اور اس کی جگہ اسے نئی بنائی لے کر آئیں، روز بروز فہرست پر لکھی گئی چیزیں جیب میں لکھ لے۔

”اب آپ جا کر سامان لے آئیں تا مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔“

”جاتا ہوں جان..... آج تو تم اپنی چھٹی لگ رہی ہو کہ اٹھ کر جانے کو دل ہی نہیں کر رہا!“ اس نے خمار آلود

وازیں ہیں۔ یہاں سے مراد تو اس کے لئے دو اس کے لئے ہے۔ اس کے دوستوں کے حوالے سے اس نے کہا کہ آپ کا جیسے جا کر  
 مجھے کسی ضرورت نہیں ہے آپ کے دوستوں کے حوالے سے اس نے کہا کہ آپ کا جیسے جا کر  
 سامان ہے۔ ”چوری کو اس نے بروی کر کے نکالا، اذان ہو رہی تھی اس نے سویا کر اذان پڑھ لی۔ جانے اس کا  
 دل کیوں جائے گا کہ وہ اس شوخ سے لال لہاس کو کوبل لے کر جو پڑھنے سے اصرار کر کے اسے پہناتا تھا، خوش ہو جاتا  
 تو اوقات میں کمر ساتھ پڑھ کر دوست بھی تھا۔ اور پڑھ کر کہا تھا کہ چونکہ انہیں سے مریم کو گونہ نہیں دیکھا تھا  
 اس کے وہ جانتا تھا کہ وہ ان کے سامنے بھی وفد لالہ جڑو سے مل جائے۔ وہ وہ انہیں سے مریم کو گونہ نہیں دیکھا تھا  
 اس کے وہ جانتا تھا کہ وہ ان کے سامنے بھی وفد لالہ جڑو سے مل جائے۔ وہ وہ انہیں سے مریم کو گونہ نہیں دیکھا تھا

”اندرا جا میں.....“ اس نے آہستہ سے کہا، دروازہ کھلا اور دوسے تین لوگوں کے اندر آنے کا اندازہ ہوا، پھر

کسی نے مڑ کر کنڈی کی لٹکانی کی۔ ”السلام علیکم! اس نے ہونے لگا۔“  
 ”سولہ آنے بیچ“ پر دیو سولہ آنے بیچ پہنچا تھا۔“ گھٹیا سے لہجہ میں کسی نے کہا تھا، اس نے پلٹ کر دیکھا  
 مگر غرائث صورت مرد کو کھڑے سے دیکھ رہے تھے، انہوں کی طرح رالیں پٹکتے اور ان کے ساتھ کوئی عورت تھی۔

”نہیں یار..... پرویز بالکل غلط کہتا تھا، اسے اندازہ ہی نہیں کہ یہ اس کے بیان سے نہیں بڑھ کر خوب صورت ہے۔“ ایک اور آواز آئی تھی۔ مریم کا سارا دل جوردلنے لگا۔



”ہم وہی ہیں جن کے لیے تم لال جوڑا بہن کرتیار ہوئی ہو، پرویز کہتا تھا کہ گلاب کے پھول جیسی ہے مگر اس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہو.....“ ان میں سے ایک نے کہا اور اس کی طرف قدم بڑھایا، وہ اس کے پیچ بند دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تو جب سے آئی تھی خود کو اس چار دیواری میں محفوظ سمجھ رہی تھیں، اسے کیا معلوم تھا کہ یہ محض چار دیواری اس کے لیے قید خانہ بھی بن سکتی تھی۔ چلتی تو کیا ہوتا، اس نے آنکھیں بند کر کے اپنے اللہ سے التجا کرنا شروع کر دی۔

”میرے مالک..... میرا تیرے سوا کوئی نہیں ہے اور اس بات کو صرف تو ہی جانتا ہے!“

☆☆☆

”میں کہاں ہوں.....“ شجاع نے غنودگی سے باہر نکلتے ہوئے پوچھا۔

”سرکار آپ اپنے گھر پر ہی ہیں!“ ملازم نے اسے بتایا۔

”کون سے گھر پر.....“ اس نے بعد کوشش آنکھیں کھولیں اور کمرے کا جائزہ لیا۔ ”میں نے تو یہ کمرہ اپنے گھر میں پہلے کبھی نہیں دیکھا؟“

”سرکار آپ اپنے شہر والے گھر میں ہیں!“

”جہاں لالہ کے گھر پر؟“

”جی سرکار.....“

”لیکن میں یہاں کیسے آیا اور مجھے ہوا کیا ہے، کمزوری سی کیوں محسوس ہو رہی ہے؟“

”سرکار.....“ ملازم کچھ کہتے کہتے رکھا۔ ”بڑے سرکار کی وفات کے بعد، آپ کو جہاں گھر سرکار نے شہر بھجوا دیا تھا کیونکہ بی بی صاحبہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی..... ان کا اپنا گاؤں میں رہنا ضروری تھا اس لیے انہوں نے آپ کو بی بی صاحبہ کے ساتھ شہر بھجوا دیا اور پھر شری علی سرکار کا امتحان بھی ہونے والا ہے..... ان کا شہر آنا بھی ضروری ہے، وہ بھی آپ کی کل میں شہر آ جائیں گے!“ جس دھوکہ کو وہ اپنی بیماری اور غنودگی میں بھولا ہوا تھا وہ پوری ہولناکیوں کے ساتھ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا، بابو جی کا کل.....

”مگر مجھے کیا ہوا تھا؟“

”سرکار آپ کو گاڑی میں ہی اتارتا بیمار ہو گیا تھا کہ یہاں پہنچنے تک آپ اپنے قدموں پر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے..... ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ گھرے صدمے سے آپ بیمار پڑ گئے تھے!“

”سکتے دن ہو گئے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے؟“ اس کی آواز میں تاسف کے ساتھ فقاہت بھی تھی۔

”سرکار..... زیادہ نہیں، بس تین دن ہوئے ہیں آپ کو یہاں آئے ہوئے!“

”تو پھر اب مجھے جانا چاہیے.....“ اسے یاد آ گیا تھا کہ اس نے بابو جی کے جنازے کو کندھا دیا تھا، اپنے ہاتھوں سے ان کو قبر میں اتارا تھا اور کس طرح بلبکے ہوئے شری علی کو اپنے ساتھ لگا کر اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ اپنے باپ کے قاتلوں کو انجام تک پہنچا کر دم لے گا۔

”ڈاکٹر نے آپ کو سسر سے منع کیا ہے اور کہا ہے کہ جب تک وہ اجازت نہ دے، آپ گاؤں نہیں جاسکتے!“ ان نے سب سے ہوئے انداز میں وضاحت کی تھی۔

”کس مائی کے لال میں جرات ہے کہ وہ مجھے گاؤں جانے سے روک سکے؟“ اس نے اپنے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر ناطقی اس قدر بھی کہ وہ جیسے واپس ڈھے سا گیا تھا۔

”سرکار آپ آرام کریں، جونہی آپ کا بخار اترے گا اور آپ بہتر محسوس کریں گے تو میں آپ کو خود گاؤں لے چلوں گا۔“ ملازم نے اسے تسلی دی اور دل میں وہ ڈر رہا تھا کہ چوہدری صاحب ابھی غصے سے کہیں کے کتوا

ہوا باپ ہے جو مجھے لے کر جائے گا گاؤں مگر اس کو حیرت ہوئی شجاع نے جواب میں کچھ نہ کہا، خاموشی سے لیٹ کر روٹ بدل لی۔

”آپ آرام کریں سرکار.....“ ملازم نے کہا اور اگلے قدموں کرے سے باہر نکلے لگا۔ ”اگر کسی چیز کی ضرورت ہو، بندہ حاضر ہے!“ تھوڑی دیر تک اس نے چوہدری شجاع کی طرف سے جواب کا انتظار کیا مگر جواب نہ آنے پر وہ بھماکہ شاید وہ سوچے ہیں۔

☆☆☆

”دلی تمہیں معلوم ہے کہ یہ سب کی سب تمہاری بہنیں ہیں، پھر بھی تم نے.....“ جہاں آرانے اپنی بات ادھوری ہوڑی تھی، اس سے زیادہ کل کر وہ اور کیا کہتیں۔

”اماں..... میں جانتا ہوں کہ یہ کون ہیں سب..... اور اب میں جو ان ہوں اماں، اگر تم اس بات کا احساس نہ کرو تو میں کیا کروں، میں کیا اپنی جوانی یونہی ضائع کر دوں؟“

”کس نے کہا ہے تم سے بیٹا کہ یہ تمہاری بہنیں نہیں ہیں؟“ جہاں آرانے ٹوہلی۔ جانتی تھیں کہ کبھی نہ کبھی یہ عید تو کل ہی جائے گا مگر انہیں یہ معلوم کرنا تھا کہ کس نے ان کا راز فاش کیا ہے۔ ”الماس تمہاری بہن ہے بیٹا!“

”ہاں اس لیے کہ اسے تم نے جنم دیا ہے۔ مگر اس کا باپ کون ہے اماں، کیا اس بات کا کسی کو علم ہے؟“

”تم حد سے زیادہ بدتمیز ہو گئے ہو دلی.....“ ان سے اتنی براہ راست چوٹ برداشت نہیں ہوئی تھی۔ ”جانے کون تمہارے کان بھرتا رہتا ہے؟“

”میرے کان کون بھرے گا اماں..... یہ تمہاری بھانت بھانت کی جمع کی ہوئی ”چیزیں“ مجھ پر مرتقی ہیں اماں، میں تو انہیں بہنیں ہی سمجھتا تھا!“ خزانہ بن اس کے انداز سے نمایاں تھا۔

”سب جانتی ہوں جو تم ان کو بہنیں سمجھتے ہو.....“ ذانت کچکا کر انہوں نے کہا۔

”کہیں نہ کہیں تو میرا بھی کائنات کا نا ہے نا اماں تم نے، تو انہی میں کسی سے انکا و اماں، جس سے تم چاہو!“ اس نے جیسے ماں کو اپنے لیے انتخاب کا اختیار دے دیا تھا۔

”جسے تم نے چننا تھا جن چکے ہو، اب تمہیں ماں کا خیال آیا ہے.....“ ان کے اندر ایک روايتی ماں نے سر اٹھایا تھا۔

”ارے نہیں اماں.....“ اس نے لاڈ سے کہا۔ ”تم لے لو اپنی جو میں نے ابھی تک کسی کو چننا ہو، ابھی تو میں ان کو باری باری جانچ رہا ہوں، شادی اسی سے کروں گا جس سے تم کہو گی!“ اس کی اس بات نے جہاں آرا کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا۔

”کیا تم ان سب سے.....“ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس سے پوچھیں۔

”یونہی ذرا مغل کے طور پر اماں..... تیرا لال ہے ہی ایسا خوب رو جوان کہ اس پر ساری مرتقی ہیں!“ اس نے اتر کر کہا۔ جہاں آرانے اسے دو ہتھروں پر رکھ لیا۔

”بے غیرت، بے حیا..... دلال..... کتے، سؤر.....“ جو جو ان کے منہ میں آ رہا تھا وہ بکے جا رہی تھیں۔

”یہ دن دیکھنے سے کہیں اچھا تھا کہ میں مر جاتی.....“ وہ تھک ہار کر رونے لگیں۔

”ایسا کیا ہو گیا ہے اماں.....“ دلی نے مار کھا کر بھی ڈھٹائی سے کہا تھا، اسے بھلا ماں کے دو ہتھروں سے کون سی گول گہری چوٹ لگ گئی تھی۔

”تو پوچھ رہا ہے کہ کیا ہوا ہے..... تو نے تو میری عمر بھر کی یونہی لوٹ لی ہے دلی، کاش میں نے تجھ جیسی اولاد کو نہ جٹا تھا، اس میں نے اپنی ماں کے کہنے پر تجھے اپنے پیٹ میں ہی ختم کر دیا ہوتا.....“ وہ اپنا سینہ پیٹ کر تین کر رہی تھی اور ساری کی ساری یہ سب کچھ سن رہی تھیں اور کسی کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ نیچے آئی، الماس نے اس لمحے اپنی ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء 119

ہوئے بڑے مسئلے کے سلسلے میں آنے والے لوگ، اس سے دوستی کے دعوے کرنے والے..... یوں اس کے آنکھیں موندنے لگیں طوطا چسپی کر رہے۔

نوبلی اور اس کے بیٹوں کے دہشت، اس کے ترے مغنوں سے کہیں زیادہ تھی۔ نہ صرف اس کے بقیہ تشیشی افسر کے سامنے بھی انہوں نے اس واردات کے پیشی کو باہان ہونے کا اعتراف کیا تھا مگر یہ بات بھی اسی وقت واضح کر دی تھی کہ عدالت میں کوئی کوئی نہیں دیں گے۔ تشیشی افسر نے دراز دراز بدتی کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنے بیان سے اس کے سامنے بھی پھر گئے۔

”مگر یہ بیان نہ ہو جاتا..... میرا بھائی دغا میں فرشتہ تھا، اس کو قتل کرنے والے اسی دغا میں مزایا نہیں گے، ہم اور تم دیکھیں باندھنیں مگر دغا دیکھیں گی!“

”مگر چھوٹی اماں..... میرے دل کو بڑی بے چینی ہے کہ بالوجہ کی قتل کر کے ان کے قاتل دغا دے پھر میں اور ہم بگڑ کر کیس!“ اس نے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا۔

”چانتی ہوں بیٹا! صرف یہی نہیں ہم سب کی بہت بے چینی ہیں کیا کیا جائے..... انتقام لینے کا ارادہ کر تو گی اپنے ہی بھینٹ چڑھتے ہیں!“

”نیکو تو میں نہیں جانتا پچھو..... اور مگر ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں کیسے لے سکتے ہیں؟“

”بہتر یہی ہے کہ گواہوں کو کسی نہ کسی طرح مٹا دو!“

”وہ اپنی جان و عزت کی خاطر ڈرتے ہیں پچھو..... کوئی اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کو تو نہیں!“

”ہم شجاع کہہ رہی ہیں مگر کتنے ہیں مگر کتنے ہی شجاع کو اس دقت میں اس کی بہت ضرورت ہے!“ رابعہ کی ماں ریشم نے کہا۔

”کس لیے پچھو؟“ کچھ نہ سمجھتے ہوئے گھبراہٹ سے پوچھا۔

”نوبلی اور اس کے بیٹوں کے خوف سے لوگ گواہی دینے کو تیار نہیں ہو رہے مگر شجاع کا گواہی میں ہونا انہیں قوت دے گا کہ ان کی پشت پر بھی کوئی ایسا ہے جو نوبلی اور اس کے بیٹوں کی طرح کا ہے.....“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں پچھو مگر میں نے شجاع کو اس سارے قصے سے اسی لیے تو باہر رکھا ہے کہ بات بڑھ نہ جائے!“

”میں نہیں کہہ رہی کہ شجاع انتقام لے۔ مگر شجاع کا گواہی میں ہونے سے نوبلی اور اس کے بیٹوں کی ہیبت کم ہوا ہے کی..... اگر ایک نکل پر کچھ نہ ہوا اور وہ سے چھوٹ گئے تو ان کا کاغذ نونکی بھی ہو سکتا ہے، ان لوگوں میں قتل ام کی کوئی چیز ہے نہ انہیں اپنے پیارے اور خوشی رشتوں کا کوئی احساس.....“

”میں ڈرنا صرف اس بات سے ہوں کہ شجاع جذباتی ہو کر کوئی ایسا اقدام نہ کرے کہ خود کو خطرے میں ڈال لے یا لوگوں کو ہاتھ میں لے.....“

”مجھے یقین ہے کہ تم اسے ساری بات بتاؤ گے اور اسے سمجھاؤ گے کہ وہ سمجھ جائے گا، اسے علم ہے کہ ہم نے اتنا انسان اٹھایا ہے مگر یہ نقصان ہے ہم تحمل نہیں ہو سکتے اور پھر بھائی جان سمجھائی گی اسے!“

”چلیں دیکھتا ہوں، اس کی طبیعت ذرا سنبھل جائے تو میں کچھ دنوں میں اسے آ کر اسے لے جاؤں گا!“ ریشم نے اس کو گدھے پر ہاتھ رکھا، وہ جذباتی سا ہو گیا..... پچھو..... مجھے تو خوف یقین آتا ہے نہ ذہن، میں کسی کو کیسے صبر کرنے کو اس سونے لے کرے ہوئے ہیں، اماں، شجاع، رابعہ، شیری علی..... آپ!“

”خصلت دیر سے بنے..... تم تو بہت بہادر ہو، تم نے اب لاہجہ کی گدی سنبھالی ہے، ان کی جگہ اس خاندان اس گاؤں کے لوگوں کا خیال رکھنا ہے!“ اس کا سر انہوں نے اپنے سینے کے ساتھ رکھا لایا۔ ”میرا بچا!“ باپ کی موت

ماں کے دکھ کدوں سے محسوس کیا تھا اور چانتی بھی کہ ایک طوائف کی متاع کیا ہوتی ہے۔

”میں ہر وقت ان کی اپنی عمرانی کرتی تھی، ان کا خیال بھی رکھتی تھی، انہیں بھائی بھی تھی..... پھر انہوں نے اماں کو صو کا دیا.....“ وہ سوچ رہی تھی۔ ”صرف انہوں نے ہی کیوں، میں نے بھی تو اماں کو صو کا دیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔“

”آپا.....“ نیکم کی آواز آئی تھی۔ ”کیوں رو رہی ہو؟“

”پاپی ماں کے نصیب کو رو رہی ہوں..... جس نے تم سب کو سہارا دیا، ماں کا پیار دیا تم سب کو بتایا کہ دلی تم سب کا بھائی ہے اور تم سب نے مل کر اماں کی ناک کے چوچے کا کھیل کھلایا.....“ وہ چلائی۔

”نندو! آپا! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے..... اور ہر مذکی طبیعت بھی ٹھیک نہیں!“

”کیا ہوا ہے؟“ اماں نے آنسوؤں سے بھری نظر سے اسے دیکھا چاہے وہ کتنی بھی غایت ہو جائیں اماں نے انہیں اپنی بہنوں کی طرح سمجھا تھا۔

”جو مجھ نہیں ہوا ہے.....“ نندو نے آنکھیں سے کہا۔

”مجھے تو اماں کی تکلیف اور دکھ کا صوبج کرونا آ رہا ہے، کسی اور کو اس جیسی تکلیف کیسے ہو سکتی ہے؟“ اس نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کئے۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا.....“ نیکم کچھ کہتے کہتے رہی۔ ”میرا مطلب اس کی حالت سے ہے، جو تمہاری طرح سے ہے!“

”کیا مطلب؟“ اماں جو کئی کچھ سمجھ نہ سکی۔

”کچھ پچھو گی بھی منہ سے یہاں ایسی ہی بھجوا کر رہو گی؟“ اماں نے پڑ کر پوچھا۔

”اسے بھی تو روزے اٹھانے پڑیں ہی آپا اور اسے شک..... بلکہ یقین ہے کہ.....!“

”کیا بھلا کر رہی ہو تم..... کسے ہو سکتا ہے یہ؟“ اس بات پر یقین نہ کرنا چاہ رہی تھی، کتنی بڑی کوتاہی ہوئی تھی اس سے جوان پر نظر نہیں نہ کی گئی۔

اماں کے لیے اس سے بڑی اور کیا بات ہوگی، وہ کیسے اس بات کو سن سکے گی..... ان تینوں پر تو اماں نے خاص محنت کی ہے کہ یہ بالکل خاص ہوں اور ان کے پاس وہ بھرا ہوں جو کسی کی سانس روک دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔

”میں اس کے سامنے اس دکھ کا کیا دوا کروں؟ وہ خود سے پوچھ رہی تھی، زیادہ نہیں لگی، اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرتا ہے۔

شجاع کا بخار ختم ہونے میں تقریباً ایک ہفتہ لگ گیا تھا، اسی دوران جب تکہ بھی ایک چکر لگا کر گیا تھا اور اس کے ساتھ رابعہ کی اماں بھی آگئی تھیں اور شیر علی بھی۔ شیر علی کے استعفاء پر تھے اور اس کا اسکول کا نا ضروری تھا۔ معراج لی..... تین چاروں کے بعد اجازت لے کر ذرا نیو کے ساتھ اپنے بھائی کے گھر چلی گئی تھیں جہاں سے انہیں زرتاج کو ساتھ لے کر گاؤں چلے جانا تھا۔

رابعہ کا خوف شیر علی اور اپنی ماں کے جانے سے قدرے کم ہو گیا تھا اور یوں بھی اپنی شعوری کوشش کے باعث وہ شجاع کا سامنا نہ کر سکی تھی۔ جب تکہ دنوں باپ کے قتل کی تحقیقات کے باعث مصروف تھا، شہر، تا بھی تو اچھا ہوا ہوتا۔ اس رات بھی وہ دیر تک اپنی پوچھنی (رابعہ کی ماں) کے پاس اور دیر تک بیٹھا رہا تھا اور مقدمے کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کے بارے میں بتا رہا تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے باپ کی زندگی میں اس کے پاس اپنے



**سالگرہ نمبر** کے بعد پہلی بار اس کا غم آنسو بن کر اس کی آنکھوں کے بند توڑنے لگا تھا۔

☆☆☆

”تم نے تجھے اور بچی کو مارنے کا پورا بندوبست کر دیا تھا مہاشا.....“ اس نے اس کے کندھے دبا دیے۔ ہوا ٹھوکرہ لیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ ”میں تو کروڑی سے بے ہوش پڑ چکی تھی جب میرے بالوں نے باہر سے تالا کھول کر میں نے سے نجات دلائی تھی.....“ اس نے اس کی اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

جائے۔ اماں مجھے معاف کر دیں گی لیکن؟ خود ہی سوال کرتا اور خود ہی جواب دیتا۔۔۔ ان کا دل بہت بڑا ہے اور مجھے فوراً معاف کر دیں گی۔ جانے اماں نے مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کی ہوگی کہ کہاں ڈھونڈیں، ہم نے تو جانے کئے ہی ٹھکانے بدلے ہیں۔ میں نے ان کا کتنا دل دکھایا ہے۔ سوچ سوچ کر وہ مامہ ہوتا۔

زہرہ نے اپنی حیثیت کی قربانی کے باوجود جسے کھانوں کے کھانوں میں چھوٹے موٹے کام کے اپنے مگر چولہا جلانے کی کوشش جاری رکھی۔ محلے والے غریب بچان کر لیں بھی عداوت اور کر دیتے تھے اور اب تو ہم اس کے ساتھ نہیں آنے والے حادثے نے لوگوں کو ماس کارا بنادینا بھی سکھایا تھا۔

میں نے اس کو خود ہرہ پر اپنی پابندی لگا دی تھی اسے کھر میں قید کر دیا تھا، جو میں مرچا تا تو وہ تب بھی توجو چلا کرتی پھر مرنے..... کون سا لپٹ کر آ کر اسے دیکھ لیتا تھا اس حادثے نے نہ صرف اس کا ذہن تبدیل کیا تھا بلکہ اس کا اعتبار بھی بادل ناخو اسے ہی مگر ہرہ پر توجو اس کا نام ہوا تھا۔

پچھلے نصف کے دوران نہرہ نے اس کی اپنی خدمت کی بھی کدوہ اس کی قدر کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اللہ کا کرم اور ڈاکٹر ولی کی محنت اور نہرہ کی دعاؤں..... ان سب نے مل کر اسے ایک بار پھر اپنے عیروں پر کھڑا کر دیا تھا مگر اب وہ ضروری کی مشقت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

موت اور حیات کی کشش میں جلا ہوا..... اس کمزور اور خوفی کلٹھم نے ایک بچے کو جنم دیا تھا، جس کی صحت مگر ماں کی صحت سے بڑھ کر تھی۔ پہلی نظر میں ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ ماں کو اچھی خوراک کی کمی تھی نہ آرام جس کے باعث بچہ بھی کمزور سا تھا اور ماں بھی۔ مگر کلٹھم کی خوشی دیدی تھی وہی، مگر صراج کے گھر سے ہی ایک مہراج نے اسے اس کے گھر جاکر رہا

دروالے سے انکار کر دیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ وہ ہیں آجائے۔ اپنی پڑوسی کی مدد سے وہ معراج کے کمرے پر آگئی تھی وہیں پہنچ چکا تھا۔ معراج نے کشم کا ماتن اختیار رکھا کہ اس کی ماں بھی ہوتی تو اس کا ایسی طرح خیال رکھتی روتی کہ اپنی کھلی کی حالت دیکھ کر دیکھ کر بیان ہو ہی نہ سکتی کہ ولادت خیریت سے ہو جائے نہ مرہٹہ نہ ہو۔

اس کے باپ تم بخت کو اطلاع کر دانا ہوگی..... کبر اس وقت کا فائدہ..... دس رات بیت چلی ہے یوں بھی وہ نہ کر کے پڑا ہوگا!، معراج نے انتہاء غصہ نکالا تھا۔ زرتاج نے دودھ گرم کر کے اس میں دیکھی گلیاں اور زبردستی کھلیم گلیاں بیچنے سے روکنا بھی ہوگی کا اظہار کیا معراج نے پیل کھٹوم کو اس کے لئے ٹھنڈی، چٹکھٹکھٹم نے اسے اس وقت زرتاج

”اچھا چلو تاؤ اس کا نام کیا سوچا ہے تم نے؟“ زرتاج نے اس کا دھیمان مٹانے کو کہا۔

”کیا بات ہوئی کھانا؟“ زرتاج نے بے چینی سے کہا، ”ابھی چند دن قبل علی تو وہ سب سے لڑتی تھی جہاں اس کی ہوتی مہمانی کے ہاں بچے کی ولادت ہونے والی تھی اور ہر وقت مختلف ناموں پر بحث ہوتی رہتی تھی۔ وہ لوگ ان کے

122) **ماہنامہ پاکیزہ** — اپریل 2012ء

تھا اور اسی طرح گاؤں اور شہر میں بھی۔

”جو نام تم بتاؤ گی یا ماسی، وہی رکھ لیں گے!“ کلثوم نے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں اچھا سا نام سوچ کر بتاؤں گی!“ زرتاج نے مسکرا کر کہا۔

”تمہیں حرے کی ایک بات یاد رکھو کلثوم.....“ روجناح غصا سے کہا۔ ”مجھے ماسوں لندن سے آئے ہیں، تین ماہ کے بعد ان کے ہاں بچے کی ولادت متوقع ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ وہاں پر اسکی سفینیں ہیں جن کے ذریعے انہیں علم ہو چکا ہے کہ ان کے ہاں بیٹا ہوگا!“

”ہیں..... کیا واقعی؟“ حیرت سے کلمہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔  
 ”یہ کیسی بات کر رہی ہو تم؟“ معراج نے حیرت سے پوچھا، ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“  
 ”واقعی! ماں..... سچ کہہ رہی ہوں!“ زربانج نے جوش سے کہا، ”اور انہوں نے تو سب کے ساتھ مل کر اس کا نام

”یہ مونی میوں کے چوہے ملے عجیب ہی ہیں، جانے کیسی کیسی کھڑکی باتیں کرتی ہیں!“ مسراج نے غصے سے کہا، انہیں رات بہت بڑی لگی تھی۔

”یہ ایسا نہیں کہتے اب! انہوں نے ماموں سے شادی سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا اور باقاعدگی سے نماز پڑھتی تھی۔“

”اچھا؟“ کلام بہت متاثر ہوئی تھی۔ ”ان کا نام کیا ہے؟“

”ان کا اسلامی نام عاشر ہے،“ زرتاج نے کہا۔ ”اور وہ اس پر بہت فخر محسوس کرتی ہیں؟“

”اور ان کے بیٹے کا کیا نام ہوگا، آنے والے بیٹے کا؟“ کلثوم نے نجس سے پوچھا۔  
 ”اس کا نام..... وہ کسی“ اس کا نام حاتم ہوگا، انشا اللہ!“  
 ”بہت مبارک نام ہے.....“ کلثوم نے تحریف کی۔

”تو یہ کہ اسلام قبول کیا ہے اس نے اور اسے شرم نہیں آتی یوں سب کے سامنے استہدار لگاتے ہوئے؟“ معراج نے ناراضی سے کہا۔

”جب سب لوگ بہت سے نام تجویز کر رہے تھے تو مجھے جو ادنام بہت اچھا لگا تھا؟“ زرتاج نے کہا۔ ”میرے

”اے رہے دو..... ایسے لگتا ہے جیسے کوئی بڑا آادی ہوا!“ معراج نے فوراً اس تجویز کو چھٹکارا۔ ”اچھا چلو جو ابھی کاٹھم کو پسند ہو.....“ معراج نے کہا۔

"بہت پیارا نام ہے ہاں اور اس کا بھی بس یہی رکھ لیتے ہیں....." کلثوم نے گورا کہا۔  
 "اس کا مطلب ہے، جی،" زرتاج نے کلثوم کو بتایا۔  
 "بہت اچھا مطلب بھی ہے اس کا....." کلثوم نے پیار سے اپنی گود میں سوئے ہوئے، ہونٹ پڑتے بچے کی طرف دیکھا۔

گیا، جس نے اسے چند منٹوں میں ہی سمجھا دیا تھا کہ کٹھن کی زندگی کا کوئی مقصد تھا۔ "جواد....." وہ زیر لب بڑبڑاتی

ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء (123)



”نہیں تو..... ہاں ہاں!“ دروازہ کھولنے والا چٹپٹا گیا تھا۔

”اور کون کون رہتا ہے اس گھر میں؟“

”تم جانا دے آئے ہو یا پیش کرے؟“ اس نے جھٹکا کہا۔

”لڑنے کو کیوں آ رہے ہیں بھائی صاحب، محلے دار ہوں، پھر چار ہوں!“ آنے والے چٹل سے کہا.....

”چلو جاؤ اب، برتن بعد میں آکر لے جانا!“ اس نے اسے ٹالا۔

”برتن تو مجھے ابھی چاہیے.....“ اس نے جان بوجھ کر کہا۔

”چلو دارا، ابھی دابھی لے جاؤ.....“ اس نے بدھتہ پی سے برتن اسے لوٹا دے ہوئے کہا۔

”ارے کس نہیں.....“ گھبرا کر اس نے مقصد پر تھا!“ اس نے فوراً صفائی دی۔“ یہ آپ کے سامنے والے کمرے سے

دھواں کیوں نکل رہا ہے؟“ گھبرا کر اس نے مڑ کر دیکھا اور جی کر اندر والوں کو کپکا رہا۔

”رشید..... غور..... بھوکا ہو!“ بڑی کھڑا نماز دھو گیا کوئی گڑبڑ سے ورنہ اگر کسی آدمی کے گھر میں آگ لگی ہو

تو وہ بجائے آگ بجھانے کے کیا بھانسنے کا کہتا؟ اس نے باہر گلی میں کھڑے کھڑے چلا چلا کر لوگوں کو متوجہ کیا اور جو بھی

یہ بتیں کھڑے کھڑے کھڑے لوگوں نے انہیں مکوں اور کھوکھوں پر رکھ لیا۔ اندر سے ڈری ڈری سوائی چیخوں کی آواز

لے آئیں محالے کی تجھ کی احساس دلا یا۔

”دروازہ کھولو بہن.....“ ایک نوجوان نے کہا۔ ”تم تمہاری مدد کو آئے ہیں!“

”کون ہو تم لوگ؟“ مریم نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

”تم تمہارے سارے ہیں، دروازہ کھولو.....“

”ہم دروازے تک نہیں پہنچ سکتے تھے.....“ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”اندر پرچہ کو آگ لگ چکی ہے!“ اس کی

آواز سے ارگرد روشنی پھیل گئی، آگ کے شعلے پورے ہی چلے چارے تھے۔

”دروازہ تو ڈوو.....“ ایک آواز کی اور اندر مریم کا روضہ دھڑاٹھ شروع ہو گیا۔

☆☆☆

وہی عباس تھا جو ہر روز زہرہ کوٹا لے میں بند کر کے جاتا تھا اور اب ہر روز زہرہ سے گھر پر چھوڑ کر کام کرنے کو جاتی

تھی۔ یہ نظری تو گھر میں قانون کی نوبت آج جانی۔

چندوں کے جب بعد لوگوں کا ترس کا جذبہ بھڑا رہ گیا تو گھر میں بھڑا چلا ہوا زہرہ شدت سے غصا لگنے لگے کہ ”اب

کیا ہوگا؟“ خاموشی گاہوں سے وہ ایک دوسرے سے سوال کرتے ہوئے مگر کوئی جواب نہ پاتے۔ ابھی تو یہی گھر تھا کہ

عباس کے علاج کے اخراجات اس تھیرانی کھینی نے اٹھائے تھے جہاں وہ کام کرتا تھا، ورنہ ان سے تو علاج کروانا بھی

ممكن نہ ہوتا۔ ”میں کچھ کام دام کروں؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے عباس سے پوچھا تھا۔ عباس نے جس نظر سے اسے

دیکھا تھا وہ اندر تک ہم گئی تھی۔

”تو کیا کام کرو گی؟“ اس کے کچھ میں کھٹکتی تھی۔

”کچھ بھی کروں گی!“ اس نے نظر پٹپٹی کی، عباس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی تاب کہاں تھی

اس میں۔

”بے بھگوان.....“ اس نے سوچا۔ ”عباس کو جلد ٹھیک کر دے!“ جب بھی وہ کسی مصیبت میں ہوتی، اسے آگنا

نہا بھگوان سے ہی آتا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ بھٹل کر رہی تھی، مگر یہ کہ اس کی بڑا اہمیت عباس نے سنی تھی نہ وہ

اس کی سوچوں تک رسائی رکھتا تھا۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“ عباس نے پوچھا۔

سالگرہ غریب بائیں دونوں بڑوں سے چھپا گیا تھا۔ دوسرا کھانا کھا کر جب سب لوگ لینے کو چلے گئے تو دونوں بہنیں

بھائی کے پاس آئیں۔

”اب تم شادی کر لو شاکر.....“

”آپ لوگوں کو اس کے علاوہ کوئی اور بات آتی ہے نہیں؟“ وہ ہنسا تھا۔

”ہم دونوں گئے تھے گاؤں تمہاری خیریت پوچھنے کو.....“

”چھاب؟“ شاکر نے حیرت سے پوچھا۔

”وہاں تمہارا گھر بند تھا تو ہم سمران خاں کی طرف چلے گئے تھے، رزاق کو بھی دیکھا ہم نے!“

”جھما؟“ وہ دیکھا ہوا بیٹھا۔ ”کیسی تھیں خالہ؟“ بے چینی کے باوجود وہ ان سے سیدھے جھاؤ رزاق کے

بارے میں پٹل پوچھ رہا تھا۔

”خالہ تمہاری طرف سے پریشان بھی تھیں اور گاؤں کے حالات سے خوفزدہ اور چارہ بھی تھیں کہ تم جب بھی لوٹو تو

وہ رزاق کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیں!“

”کسی کی رزاق آپ لوگوں کو؟“ اس نے ان سے سوال کیا۔

”جست بھاری ہے لالہ! رزاق میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ فوراً سے پہلے اسے گھر لے آؤں!“ چھوٹی بہن نے کہا۔

”سب اب کوئی بھائی بنے گا نہ غدر.....“ بڑی بہن نے کہا۔ ”یہی اس کی جوان پٹی کی گھر میں بیٹھی ہو تو اسے

پریشانی تو ہوئی ہے تا اور پھر ہمیں علم ہے کہ گاؤں کے چور بدروپ نے کیا گتہ چار کھا ہے!“

”سب جانتا ہوں!“ اگر گھر میں کادو بار جھانسنے میں بھیجے کی اور چیز کا ہوش ہی نہ تھا۔ اب کام چل نکلا ہے تو یہی

فرصت میں گاؤں کا دروازہ دوسرے معاملات طے کروں گا!“

”میں سوئے تھی، لیکن لوں کی بھیا!“ چھوٹی بہن نے کہا۔

”ہاں وہ دونوں بہنوں کا حق ہے ضرور لے گا.....“ کچھ دقت اس نے کچھ دقتوں بڑوں کو بڑی تھوڑی جانتا

تھا کہ ان کے حالات سے کچھ نہیں ہیں۔ اگر چہ وہ گاؤں کی حالت لایا تھا مگر کچھ نقد رقم کی ان کی ضرورتیں پوری کر سکتی تھی۔

”جب میرا گاؤں جانتے گا پر وگرا رہے گا تو آپ لوگوں کو کھوکھوں کا گاؤں لوگ بھی جائیں تو خالہ سے بات کر

لیں گے!“

”جس طرح تم کہو گے میرے بھائی!“ بڑی بہن نے وعدہ کیا، ”کیا روکے نہیں آج؟“

”نہیں! سب ملکا آج کام بہت ہے.....“ چاہتے ہوئے بھی وہ بہنوں کو اپنے راز میں شریک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ان

سے رخصت ہو کر آیا اور وہاں کچھ سمنز اس کی بیٹی شادی میں رہا کہ اگلا مرحلہ اب اس کی اپنی شادی کا ہے جس کے راستے

میں اب کوئی رکاوٹ نہ بنے۔ ابھی سوچوں میں اسے نیند آنے لگی اور جیسے سے سب کا خیال آ گیا جانتے بھلی آپ کو تنگ نہ

کر رہی ہو..... میں کیوں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ اس کے بارے میں اسی طرح سوچتا

ہے جیسے کہ وہ اس کی بیٹی ہوتے عرصے سے وہ اس کے ساتھ تھی۔ اتنا عرصے تو جانا بھی ساتھ ہوا تو اسے انوسیت

ہوئے تھے۔

”جتنا اچھا لگتا ہے جب وہ اپنی تو قی آواز میں مجھے اب کہتی ہے.....“ وہ سوچ کر مسکرایا۔

☆☆☆

باہر کوئی غلغلہ نہ تھا اور نیا زونے کے لیے آتا تھا اس نے حیرت سے اس کردہ صورت آدمی کو دیکھا جو اس سے قبل

کبھی اس کچھ میں نظر نہیں آتا تھا۔

”کیا آپ اس گھر میں رہتے ہیں؟“ آنے والے نے پوچھا۔



”دعا کر رہی تھی تمہارے لیے۔۔۔۔۔“ اس نے کہا۔ ”اللہ تمہیں صحت دے، جلد ہی تم اپنے قدموں پر کھڑے ہو جاؤ۔“

”کیوں۔۔۔۔۔ تم میری ٹیٹی چا پی سے ٹھک گئی ہو؟“ طنز میں ڈبا ہوا انداز، مزاحیہ لہجہ۔۔۔۔۔ ”دفع ہو جاؤ تم کہیں اگر تمہیں ہوش بڑھنے لگے گا ہوں میں!“

”میں نے یہ کب کہا۔۔۔۔۔“ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”جانتا ہوں سب جانتا ہوں۔۔۔۔۔“ اس کی آواز میں بھی کچھ بیگناہی سا تھا۔ ”ہو مجھ میں گیا ہوں میں تھہ پر ہنگ۔“

”میں نہیں۔۔۔۔۔ بالکل نہیں عباس۔۔۔۔۔“ اس نے اٹھ کر اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔ ”کاش میں اپنا دل چکر کر تمہیں دکھا سکوں، میں تو تمہیں دیکھ کر کشتی ہوں!“ عباس کو دل سے یقین تھا کہ وہ کبھی کہہ رہی ہے گردہ اسے اس بات کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔

”روٹی لے لی کیا؟“ اس نے ایک پائگل سے نکی سی بات کی۔ زہرہ نے اپنے آنسو صاف کیے اور سوئی کی طرف بڑھی۔

”تو پھر میں کس کام کے لیے چلی جایا کروں؟“ اسے روٹی دے کر وہ اس کے نزدیک ہی بیٹھی تھی۔

”کہاں؟“ اس نے روٹی سے دھیان نہ اٹھا رہا تھا۔

”ساتھ والی خالہ سے کہوں تو وہ کچھ نہ کچھ بندوبست کر دیں گی!“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”کیا کام آتا ہے مجھے؟“ اس نے سوال کیا۔

”میں نے پریدہ صاحبہ کو ملانی کا کام تو آتا ہے مجھے مگر آہستہ آہستہ ہاتھ چل جائے گا جب تک کوئی اور کام کر لوں گی!“

”اور کیا کام؟“ اس نے جرح کی۔

”یہ تو خالہ سے بات کر کے ہی علم ہو گا تا کہ وہ کیا کام دلا سکتی ہیں؟“ اس نے اپنے اندر ابھرے والے غصے کو دبایا۔

”اچھا اس سے پوچھنا، مجھے مجھے بتانا۔ میں پھر ہی کوئی فیصلہ کر سکوں گا!“ اتنے شاہناہ انداز سے کہہ رہا تھا جیسے کوئی ذاب ہو اور اس کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔

”تمکھ ہے!“ اس سے بہتر اور بڑی عقلی جواب اس کے پاس اور کوئی نہ تھا۔

”اور ہاں۔۔۔۔۔“ اس نے کہا: ”کوئی ایسا کام نہ ہو جہاں تو آدمیوں سے آگے نکلے کرتی پھرے!“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا اور دھرمزب اسے دیکھ کر رہ گئی۔ جو صورت اس کی خاطر اپنے اتنے پکارنے والے ماں باپ کو چھوڑ کر آگئی تھی، اب اسے چھوڑ کر اس اور کے ساتھ بھی جا سکتی تھی۔۔۔۔۔ ”میں بھی قابلِ استبداد نہیں ہوں گی عباس تمہاری نظر میں!“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

☆☆☆

”کیا پیار ہے کلوم تمہارا بیٹا۔۔۔۔۔“ زرتاج نے اسے گود میں اٹھا کر کہا تھا۔

”پیارا تو ہے مگر ہے کیسا بد قسمت کرکس کے باپ کلوم ہی نہیں کس کا بیٹا پیدا ہوا ہے!“ کلوم نے کہا۔

”تپا نہیں کس بخت کہاں چاہا ہے۔۔۔۔۔“ حمران بی بی نے صفے سے کہا۔

”مگر اسے کسی سے کہہ کر پتا کروایا ہے ماسی؟“ کلوم نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

”کسی ایک سے نہیں کلوم! میں نے بہت لوگوں سے پوچھا ہے پھر۔۔۔۔۔“ حمران نے کہا۔ ”کسی نے اسے چندوں پہلے کہہ لوگوں کے ساتھ دیکھا تھا جو اس کاؤں سے نہیں تھے!“

”تو کون لوگ تھے وہ؟“

”ہوں گے کوئی ایسی طرح کے نشی۔۔۔۔۔“ حمران نے تسلی دی۔ ”تو فکر نہ کر جائے گا کہاں، لوٹ کر نہیں آئے گا؟“

”وہ تو ہے ماسی مگر۔۔۔۔۔“

”اگر مگر کچھ نہیں، جانتی ہوں میں کہ تو کیا سوچ رہی ہے، چونکہ بڑی روہ، جب تک وہ نہیں آتا تو آرام سے نہیں رہ اور ٹھیک ہو جائے گی اور وہ لوٹ آئے گا تو پتہ چل جاتا!“ اس کے بعد کلوم کی بحث کرنے کی بجائے، خاموش ہو گئی۔ اسے جواز دینے کی ایسی خوشی نہیں کہلاتا کہ اسے سارے دکھ بچ نظر آ رہے تھے۔۔۔۔۔ کلوم کی ساری زبانیں بھلا کر وہ دل سے خستہ کھی کر ایک بار آ کر اپنے سینے کو دیکھے۔ شاید وہ اس غلطی کا کھارکی کر وہ مدھر جائے گا، جیسے کو دیکھے گا

”تو اس کا دل خود کا دکھ کر نہ کر نہ لوچا ہے۔۔۔۔۔“

”ماسی میں اپنے کھل چلی جاتی ہوں، لیکن ہے کہ وہ وہاں کسی نہ کسی وقت آ جائے، اگر وہ آئے تو اسے کیسے علم ہوگا کہ میں یہاں ہوں؟“

”سارا گاؤں جانتا ہے کہ تو یہاں ہے اور وہ کسی سے پوچھے گا تو اسے علم ہی ہو جائے گا!“ حمران نے اسے ٹھکرا۔

”مگر خالہ۔۔۔۔۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رہی۔

”اگر مگر کیا لگا رہی ہے تم نے؟“

”میں کب تک آپ پر بوجھ بن کر رہوں گی خالہ؟“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، آنسو جو ہر وقت اس کی پلکوں پر ستاروں کی طرح چہرے پر رہتے تھے۔

”آخر میں ہے جیسا شاہاں۔۔۔۔۔ میں تو تمہیں اپنی بیٹی کہتی ہوں اور تم نے بتا دیا کہ تم میری بیٹی نہیں ہو!“ حمران نے تاسف سے کہا۔

”ارے نہیں خالہ۔۔۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے!“ وہ شرمندہ سی ہو گئی اور اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔ ”مجھے معاف کر دیں خالہ اگر میں نے آپ کا دل توڑا ہے!“

”جمل اسیادہ زور سے باز آیاں نہ کر، اس کو وہ وہ پلا۔۔۔۔۔“ ہر وقت چننا چہرے پر بڑا ہے!“ حمران نے بات نہ کی اور اسے اپنے ہمیشہ کے انداز میں ڈانڈا زرتاج اور کلوم کھلکا کر نہیں، جواد بلند آواز میں درہا تھا۔

حمران تو اصل بات جانتی تھی کہ کلوم کو اس کے کسی نئے باز یا بی بی نے صفے میں آ کر کسی تیز دھار آلے سے تل کر دیا تھا مگر یہ بات تو وہ بڑیاں تب نہیں جودہ پھٹنے کی روز سے کھڑے باہر تھیں ہوں، کچھ توجہ کوں کو حمران نے منہ کر دیا تھا کہ جی جی خالہ! کلوم تک نہ پہنچے کہ اس کا دل دکھے گا، جیسا بھی تھا، تھا تو اس کا شوہر۔

☆☆☆

رانی کا غلیظ سا دوجو لوگوں کو کسی بھوت کے مانند دکھائی دیتا تھا۔ لوگ اس سے خوف کھانے لگے تھے اور اس کے سامنے اسے گزرنے اور اپنا راستہ بدل جاتے تھے۔ وہ ہر کسی سے سوال کرتی تھی، چوہدری اکبر علی کے بارے میں لوگوں کو اندازہ نہ ہو گیا تھا کہ اس کا بھرم چوہدری اکبر علی کے کھانے سے ہو گیا تھا۔ قدرت ہی اسے سزا دے گئی تھی، اس کے گرد وازہ رنگ ہو رہا تھا مگر کس وقت اس پر گرفت ہو گئی اس کا علم کسی کو نہ تھا۔

چوہدری شجاع ایسا نہ تھا کہ وہ اکبر علی اور اس کے بھائی بابہ کو اپنے باپ کا خون یوں غصہ کرنے دیتا، اس کے اندر کی آگ بھڑک نہ رہی تھی۔

ٹھیک۔۔۔۔۔ جو کسی کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی اب دوسروں کے رحم و کرم پر بڑی تھی۔ فارغ نے اس کے پورے جسم کو ہی طرح ستا کر کیا تھا، صرف اس کا ذہن کام کرتا تھا جس میں بھی جھوٹے اپنے کتنا ہوں اور کتنا ہوں کی معافی

ملحدانہ لکچر — اپریل 2012ء

129

ہاتھ کا خیال تک نہ آتا تھا۔ کتنے جرائم کتنی سازشیں اور کتنے قتل اس کے کھاتے میں درج تھے مگر اسے ان کا احساس نہ تھا، یہ احساس ہونا اور تیری کو قتل..... اس کے نصیب میں نہ تھے۔

اس کا شوہر جو اپنے باپ جیسے بھائی کے جنازے پر بھی نہ گیا تھا، اسے کوئی ان دیکھا چھٹا دھکے ہوئے تھا، کبھی کسی بیٹھا ہوتا تو اپنے وجود سے کوئی ان دیکھے تھے کچھ کھنکھار لگتا رہتا، یہ تانے کے اس کے وجود سے لپٹے وہ گناہ تھے جن کا کوئی گناہ تھا نہ ان مضموم اور مظلوموں کی آہیں اور چیخیں اسے اس سے نجات دلا سکتی تھیں۔

☆☆☆

کوئی گواہ تھا نہ کوئی بیان دینے والا..... نہ کسی پر کوئی شک ظاہر کرنے والا۔ بظاہر تو یہی کہ دو دوں بھائیوں کے بائیں چھڑا ہوا اور دو دوں نے بیک وقت غار کے ٹینکوں دونوں کے ہاتھوں میں راپا دوڑتے اور انہی کی انھوں کے نشانات پر راپا دوڑ پائے گئے تھے۔ پولیس کو تشفی کے لیے کوئی سراہا نہ تھا۔ آتا تھا کیونکہ جن پر شک کیا جاسکتا تھا وہ اپنے باپ کے قتل کے مقدمے کی جلدی تمام قاتلوں قاتلوں کے مطابق کر رہے تھے۔ پولیس معمول کے سوالات جوابات کرنے کوئی بدووں بھائیوں سے کچھ سوالات کیے گئے اور تلی بخش جوابات کے بعد روانہ ہو گئے۔

”تم نے اپنا کیوں کیا فیسی؟“ جہانگیر نے کسی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”کیا سار کا؟“

”فیسی میں نے جیسوں دس برس کی عمر سے لے کر اب تک دیکھا ہے، میں تمہاری ہر ہر حرکت کا مطلب سمجھتا ہوں..... کاش تم ایسا نہ کرتے؟“ فیسی کے پاس کا اعتراف کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، شہار نے دل ہی دل میں خود کو شاباش دی کہ لالہ نے فیسی کو اس کا ذمہ دار سمجھا تھا، اس پر شک نہیں کیا تھا۔ جہانگیر کیا کرتا، جانتے ہوئے بھی انجان بن گیا اور شہار کو تشفی جتایا کہ وہ جا تھا کہ فیسی کس کس قسم کا بندہ تھا اور کس کس اشاروں پر اس نے یہ کام کیا تھا۔ گاؤں کے حالات اب اس قابل نہیں رہے تھے کہ وہاں رہا جاتا، ہجرت کا وقت آن پہنچا تھا، اب گاؤں کی گدڑی شہار کو سنی سنبھالنا ہی اس لیے اس کے حال پر چھوڑ دینا، بہتر تھا۔

”اصولاً تو تمہیں پولیس کی تحویل میں چلے جانا چاہیے فیسی..... مگر میں اس کا فیصلہ شہار پر چھوڑتا ہوں، ان معاملات کو وہ سمجھے بہتر سمجھتا ہے.....“ جہانگیر نے کہا تو جہانگیر کو اپنا آپ اب محسوس ہوا۔

”اسے ایک موقع دے کر دیکھنا چاہیے لالہ رتی، مجھے امید ہے کہ یہ اس کا آخری جرم ہوگا!“ شہار کی یقین دہانی پر اسے اعتبار نہ رہا، فیسی کو اس کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہ تھا۔

”ماں جی کا خیال رکھنا شہار..... میں بھی آتا جا تا رہوں گا!“

”آپ فکری نہ کریں لالہ رتی.....“ دووں بھائی ایک عمر سے کے بعد ایک دوسرے سے گلے لے رہے تھے۔

”آپ شہار کا خیال رکھیں، اسے بہت بڑا آدمی بنانا ہے، اس کے اخراجات کی فکر نہ کریں یہ سب کچھ کسی کے لیے ہے۔“

☆☆☆

جہانگیر کے دوسرے بیٹے کی ولادت ہوئی تو مدت کے بعد جوہلی میں خوشیاں جاگیں، انہی خوشیوں کے کچ عایدہ تنگ نے رابہ کے کہنے پر ایک اور خوشی کی خواہش کا اظہار کیا۔ امید تو نہ کی کہ وہ مانے گا مگر شاید وہ کسی اندر سے توجہ لے ہو چکا تھا یا ایک سادہ سی تقریب میں شہار کا نکاح کا شکوہ سے گرد یا گیا۔ شہار دس برس سے اکڑ ہو سکتا تھا کرائی مال سے نہیں اور پھر انہوں نے اسے اپنی ممتا کا واسطہ بنا دیا تھا، وہ اپنے باپ کے قتل کے بعد کا ہر وقت دکھ کی کیفیت میں دیکھا تھا، اسے ماں کے پھر سے کسی شہادت کی یہ بات بھی نہ پڑی تھی، چاہا تو اسے کسی نہ کسی سے کرنا تھا۔

ایک دفعہ اس کے دل میں آ گیا کہ وہ ایک بری ہی صورت میں مگر اگلے ہی پل جیسے اس کا ہاتھ خیر لیا لگا۔ ”تم کیا

ہو.....“ باپ کی موت اور ذمے داروں کے احساس نے اسے کتنا بدل دیا تھا۔

اتنا کہ اس نے رابہ کے جردن میں کرنا بھی غلطی کی معافی مانگی، رابہ کا دل تو یوں بھی بہت بڑھا تھا، اس نے اسے برس اس بات کو اپنے شوہر سے بھی چھپایا تھا، اپنے ماموں کا مان کر لکھا تھا۔

”مک شکوہ کا خیال رکھو، وہ بہت دھکی ہے..... اس پر بہت غم ہوا تھا!“ رابہ نے اس سے درخواست کی۔ ”اس کے بچے کو اپنے جیسا نہ بھی سمجھو اسے دھکا دینا، وہ ایک ستم پیچہ ہے جس کا اس کی ماں کے سوا اور کوئی نہیں!“

شہار نے اس کی بات محل سے اُتر کر اور وعدہ کیا کہ وہ ہاتھ شوہر اور اچھا باپ ثابت ہونے کی کوشش کرے گا۔ لاکھ شہار اور مک شکوہ کے ساتھ چھوڑ کر مطمئن ہو کر شہر لوٹے تھے جہاں ایک نیا جہان ان کے لیے ابلی بائیں داکے ہوئے تھا۔

☆☆☆

”اماں جب میں پچھلی دفعہ شہر آئی تھی اور اتھان دے رہی تھی تو اتھان کی ایک نگران مجھے بہت فوراً دیرت سے دیکھ رہی تھیں، بلکہ مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیرا نام کیا ہے اور میرا تعلق کہاں سے ہے۔“ زرتاج ماں کو بتا رہی تھی۔

”ہوئی ہیں شکوں جیسی تھیں.....“ معراج نے بے دھیانی سے کہا۔ ”کئی لوگوں کو یوں ہی عادت ہوتی ہے۔۔۔ خواتین اور ایسے سوال کرنے کی اور میری جورتیں تو یوں بھی جہاں پیاری شکل دیکھی، اس کا اتنا پتہ پچھے بیٹھے جاتی ہیں!“

”تھیں اماں..... وہ ایسی نہیں تھیں اور ماں یاد آ.....“

”کیا یاد آیا.....“ معراج نے پوچھا۔

”وہ پوچھ رہی تھیں کہ خوشحال عمر سے تمہارا کوئی قتل ہے.....“ زرتاج نے کچھ یاد نہ بتایا۔

”چھا.....“ معراج متوجہ ہوئی۔ ”پھر تو پوچھیں اس سے شاید وہاں کی رہنے والی ہو!“

”آپ نے خود ہی تو کہا ہے کہ جانیوں سے زیادہ بات چیت نہیں کرتے!“ زرتاج نے فوراً کہا۔

”اچھا چل اب بائیں چھوڑ دو اور اپنے اتھان کی تیار کی.....“ معراج نے کہا۔ ”پڑھانی ختم ہوئی ہے اب تیری رخصتی ہونے والی ہے!“ زرتاج شہار کے تصور میں کھوئی، جس کا چہرہ اب اسے کتابوں میں نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

”جانی.....“ الماس نے اپنی ملازمہ کو بلایا۔ ”جاؤ راکھان سے چوہے مارنے والی گولیاں تو لیتی آ، اب تو کمر دن میں جابا پوچھے نظر آنا شروع ہو گئے ہیں!“

”آئی شہر کھیر پتاری ہوں، اماں نے خاص طور پر کہا تھا کہ بے پروائی نہ کرنا!“

”تو جانا..... میں دیکھتی ہوں!“ الماس نے اسے اٹھایا اور خود اس بیڑی کی پیٹھ کی تھوڑی دیر میں ہی جالی چوہے مار کر کیوں کا بیکٹ لے آئی۔

”دکان دار نے کہا ہے کہ آئے اور جینی میں ملا کر جگہ جگہ رکھ لیں اور اپنے ہاتھوں کو نہ گتے دیں، بہت زہریلی ہے.....“ اس نے پکٹ الماس کے حوالے کیا۔ ”ابھی اس اور میرے کھیر پتاری دیں!“

”کام میں کر رہی ہوں جانی تو میرے پکٹے تو ذرا مل کر کھماوے.....“ الماس نے اس سے کہا۔

”اماں مجھے جوہلی میں آئی جو انہوں نے آپ کو کام کرتے دیکھا!“ اس نے ہنسی کر کہا۔

”میں کہہ دوں گی اماں..... تو فکر نہ کر، جا جلدی سے میرے کپڑے مل دے، میں کھیر پکا کر چوہے کے لیے کھانا تیار کر دیتی ہوں وہ جگہ جگہ رکھ دیتا.....“ اس کی بات پر جالی کھٹکلا کر گئی۔ جالی کے جاتے ہی اس نے پکٹ کھولا۔

”اماں..... ہر سب نے مجھے بہت دکھایے ہیں، میں جیسے کا نہیں تھیں، کسی کو بھی نہیں، ہم میں سے جو بھی جوانی کی اہلیہ کچھوے کی دھوپے کی طرح دکھوے کی، ہمارے عمر کے تھے اور تیرے کو راکھ کے تھے آج میں سب مل کر کھاتے ہیں.....“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ کھیر میں اس نے اور کسی بھی کا اضافہ کر دیا تھا۔

پالوں میں اس نے کھیر ڈالی، سادہ آنے کی گولیاں بنائیں اور انہیں جالی کے حوالے کر کے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ رات کے کھانے سے پہلے اس نے مصلیٰ بچھایا اور اپنے اللہ کے حضور سجدے میں گر گئی، اپنے ان گناہوں کی معافی مانگنے لگی جو وہ کر چکی تھی اور جو وہ کرنے جا رہی تھی۔

رات کے کھانے کے لیے بلاوا آ رہا تھا، سب اس وقت اکٹھے کھانا کھاتے تھے اور اس کے بعد سب کو کھیر کھانا تھی۔ وہ دسترخوان پر کھانا کھاتے ہوئے کوئی کھوٹی سی تھی، ماں نے پوچھا بھی کہ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ وہ چونک گئی۔ وہ انجانے میں ان سب صورتوں کو دیکھ رہی تھی جنہیں وہ اپنے بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی..... آخری بار..... اس کے بعد اسے یہ سب کہاں دیکھنا تھا۔ ماں اپنے ہاتھوں سے کھیر کے پیالے بھر بھر کر سب کو کھانا دے رہی تھی، اس نے اپنا پیالہ پکڑا اور اس کے ہاتھ ہولے ہولے لرزنے لگے، اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ روک لو..... سب کو روک لو مگر اس وقت دل و دماغ کی ٹھن جنک تھی اور اس میں کون جیتنے والا تھا..... اس کا فیصلہ لمحوں میں ہونے والا تھا۔

☆☆☆

مریم اس روز پرویز کے گھر ہی نہیں بلکہ اس کی زندگی سے بھی نکل گئی تھی، یہ بھی شکر تھا کہ ان کا کوئی بچہ نہیں ہوا تھا ورنہ ایک بے قصور نرس زندگی کو سزا کے مانند بھگتنے آ جاتا۔ پرویز کئی بار اسے ڈرانے دھمکانے آیا مگر وہ اپنے ارادوں میں اٹل رہی، ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے کر اس نے ملازمت کی تلاش کی اور اپنی زندگی کی گاڑی کو کھینچنے لگی۔ باہر کی دنیا میں بڑے بھڑیے اور عفریت سہی مگر جو اللہ کا نام لے کر زندگی گزارنا اپنا مقصد بنا لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔

اس روز کمرہ امتحان میں اس نے جس چہرے کو دیکھا اس نے اسے کھنکھاتے بھرتک نکلتش میں جٹا رکھا تھا مگر چاہا کہ اس کے ذہن میں جھماکا ہوا..... ہاں..... وہ لڑکی ستارہ جیسی لگ رہی تھی..... بغیر سوچے سمجھے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

”کیا تمہارا تعلق خوشحال گھر سے ہے؟“ اسے یاد تھا کہ اس اسٹیشن کا نام یہی تھا۔

لڑکی نے جواب میں خاموشی اختیار کی تو وہ سمجھ گئی کہ وہ لڑکی اس نام کی کسی جگہ کو جانتی نہ تھی مگر اس کی مشابہت حیرت انگیز تھی۔ ”کیا میں اس سے پوچھوں کہ اس کی کوئی بہن.....؟“ اس نے دل ہی دل میں سوچا مگر پھر اپنی سوچ پر اسے ہنسی آ گئی، کیسی عجیب سی بات لگے گی جیسے کوئی کہانی ہو یا ڈراما۔ وہ خاموشی سے پلٹ کر اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ چند من بعد پوچھے گئے سوالات پوچھ لیے جاتے تو حالات مختلف ہوتے مگر قدرت کو معراج سے اس کی کھوٹی ہوئی بیٹیوں کو ملانا مقصود ہی نہ تھا، نہ زندہ نہ مردہ.....

☆☆☆

پورے شہر میں اس خبر کا شہرہ تھا، اس وقت میڈیا اتنا ”باخبر“ اور طرار نہ تھا مگر پھر بھی قائم علی ایک عزت دار آدمی تھا اور اس بات سے بچتا چاہتا تھا کہ اس خبر سے اس کا تعلق کسی بھی طرح ظاہر ہو۔ چند دن قبل ہی تو معراج واپس آئی تھی اور وہ چاہ رہا تھا کہ وہ نہ شہر میں رہے نہ خوشحال گھر میں..... کسی اور جگہ، جہاں ماضی کی یادیں نہ ہوں۔ اس گھر سے اس کا ایسا تعلق تھا کہ وہ خفیہ طریقے سے وہاں گیا، ساری لائیں تدفین کے لیے تیار تھیں، سات پیاری پیاری صورتیں، ان کا اکٹوتا بھائی اور ان کی ماں اور وہ ملازمہ..... جو باورچی خانے میں بیٹھی کھیر سے لطف اندوز ہو رہی تھی، اس کی موت نے تو اس خاندان کی موت کو معما ہی بنا دیا تھا۔ ایک دکان دار نے بتایا تھا کہ وہ چوہے مار گولیاں لینے کے لیے آئی تھی، مگر اسے ان گولیوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا..... کس کو علم تھا؟

آخری لاش کے پاس پہنچ کر قائم علی ٹھنک گیا تھا، چھوٹی سی بچی، معصوم سا چہرہ مگر جس چیز نے قائم علی کی توجہ کھینچی تھی وہ اس کا کفن سے باہر نکلا ہوا ہاتھ تھا۔ وہ ہاتھ اس کے لیے ناامیدی کی ایک علامت تھی وہ معصوم چہرہ..... اتنے برسوں کے بعد



**ساکرہ نمبر ۱**

ہاں میں نے اپنے شاگردوں کو بتایا تھا کہ وہ خوب سمجھتا تھا جس کی پشت پر تلے گرجا کا ٹھکانا تھا۔ وہاں سے اس نے ایک شخص کو بلایا اور اس کی شکل میں ہی اس کی جگہ لی۔ اسی طرح نے ان کی پشت پر چاندی کا تارا بنوا دیا۔ تین تار کے چار چار چھوڑا اور اس نے اس کے ہاتھ پر تارا۔ اسی طرح نے ان کا نام پر ہم نے ستارہ رکھا تھا۔ تلے چاندی کا وہاں سے ہاتھ تھا کہ اس نے اس کے ہاتھ پر تارا۔ ایک ہی اور ایک ایسا ہیچہ کھو گیا تھا۔ دنیائے انسانی نصیب نہ ہوا تھا۔ وہ اس کو اپنے دل میں ہی لے کر کہہ کر ہرج ہرج کیا تھا۔ وہ اسے سچا سمجھا تھا۔ ان دونوں کے مابین عمر کے تین چار برس آئے تھے۔ جنہوں نے ان سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ اب اعتبار اس طرح کا نہیں ہو سکتا تھا، اس کی دوسری شادی درست گواڑ میں رہنما کو بھی اور ذرہ طلاق کا فیصلہ کر بیٹھا تھا۔

۱۱۱۱۱۱

☆☆☆

”میں تم سے کچھ مانگوں شاکر؟“ سعید نے سر جھکا کر اس سے سوال کیا تھا۔

”بھائی صاحب..... شرمندہ کیوں کرتے ہیں!“ شاکر نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں جو بچہ تم سے مانگ رہا ہوں، اگر کہیں برا لگے تو مجھے معاف کرو“

یوں نہ لیں بھائی صاحب! مجھے خود پر شرمندگی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔“

میرنی، بن کو سہارا دے دو تاکہ نہ..... انہوں نے رک رک کر کہا۔ ”اس کی لاوارث بیٹی کو باپ اور تمہاری بیٹی کو ماں مل جائے گی!“

"19.....99"

103.....03

میری بہن بہت اچھی ہے شاکر، اسے قدر کرنے والے لوگ نہیں ملے.....“

”رو بات میں ہے بھالی صاحب“

تھمے اسوں کے شاعر، میں نے تم سے پوچھے بغیر ہی سوچ لیا کہ تمہیں میری اس تجویز سے کوئی اختلاف نہ ہوگا،

”میں نے انکار نہیں کیا.....“ وہ ہکا بکا..... ”اصل میں.....“

”مجھے سہلی نے بتایا تھا مگر.....“ سعد نے کہا۔ ”تم اس سے بات کر لو اگر اس کو پتا ہے۔“ اس نے جوابی کر کہا۔

کھی ہے، تمہارے گھر کے کسی کو نے میں پڑی رہے گی شاکر، مجھے تم جیسا اچھا آدمی کہال سے ملے گا۔“

تتميز بـ

کا ماحول بھی اچھا تھا مگر اتنے عرصے وہاں رہتے ہوئے اس نے کبھی اس نقطہ نظر سے سوچا کہ یہ تو ایک ایسا عجیب و غریب

اورت کا وجود برداشت کر سکے گی؟ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ اسے ناہید کو سہارا دینے پر اعتراض نہ تھا۔

لو کیونکر بھول سکتا تھا، وہ تو جیسے ایک 'سی سا' پر بیٹھا تھا جس پر کبھی کوئی اوپر جاتا تھا کبھی کوئی۔

☆☆☆

لازم میں لے کر اسے پڑھائی پر مجبور کروینا..... اگر اس کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تو اسے کسی اور کام میں لگا دو!“

”کون سا کام ہے جو وہ کرے گا، کہ ان کا کہنا ہے۔“

”وکان مارٹھی کوئی اسے معلوم کا نہیں۔“

نہیں.....“ نینتا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”میں سچ کہہ رہی ہوں!“

”کرن شادی کر لے گی سہیل سے؟“ نینا نے پوچھا۔

”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو اسے منانا میرا کام ہے!“

ایک بیٹھکانے لگ جانی اور کھیل لوائیک ایسی بیوی مل جانی جو کہ

میں نے کہا: "میں نے یہ سب سنا ہے۔"

رے مے کوا

مندی سے دونوں سہیلیاں تھکھکھلا کر ہنسیں اور ایک دوسرے کے

☆☆

”مجھے کسی کے گھر پر کامل رہا ہے.....“ زہرہ نے ا—

”گمروں پر کس طرح کا کام ہوتا ہے، سمجھیں علم ہے تا

لوگوں کے گھروں میں جھاڑو لپٹا کر دی؟“

"بچوں کو سنبھالنے کا کام ہے..... اس نے اُسی سے

جس کو ان کے خوکام ر جانے لگا تو تمہیں کام چھوڑنا ہوگا!“

”جب تم کام کرنے لگو گے تو پھر میں کیوں کام کروں گی؟“

اگلے ہی روز ساتھ والی خالہ اسے ایک قہر میں گھر میں لے گئی۔

کی ماں کے ہاں تیسرے بچے کی آمد آمد تھی۔ کبھی کبھار بچے سو۔

کرتیں کہ اس کی اپنی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ زیادہ کام کر سکتی۔

چھوٹے شریعے جب تک جاگ رہے ہوتے تھے تب تک اسے

سالگرہ منسوب تمام سکون..... میں نے ان کے کیے کی سزا نہیں مہتی ہیں!“

”اچھا بھڑو! سکون سے بتم جاؤ زہرہ بچوں کے پاس.....“

”میں گھر چلی جاتی ہوں!“

”ہرگز نہیں.....“ کلثوم اٹھی۔ ”تم نہیں جاؤ گی، مجھے میرے سوالوں کے جواب دیے بغیر!“

”اپنے سوالوں کے جواب کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا!“ اب زہرہ نے اعتماد سے کہا۔ ”تمہارا بھائی معذور ہو کر سب پر پڑا ہے اور یہی سزا ہمارے لیے کافی ہے۔“ کلثوم بھائی کا نرتو پ بھی اور ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر زہرہ کے ساتھ ہوئی۔

گلے شکوے..... معافی خانی ہوئی اور اس کے بعد تو عباس کے لیے آسانیاں اور خوشیاں تھیں، جس کے لیے گاؤں واپس جانے کا راستہ میل گیا تھا۔ اس نے اپنی بہن کے سر پر پورے مان سے تھوڑا رکھا۔ ”میں اب جا کر تہا رے میکے کے کھر کا دروازہ کھولوں گا!“

☆☆☆

”آپ کو کیوں لگا کہ میرا ظرف اتنا چھوٹا ہے؟“

”مائی سے بات کی تو انہوں نے تو صاف انکار کر دیا تھا!“ اس نے کہا۔

”ان کا اعتراض بھی عجا ئزہ کوئی بھی مال اپنی بیٹی کو دوسرے رتبے کی حیثیت میں دیکھتا پسند نہیں کرتی!“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”تو پھر تم نے کس طرح اس حیثیت کو قبول کر لیا؟“ شا کر نے پیار سے پوچھا۔

”محبت.....“ وہ ہنسی۔ ”مجھے آپ سے محبت ہے اس لیے مجھے آپ کا ساتھ تول تھا اور جس عورت نے اپنا خون سچ کر اس بیٹی کو پالا جو اس کی نظر میں آپ کی بیٹی بھی حالانکہ وہ بیٹی میری امانت بھی آپ کے پاس۔ جس طرح آپ اس امانت کا پاس رکھا اور اس نے پیار سے اسے پالا اسے اپنا دودھ تک پلایا۔ کیا میرے دل میں اس کے لیے کوئی خاص مقام پیدا ہو گا کوئی انہونی بات ہے؟“

”مگر مائی کو کس طرح متا نا تھے؟“

”مائی کو علم ہے کہ جب کوئی لڑکی کسی کو اپنے دل میں بسا لیتی ہے تو پھر اسے پا کر ہی دم لیتی ہے!“

”مائی کو کیسے علم ہوا؟“ شا کر نے حیرت سے پوچھا۔

”مائی کسی بھی لڑکی کی نا.....“ وہ ہنسی، ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

”تم روری ہو کیا؟“ اس نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

”میں کیوں روؤں گی؟“ اس نے پھر سر جھکا یا۔

”تم اپنے کیے پر پشیمان تو نہیں ہو؟“ شا کر نے سوال کیا۔

”ہرگز نہیں.....“ زہرا نے اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ اس کا پیشہ ہی سہی تھا اور اسے علم تھا کہ بہاروں کی سہانی تو کوئی بھی کر سکتا ہے، شیشوں کی سہانی مشکل کام ہے..... غور نہیں جو شیشوں کی طرح نازک ہیں، آ بیجنوں کی طرح چلنوتو جانے والی..... انہیں مردوتو ڈٹا ہے اور وہی جو ڈٹتا ہے مگر یہی شیشوں کی سہانی صنف نازک کے ہاتھوں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ شا کر کی ہاتھوں میں کی اور ساتھ والے کمرے میں ناہید دونوں بچوں کو اپنی آنکھوں میں لیے گہری نیند میں سلا کر اسی رات دو بچوں کو باپ لگیا تھا اور اسے محبت..... جس محبت سے تھکوں ہی سکون تھا اور اس میں رہنے والوں کے دل بہت بڑے تھے..... جن میں دوسروں کے لیے پیاری پیاری تھا..... کون کہتا ہے کہ شیشوں کا سمیٹا کوئی نہیں..... کسی بھارتیہ ہی شیشوں کو جوڑنے کے کام آتے ہیں!

(ختم شد)

## بات تو سمجھ کی کیہ

سکینہ منسرہ

اللہ کے جو بندے اس موجودہ عہد میں پیدا ہوئے ہیں اور زندہ بھی ہیں اگر ان کو تاریخ کی سب سے بہادر قوم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ پتھروں کے زمانے کا انسان تو شاید صرف بھوک، دشمن اور درندوں کے خوف کا ہی شکار ہوا ہو گا مگر اس دور کا.....

الاما ن..... گھر میں بیٹھو تو لائٹ جانے اور کام اچھو رے

رہ جانے کا خوف تو بھی گیس بند ہو جانے کا ڈر.....

سارے دروازے کھل کر لاک کر کے، تازہ ہوا اور

روشنی سے محروم ہونے کے بعد بھی اچانک ڈاکوؤں کے

آ جانے کا خوف نہیں جاتا..... مگر سے باہر نکلے ہوؤں





کی واپسی تک الگ جان سولی پر لٹکی رہتی ہے..... جہاں فون کی گھنٹی بجی یا کوئی کھٹکا دہل جاتے ہیں جیسے موت کے فرشتے کو

گھر سے باہر نکلو تو اگلا دیکھنے لگا کہ کتنی پراگٹ چلنے کے ڈر سے لڑے ہوئے ہیں۔ گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ کتنی سڑکیاں چلنے کے ڈر سے لڑے ہوئے ہیں۔ گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ کتنی سڑکیاں چلنے کے ڈر سے لڑے ہوئے ہیں۔ گھر کے دروازے پر کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ کتنی سڑکیاں چلنے کے ڈر سے لڑے ہوئے ہیں۔

[illegible]

مگر خالہ بی تو خالہ بی ہی تھیں انہوں نے اپنے  
اس خوف کا سید باب کرتے ہوئے ان کے خلاف جو

بھٹھرا راتھائے تو اپنے ساتھ ساتھ باقی کے کھر کو بھی پاس  
ساہا کا دیر دیتے ہوئے خود کا ٹرن بنیں۔ وہ شروع  
سے ایسی ٹھیں اور ان کی طبیعت کی اس نزاکت میں روز  
بروز اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ہزار کوشش کے بعد خود  
یا کھر تو نہ بنیں مگر ایک عدد ڈاکٹر سے شادی کرنے  
میں کامیاب ضرور ہو گئیں۔ اپنے دونوں بچوں کو کوئی  
سے پاک احول میں پالنے کے بعد جب ان کے لیے  
بیویاں ڈھونڈنے لگیں تو ہماری بدستی کے ان کی نگاہ  
انتخاب اپنے دی بھید بہادر کے لیے ہم پر آن رکی۔  
ہم جو شروع ہی سے ان کے کھر جانے سے  
بدکتے تھے۔ اپنی اماں سے سو سو بہانے کر کے ان  
کے ہاں جانا ناں یا کر کے تھے کہ وہاں باندیاں بہت  
ٹھیں۔ اپنے بچے کھر سے براہ راست نہ پڑتے  
تھے۔ کسی چیز کو کھا کھانے کی مطلق اجازت نہ تھی،  
کھانا کھانے سے پہلے ان کی گمرانی میں ہاتھ دھونا سب  
سے زیادہ برا لگتا تھا۔ اماں کی تو بھجوری تھی، ان کی وہ  
کلکتی جتنی میں تھیں، وہ کلیجے پر بھجھر کے کہ اپنی آپا سے  
لٹے چل دیتی تھی۔ ہم تو آزاد بھری تھے۔ جانے  
سے انکاری ہو جاتے۔ کسی خالہ اپنے نوٹریٹر اور نشت  
بکر کو لے کر ہمارے ہاں آتیں تو اور مصیبت.....  
موصونہ ہاتھ باندھ نہا کر نشت کے برابر ہونا  
کونے پر جو تھیں تو پھر وہاں بت بن کے برابر ہونا  
کونے کے نوٹریٹر اور نشت بکر دونوں ناک بھجوں  
بڑھانے دوسرے دونوں میں جاتے تھے ہم بچوں کے  
ہاتھ کھینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان کو ہمارے  
براہم "لگ جاتے تو.....؟

ان کے سوسوٹنے دیکھ کر ہم دانت کچکچا کر رہ گئے۔ دل تو چاہتا کہ انہیں بھانے سے اٹھا کے پیچھے لپکنا۔ لیکن ان کی آنکھیں پانی سے لگی ہوئی تھیں۔ ان کی ہاتھوں کے پالے جا کر دکھا دیے ہیں..... مگر میں اس خوف اس برصورت خیال پر حاوی آ جا تا۔ بڑے بڑے بعد تو ان لوگوں نے آنا ہی چھوڑ دیا تھا صرف

خدا کی کسی ہمارا دیا کرتے تھے۔ یہاں سے اس چلی  
جاتی۔ نہ جانے کب اس آنے جانے میں انہوں نے  
میں شامل کیا۔ ہم نے اشاروں کنایوں میں انہیں لاکھ  
سمجھا کیا کہ ہم سے زیادہ غیر مصطفیٰ پسند اس روئے زمین  
پر اور کوئی نہیں ہوگا۔ مگر میں اپنے ہونہار ہو جانے  
کو ن کوئی ہی ڈکریاں لے کر خدا معلوم اس ادارے کے  
سینے پر موم گندل رہے تھے، لیے ہم سے بہتر اور کوئی  
نہیں لگا۔ انہیں ہماری غلامی آنکھوں یا جتنی چیز سے  
زیادہ ہمارا داکٹر ہو گیا تھا۔ اور ہم اس گھڑی کو کوس  
رہے تھے جب ڈاکٹر کی ڈکری ہمارے ہاتھ آئی  
تھی۔ ہماری ایک نہ چلی اور میں انہوں نے بڑی بہو  
کا درجہ دیتے ہوئے اپنے کمر کی زینت بنا کے چھڑا۔  
ان کے اسپتال فکرا کہ کچھ گوشہ نشین اور فیصل کی بو  
سے آباد تھا۔ ہاتھ رومز میں خوشبودار پتندوں یا  
صاف کی جگہ جراثیم کش مائل ہاتھ دھونے کے لیے رکھا  
ہوا تھا۔

صبح مجھ ہماری اماں جان تو نماز اور قرآن پاک  
 ٹھننے کے بعد ہم سب بھائی بہنوں پر ابرو مگر کے گوشے  
 ٹھوسے میں پھونکیں مار کے ہم سب کو اللہ کی حفاظت  
 میں دے دیا کرتی تھیں لیکن خالدی صبح مجھ سارے کمر  
 میں جراثیم کش ادویہ کا اپسرے کرتی تھیں۔ پھر اپنے  
 زیرِ عمرانی ہاسی سے فینکس کے کب میں بھگو بھگو کر پونچے  
 گلوئی تھیں..... شام میں بلا ناغہ پتھر بار سپرے کا ہونا  
 ضروری تھا جو اتنا زیادہ ہوتا جس سے پتھر توی کر کیا ہر  
 ذی روح کا کھانسنے کا دل نہ جاتا۔

گھر میں پہننے کے جوتے الگ باہر پہننے کے  
 الگ..... گھر میں داخل ہونے والے پر لازم تھا کہ وہ  
 اپنے گندے سندے جوتے باہر لے کر یک میں رکھ کے  
 نئے پیر اندر داخل ہو اور اندر رکے وعلیٰ دھلائے  
 اچرے شمدہ جوتے پہن لے اور ہاں دروازے کے  
 ساتھ کلاش دینین سے ہاتھ دھونا بزرگ نہ ہونے.....

## بات تو سمجھ کی ہے

اب اس کے بعد اسے اجازت تھی کہ وہ کمرہ میں رکے  
 ساز و سامان کو ہاتھ بھی کا سکتا ہے اور جہاں مرضی آ جا  
 بھی سکتا ہے..... خالو مالو تو بے چارے دس برس پہلے  
 ہی جراثیم سے اتنا زیادہ پاک و صاف ہوئے کہ پھر ان کا  
 اس دنیا میں رہنا بہت بھاری ہو گیا اور وہ دراصل عام آباد  
 ہوئے..... دونوں سپوت جراثیم کش مہم کا چلتا پھرتا  
 سلوک ہی تھے اور اب ہماری باری تھی۔ منتظر! اس ماحول  
 میں رہائش پذیر ہونے کا سوچ کے ہماری روح فنا  
 ہونے لگی۔

الحمد للہ مکہ کافی باوصاف پنج وقتہ نمازی ضرور  
تھے مگر جراثیموں کو بھی اللہ کی حقوق ہی عداوت سے ہوئے  
ان سے بے جا محاذ آرائی سے گریز کے فاصلے پر  
کاربند تھے..... مگر مخالف کو کون سمجھاتا؟ شادی کے ڈیڑھ  
دو مہینے تک جب خالہ نے ہم پر ”جراثیم کش“ حربے  
استعمال کرنے کے بعد اچھی طرح فلین کر لیا کہ اب ہم  
جراثیم سے پاک ہو چکے ہیں تو ہمیں اس مگر کی باقاعدہ  
شرعت مل گئی۔

☆ ☆ ☆  
 یکن میں داخل کی اجازت ملی تو ایک نیا استقامت  
 شروع ہوا۔ جیسے اسپتال میں سب سے اہم درجہ پریشن  
 تھیم کو حاصل ہوتا ہے بالکل یہی آئینش اس گھر میں  
 یکن کا تھا۔ یہاں داخل ہونے پر سب سے پہلے ہاتھ  
 دھونا لازمی تھا۔ اس کے بعد وہیں رکے تو لیے اس ہاتھ  
 خشک کر کے ایمرن پہننا ضرور پھر سر کے بالوں کو کوفی  
 سے ڈھانکنا ہوتا تھا..... گویا اس طرح کی تیاری ہوئی  
 جیسے کوئی سرجن اس پریشن کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔  
 سرجن کا تو ہاتھیں لیکن اسنی تیار کرنے کے بعد ہم پر خوف  
 کا جو عالم طاری ہوتا اس میں ہم اکثر کھانا پانے کے  
 ترکیب میں مجبور جاتے۔ ایک دھیر دھیر کانٹے کاٹے  
 ہمیں ایک زوردار چھجک آگئی۔ چھجک نہ مٹتی گویا  
 ملاست تھا۔ خالہ کے چہرے کے بننے بگڑنے زاہد



اور اس پر خوف کے لرزے سائے دیکھ کر ہمیں کسی بھی خوف نہ ہوا۔

اگلے لیے ہم تو بچن سے باہر تھے اور بے چاری خالد بچن میں دھڑوڑ دھڑوڑ کرناں جراثیم کا کل عام کرتی رہیں جو ہماری چھینک کے ذریعے وہاں پھیل گئے تھے۔

نہ جانے خالد کی جراثیم دھشتی کی وجہ کیا تھا اور کتنی برائی تھی یہ تو ہم نہیں جانتے تھے۔ اور نہ ہی یہ بتا تھا کہ خالد اپنے دشمنوں کا کس حد تک قلع قمع کرنے میں کامیاب رہی تھیں۔ البتہ ہمیں یہ اندازہ ضرور تھا کہ مغرب ہم اپنی جان سے جانے والے ہیں۔ بات اگر خالد کی حد تک ہوئی تو شاید کوئی تو ذلک بھی آنا کر شوئی قسمت یہاں ان کے ولی عہد اس معاملے میں بالکل ان کے ہم پل ثابت ہوئے۔ خالد نے اپنا راز اور علم ان ہی پر صرف کر دیا تھا سو جو کر رہ جاتی وہ بیہوشی میں آنے کے بعد وہ پوری کر دیا کرتے تھے، جلدی ہی ہم خود کو ایک خطرناک مریض تصور کرنے لگے۔

خبر بات ہو رہی تھی موصوف کی..... موصوف کا سارا بچپن نہا ہو کے اپنے صاف ستھرے کمرے کی صاف ستھری کرسی پر بیٹھے ہوئے گزارا..... جہاں ان کے پاس کتابوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔ سو کرسی پر بیٹھے کے ہاکی تو کھیلی نہیں جاسکتی تھی اس لیے مجھ پر بھی کدہ بڑھ لکھ کر عالم فاضل بن گئے۔ غیبت تھا کہ خالد نے ان کو اسکل جانے سے نہیں روکا..... اب اسکل کو تو جرائم کش سٹول سے ہٹانا ان کے کمرے میں نہ تھا مگر اپنے بیٹے کو اسکل سے لانے کے بعد یہ شوق پورا کر لیا کرتی تھیں..... اس صاف ستھرے بچے کے لیے انہوں نے ہمیں کیوں تنگ کیا شاید ہمارا خیال یہی تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے ایک مستقل ڈاکٹر کا بندوبست کر رہی ہیں۔ اب ہم ڈاکٹر تو تھے لیکن ڈاکٹر ذرا جراثیم کا تو چو ڈاکن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ایک کاٹنے

دارمقابلہ جس میں کسی ڈاکٹر کو جراثیموں پر فتح ہوتی ہے تو کبھی جراثیم ڈاکٹر کو پچھاڑ دیتے ہیں۔ وہ بے چارے شاید ہم سے اس توقع میں تھے کہ ہم ان کی اماں جان کی طرح ان کا خیال رکھیں گے اور انہیں پہلی فرصت میں اپنی ساری لاکھ احتیاطوں کے باوجود کچھ نہ کچھ کڑو پڑو ہو جائی تھی۔ کبھی ہم ہاتھ دھونا بھول جاتے تو کبھی سینڈل باہر چھوڑتا..... کبھی چھینک آجاتی تو کبھی کھانسی..... اور پھر ایک طویل کچھ..... بہت عرصہ ہم اس صورت حال سے ادب گئے۔ ایک دن ہم نے ان سے کھل کے بات کرنے کی کوشش کی۔

”دیکھو، کیا آپ کو نہیں لگا کہ آپ کا طرز زندگی کچھ عجیب سا ہے میرا مطلب ہے عام لوگوں سے ٹھوڑا ہٹ کر؟“ ہم نے بات کا آغاز کیا۔

”کیا مطلب؟“ ان کی روغن پیشانی پر کئی بل آگئے۔ ان کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ایک خصوصیت ”تک چلنا“ بھی تھی۔

”میرا مطلب ہے صفائی سحرانی بہت اچھی عادت ہے۔ انسان کو اپنا وجود اپنا گھر بلکہ پورا محلہ صاف ستھرا رکھنا چاہیے۔ صفائی نصف ایمان بھی ہے اور ہماری اچھی محنت اور اچھے ماحول کی ضامن بھی.....“ ہم نے زور خطرات کو بروئے کار لا دیا۔

”ہم نے ان کے ماتھے کے بلوں میں سے آدھے غائب ہو گئے مگر چہرہ بدستو سوالیہ رہا۔

”ہم کہنا ہی چاہتے ہیں کہ ہر چیز ایک حد میں ہوتی اچھی کی گئی ہے اور اگر نہ کی آسان ہوتا ہے..... بحیثیت ایک ڈاکٹر میں جاتی ہوں کہ ہمارے اور دوسرے شمار جرائم کو موجود ہیں جن میں سے کچھ نقصان دہ ہیں تو کچھ بے ضرر اور کچھ ہمارے لیے ناکدہ مندرج ہیں..... یہ قدرت کے نظام کا حصہ ہیں۔ ان کے ساتھ ضرورت سے زیادہ مداخلت آسانی کا ہے۔“ ہم نے دہیدہ بے لکھ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ انہوں نے بالآخر منہ سے کچھ کہا۔

”جی کہ گھر اور اسپتال میں فرق ہونا چاہیے۔ آپ کی گھر کو ہر چیز میں صفائی کی طرح جراثیم سے پاک کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہے..... کوئی دی پر اپنی پراؤنٹ چھتے والوں نے عوام کو ایک انجانے خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔ اتنا کہ لوگ دوسرے سے ہاتھ ملانے سے بھی خوف زدہ ہو گئے ہیں کہ نہیں اس کے ہاتھ پر ”مہلک جراثیم“ تو نہیں چپکے ہوئے ہیں۔ مناسب حد تک صفائی ستھرائی اور پا کیزگی بہت اچھی بات ہے لیکن حد سے گزرتے ہیں تو بہت بھرت تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں ہمارا بات؟“ ہم نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

”لیکن آج کل اتنی بیماریاں پھیل رہی ہیں..... اس کا بھی تو سبب بے ضروری ہے.....“ ان کی کمزوری آواز ابھری۔

”کیا آپ ساری زندگی بیمار نہیں پڑے؟“

”ہم نے چار پانچ پڑے۔“

”کیوں؟“ ہاں کیوں نہیں..... بچپن میں تو بہت زیادہ بیمار پڑتا تھا۔ بڑے ہوئے کے بعد کچھ بہتری آئی..... انہوں نے کچھ سوچ کے جواب دیا۔

”اسے ”جراثیم کش“ ماحول میں آپ کو تو بالکل بیماری نہیں پڑتا ہے؟“

”آپ نے ہمیں سوال پوچھا۔“

”جی تو جی نہیں نہ اماں کی سمجھ میں آیا نہ میرے۔“

انہوں نے فوراً کہا۔

”ات صرف اتنی ہی ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک مداخلتی نظام ہوتا ہے جو قدرت کی طرف سے ہر وقت چوک رہتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔ اور یہی سوچیں قدرت تو توازن قائم رکھتی ہے نہ بھلا کچھ ہو سکتا ہے کہ انسان کو ان جراثیموں کے قتل و کرم پر

چھوڑ کے خود بخود مددہ غافل ہو جائے؟“ گزرتو کوئی عرصہ تھا جب ہم اس نظام میں اپنے مطالعہ طرز زندگی کی وجہ سے غفل پیدا کر رہے ہیں۔ اس نظام کو کمزور کر دیتے ہیں۔ جو واقعی خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

صاف ستھرا ماحول، سادہ زندگی اور سادہ خوراک..... اس مسئلے کا صرف سہی ہے۔ آپ خالد کو سمجھائیں..... تاکہ ہم ہم ایک نارمل زندگی گزار سکیں۔“

صاحب بہادری خاموشی اور ماتھے پر ہلکی ہلکی لکیروں کے ساتھ رہا تھا کہ کچھ کچھ قائل ہو رہے ہیں..... ہم نے بھی اتنی ہی ڈونڈ کاٹی بھی اور باقی کا نکتہ دے لیے انھار کھاتہ قطرہ قطرہ کر کے ہی سمندر بناتے ناں.....

☆☆☆

پھر قطرہ قطرہ کرتے ہوئے سمندر تو نہیں بن سکا لیکن شادی کے اس ایک سال میں کم سے کم ایک ہفتا تو بھر ہی گیا۔ یہ سال کیسے چپک چپکے گزرا کہ باقی خیال چلا۔ صاحب بہادری جلد ہی رام ہو گئے مگر خالد کو رام کر کے زیادہ آسان نہیں تھا، ان کی سوچ کو بدلنے کے لیے جو پڑا بیٹا بڑے وہ ایک الگ کہانی ہے۔ لیکن ایک ڈاکٹر کچھ کچھ نفسیات دان بھی تو ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا فائدہ حاصل تھا۔

رفتہ رفتہ کر کے خالد کی خوف ختم تو نہیں ہوا لیکن قدرے کم ضرور ہو گیا۔ وہ ملنے والوں سے ڈاکھ ملانے لگیں، اکثر بازار میں چلی جاتیں یہ اور بات کہ گھر آکے ابھی طرح نہا نہیں مگر ان کا گھر سے نکلتی ہی بڑی بات تھی۔ خالد بھی تھیں بلیاں گھر کے ماحول کو تبدیل کرنے کا سبب بن گئیں۔ صفائی ستھرائی تو اپنی جگہ تھی کہ وہ تو ضروری ہے لیکن جو گھر فردت جراثیم کش دواؤں کی بدولت کے پراثر ہوتا تھا اب انفریڈیکٹر اور پھولوں کی تازہ خوشبو میں بسا رہنے لگا۔ ساری احتیاطیں اپنی جگہ درست لیکن وقتی محنت کی تو بہت ضروری ہے۔ ہماری شادی کو پہلا سال مکمل ہوئے تو گویا اور

ایزوری سے تین دن قبل ہمارے مٹے میاں دنیا میں تشریف لے آئے۔ خالکی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ خوش تو مٹے میاں کے باپا اور بچا چڑھی بہت تھے۔ چاچو کی تو بیٹی بیٹے بھرے نکل ہوئی تھی کہ مٹھڑے بپان کے سہرے کے پھول بھی کھلنے کو تھے، بس مٹے میاں کا انتظار تھا کہ وہ بھی دنیا میں آجائیں اور چاچو کی شادی میں شریک ہوں۔

”چلو بھی اسپتال سے جلدی چھٹی کرواؤ۔۔۔۔۔۔ مگر چلو۔۔۔۔۔۔ یہاں تو نہ جانے کیسے کیسے لوگ آتے ہیں اور بچے کو ہاتھ لگاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ نہیں بڑا ٹھم لگ گئے اور بیمار پڑ گیا تو۔۔۔۔۔۔“ خالد دوسرے ہی دن لوگوں کے آنے جانے سے بیزار ہو کے یوں اور ہمارے گرد خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔۔۔۔۔۔ یہ ٹھیک تھا کہ خالد کافی بدل چکی تھیں مگر میری اگر پرانا مسئلہ عود کر آیا تو بھلا ہم کیا کر لیں گے اور اب تو ان کے پاس مضبوط ہوازم بھی ہوگا۔ وہ مٹے کو ”ہریشیوں“ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش پھر سے نہ شروع کریں۔؟

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما ویسے بھی ہماری شادی کی سالگرہ ہے صبا کا کھر پھوٹا تو بہت ضروری ہے۔“ میاں صاحب نے شوقِ نظروں سے ہماری جانب دیکھا۔

”ہاں اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم سے باسط، جلدی کرو اور گھر چلو۔“ دو فوراً بولیں۔

”ہوسکتا ہے کل تک چھٹی ہو جائے۔“ باسط نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”نہیں سچی کل نہیں۔۔۔۔۔۔ آج ہی۔۔۔۔۔۔ خدا معلوم یہاں کون کون سے سنت سنے گراٹھ موجود ہوں گے۔ تم نے سنا نہیں کل اسی اسپتال کی مرن کیا کہہ رہی تھی۔“

وہ پریشان کن لہجے میں بولیں۔

”کیا کہہ رہی تھی؟“ باسط بھی پریشان ہو گئے۔

”ارے یہی کہہ رہی تھی کہ جلدی چھٹی کروالیں۔۔۔۔۔۔ اسپتال میں تو اتنے مریض ہوتے ہیں اور بچے ہمارے اقسام کے انٹیکشن بھی سبیلے ہوئے ہیں، چھوٹے بچوں پر تو ذرا ایک ہو جاتا ہے، یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اب کچھ نئے قسم کے انفیکشن بھی دیکھنے میں آ رہے ہیں جن کا کوئی ریکارڈ ہی نہیں ہے، کوئی کہتا ہے کہ امریکا جراثیموں پر تجربات کر کر کے کتے جیسے گھبراہٹ میں پھیلا رہا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ نئی اقسام کے گراٹھ مریض سے زمین پر وارد ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔ اے لو بھلا تاؤ۔۔۔۔۔۔ اب ان کا کیا کریں جو کم جنت منڈیل سے مریض نہ ان پر کوئی ایسی باونک اڑ کرے۔“ خالد بی ہول کے بولیں۔

”خالد پریشان نہ ہوں۔۔۔۔۔۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔۔۔۔۔۔ ہم نے انہیں دلا سا دیاد وہ حیران ہو کے ہنس دیکھیں گیں۔“

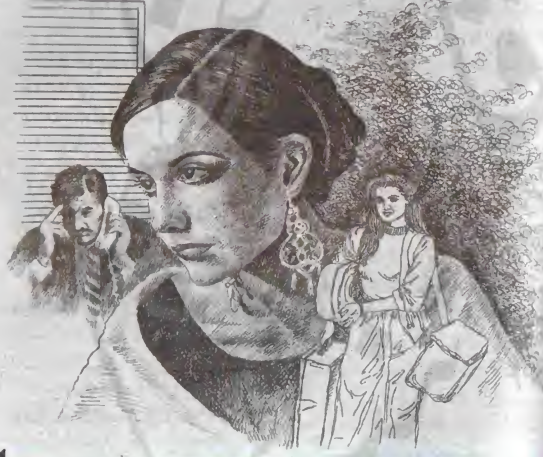
”خالد کچھ باتیں صرف اللہ پر چھوڑنے والی ہوتی ہیں۔ یہ نئے دور کا پچہ ہے۔۔۔۔۔۔ نئے دور کے ہر چھٹی کا مقابلہ کرنے کی طاقت اسے اللہ ضرور دے گا۔“ ہم مسکرائے۔

خالد بی کے چہرے پر بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی اور صاحب بہادر تو دیکھ ہی اپنے ولی عہد کی طرف رہے تھے جس کے چہرے پر ایک معصوم مسکراہٹ کے ساتھ امید کی چمک بھی تھی۔ ہرگز رتا تھ، ہر دن اور ہر سال کا آغاز ایک نئی امید کی نوید تو دیتے ہی ہیں اور ہر نئی زندگی بھی اس چیر کی گواہ ہوتی ہے کہ خدا انہیں اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔ اور ساتھ یہ بھی کہ جس ہمتی نے تو اب تک ماں کے پیٹ میں اس وجود کی حفاظت کی ہے جہاں تک رسائی کے لیے خود ماں بھی بے بس ہوئی ہے۔ دنیا میں لانے کے بعد بھی اس کی فتنے ہی کا۔۔۔۔۔۔ کرب کچھ ایسی ہی مرضی کے تابع ہے، بات تو صرف کچھ کی ہے۔

۳۸

## البیڑ

عمر احمد



جاتی ہوں۔

فلزہ ابراہیم اور رضاحیات خان۔  
میں نے ان دونوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور ایسے دیکھا ہے جیسے کسی نے نہ دیکھا ہوگا اسی لیے آج میں ایک بات کہنے کے قائل ہوئی ہوں۔ وہ بات جس کو میں ہمیشہ چھپاتی تھی کہ شہک کا فائدہ ہر

۱۴۱۲ھ بمطابق اپریل ۲۰۱۲ء



ایک کوئین دینا چاہیے۔ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے اور جب وہ حد پار کر لی جائے تو اس اصل سافلیٹ کو شک کا فائدہ نہیں دینا چاہیے۔ اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا کرتے اور جو یہ کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ بہت فائدہ کھاتے ہیں۔ ہماری یہ کہانی قریباً سال پہلے پبلشر سے شروع ہوئی تھی جب میں اپنے سائزر کے پہلے روز سائیکا لوبی کی کلاس لینے کو گئی۔

☆☆☆

میں نے زندگی میں کبھی اپنا تجربہ ڈراپ سائیکس نہیں دیکھا تھا جو اس روز کلاس میں چھاپا تھا گردنیں سحر زدہ سی انٹکس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جو ہمارے سائیکا لوبی کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر..... جو وہ کہیں سے نہیں نکلتے تھے میں بھی اس سحر ہوئی اکثریت کے ساتھ گئی اور ان سب کی طرح میں بھی کچھ نہیں لکھ پاری تھی۔ ٹوئس لینے کا ہوش ہی کے تھا۔ وہ تھے ایسے شخص کہ جن کے سامنے گھر بھری نہ گئی۔

وہ روز پھر پکڑے۔ اپنے تجزیہ و انداز میں پکچر دے رہے تھے۔ نیچے نقش و صورت آکھیں، صاف رنگت، جیل سے پیچھے بے بال، قیمتی اور نفیس ایلٹ گرے ٹوئیں میں لبوس، وہ بلا کے پنڈم تھے۔ صرف وہ جانت تھیں ایک اور شکل بھی ان کے اندر تھی جو قابلِ گواہی دے مگر گواہی نہ دے۔ وہ کدو کی جھلی تھیں! کوئی نام نہ نہ دے سکی۔ بس کوئی متناسطی اثر تھا جو ان کے گرد پھیلا تھا اور اس متناسطیت سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ کلاس ختم ہوئی تو سب کے لبوس پر ایک ہی نام تھا۔ سر رضا حیات خان۔

اس روز مجھے پہلی پروفیسر رضا کا نام معلوم ہوا تھا۔ وہ جیک تھے، اسٹارٹ تھے اور ان کی جس مزاح بہت زبردست تھی۔ ان کے نیچر میں کوئی پور نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ ان کی شخصیت کا فنون تھا اور کچھ

کمال گفتار، وہ اپنے موضوع پر مکمل عبور رکھتے تھے اور وہ بھی لا جواب نہیں ہوتے تھے۔ ان سے پوچھتے جانے والے ہر سوال کا جواب سائل کو ہمیشہ بروقت ملتا تھا۔ عمر میں وہ زیادہ نہ تھے۔ انم لکھیے ہوئے بھی انہیں زیادہ عمر عرصہ نہیں لگا رہا تھا اور یونیورسٹی سے وہ پائی برس سے شکست تھے۔ ہم تو ان کے رستار بن ہی گئے۔ ہمارے سینئرز کا تو اور برا حال تھا۔ پورے ڈیپارٹمنٹ میں اگر کسی کا چرچا تھا تو وہ سر رضا تھے۔

ان سے میرا باقاعدہ تعارف ان کی دوسری کلاس میں ہوا جب انہوں نے تمام طلباء سے اپنا نام بتانے کی درخواست کی۔ جب میری باری آئی تو میں قدرے الجھ کر کھڑی ہوئی۔ ”سر میرا نام علیدہ داؤد ہے۔“

انہوں نے جواب مجھے ہلکی بزمی سرکراہٹ دی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ واپس نشست پر بیٹھی۔ ان کی وہ سرکراہٹ میری متاعِ جاں بن گئی۔ وہ میرے لیے سرکرائے، میرا نام اس سرکرائے..... مجھے لگتا تھا میں بھی اس لمحے سے نکل نہیں سکوں گی۔ مگر میرا دل..... اچھی اور بہت سے لمحے آئے تھے۔

☆☆☆

اس روز باہر زردوں کی بارش ہو رہی تھی اور اندر ہماری کلاس جاری تھی۔ آج وہ سائیکا لوبی سے ہٹ کر بات کرنے کے موڈ میں تھے اور ہم سحر لوگ تہ بند آنکھوں ان کی بھڑکیا کرتے تھے۔

”کون بتائے گا کہ انسان کی شناخت کن چیزوں سے ہوتی ہے؟“ وہ چہرہ قدرے جھکا کر مایک میں بولے تو بہت سے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے۔

”انسان کی شناخت اس کے نام سے ہوتی ہے۔“

”اس کے ملک سے۔“

”قبیلے یا ذات سے۔“

”رسم و رواج سے۔“

”نوابان سے۔“

”اس کے دارکاری خصوصیات سے۔“

”کسی اچھے باپ سے کہانے سے۔“

وہ مسکرا کر ایک ایک کی سنتے گئے۔ دفعتاً میں نے اپنا کمر در ساتھ بلند کیا جانے اتنے لوگوں میں

اٹھ میرا اچھا کہاں سے نظر آ گیا۔

”جی علیحدہ داؤد..... آپ بتائیں، انسان کی

لپائی شناخت کس شے سے ہوتی ہے؟“ بہت سی

گردنیں میری جانب گھومیں، میں نے بیشکل تحوک

الکاب کے سامنے بولنا میرے لیے ہمیشہ دشمن رہا تھا

مگر پروفیسر رضا کی بہت افزا سرکراہٹ میرے اندر

نی لڑی چھوٹ گئی۔

”د..... دین سے۔“ میں ہکا کر بولی تو ان کے

ہارے پر چمک سی گئی۔

”فائنلی علیحدہ نہ وہ بات کہی ہے جس کے سننے

کا میں شہر تھا۔ ہم شناخت کے معاملے میں دین کو

کے اسکپ کر سکتے ہیں؟ دراصل یہ سوشل سائنسز کا

ایک اہم سوال ہے کہ جب ہم انسانی شناخت کی بات

کرتے ہیں تو دین کو کیوں بھلا دیتے ہیں؟“ وہ اپنے

لاہور پر پیش انداز میں ہاتھ ہلا کر کہہ رہے تھے اور

میں بس اس ایک فقرے پر ہی ٹھہر گئی۔

”فائنلی علیحدہ نہ وہ بات کہی ہے جس کے سننے

کا میں شہر تھا۔“ باہر کرنی بارش کے قطرے میرے

دل کو جھگولنے لگے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا میں ابھی رو

اؤں گی۔

میں وہ جی جیے جو ہم تو کیا دلوگوں میں بھی

کڑی ہوں تو کوئی نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ چہرے پر

لہر چنے، بڑھائی دالی چادر اوڑھے، میں بے حد

معمولی شکل کی لڑکی تھی..... اگر کوئی میری موجودگی کو نوٹ کرتا تھا تو شاید میری..... بیسیا کے باعث جس کے سہارے میں چلتی تھی۔ ایک حادثے میں کئی برس قبل میری داہلی ٹانگ مفلوج ہو گئی تھی اور اب میرا واحد سہارا میری بیسیا تھی۔ ایک مکمل معذور لڑکی کو کسی نے مجھے بھروسہ لگائی کہ انہوں نے نوازا تھا، میں خود کو دلوں میں تیرتا سمجھ کر رہتی تھی۔

شام کو جب میں اپنے کمرے میں لیٹ چلی تو خود سے باتیں کرنے لگی۔ ہر شخص خود کو لای کرتا ہے۔ جو کہتا ہے کہ وہ خود کو لای نہیں کرتا، وہ جھوٹ بولتا ہے، تمہاری میں، میں نے بھی اپنی ایک دنیا بنا رکھی تھی، جہاں میں معذور اور مکمل شکل نہ تھی۔ جہاں میری جنگ اور تہ لپک نہیں ہوتی تھی اور جہاں مجھے کوئی احساس کمتری نہیں ہوتا تھا۔ رہا اس دنیا میں میں علیحدہ داؤد نہیں تھی۔ میں اپنا لایا درگم۔ یہ اپنا ہی خود کو سننے کا ہی دیا تھا۔ یہ نام مجھے بہت پسند تھا۔ اپنا نام بدلنے کا اختیار نہ تھا مجھے اگر ہوتا تو میری علیحدہ داؤد کے ساتھ میرا وجود بھی لگا ہوں کے سامنے گھوم جاتا تھا اور میں خود کو کبھی اپنا کا نام نہ دیتی۔

اپنا بہت خوب صورت تھی، بے تحاشا امیر اور شاہی خاندان کی اکلونی اولاد۔ باپ کے اربوں کے برسی کی اکلونی جاشین اور یونیورسٹی کے ہراسٹوٹ کے دل کی دھڑکن دینے کا جب۔ وہ جب چلتی تھی تو لوگ سحر زدہ سے ٹھہر کر آتے دیکھتے تھے۔ اس کے حسن، ذہانت اور دلالت کے قصے ہر جگہ پھیلے تھے۔ وہ راجہ حسانی کی شہزادی کی اور اس جیسا کوئی نہ تھا۔ اماں کی آواز آئی تو میں چوکی بھر بیسیا سے خود کو کھینچ کر آئی۔ اماں کی آواز ہوئی اگلے کمرے اور گرد حیرت سے ”اپنا لایا“ کے مستر کے بلبلے میں چھ کر آئے پھاڑا کر رہی تھی۔

”جی اماں! میں نے کچن کے کٹلے روزانے



سے بھاگنا۔ وہ رنگ کے سامنے کھڑی  
بہن تو دھوری تھیں۔ آواز پھٹیں۔

”تمہارے ماموں آئے تھے آج پھر کرایے کا  
تقاضا کر رہے تھے۔ کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔“ ان  
کے چہرے پر پریشانی رقم تھی۔

ہم جس گھر میں رہتے تھے اس کا کرایہ باقاعدگی  
سے ماموں کو ادا کر دیتے تھے کہ نانا کی ملکیت تھا اور  
ان کے بعد اب ماموں اس کے مالک تھے۔ اماں کی  
بہو کی کے آغاز کے چند برسوں میں جب میں بہت  
چھوٹی تھی ماموں نے ازراہ بددعویٰ ہمیں اس گھر میں  
مفت رہنے دیا تھا۔ (جب وہ خود بھی اودھ ہی مقیم تھے۔  
ایف سکس والے نے گھر میں شفٹ ہوئے تو انہیں  
پانچ، چار، برس ہی ہوئے تھے) بعد ازاں وہ ہم سے  
گرایہ وصول کرنے لگے اور اب وہ ان چند مالوں کی  
مفت کی رہائش کا کرایہ بھی سکر رائج الوٹ کے بیانیے  
پر طلب کر رہے تھے۔ ابو کی چھوڑی دو دوکانوں کے  
کرایے سے ہمارے گھر کا خرچ، مکان کا کرایہ اور  
میری تعلیم کے اخراجات پر مشکل پورے ہوتے تھے۔  
اب یہ اضافی خرچ کہاں سے لاتے؟

کوئی اوروں ہوتا تو میں اماں کو کٹلی دیتی مگر آج  
میں خود بھی خاموش ہو گئی۔ شاید میں ذہنی طور پر اماں  
کے پاس جن سکن ہی نہیں بلکہ کسی ایک تک کلاس روم  
میں کی۔ جہاں بارش کے ترانے گزرتے قطرے بند  
کھڑکیوں کے شیشوں پر لٹک رہے تھے۔ اماں کافی  
دیر اپنے مسائل کا رونا روتی رہیں مگر جب میں خاموشی  
سے غلام گھورتی رہی تو وہ جھگٹ خود ہی اپنے  
کاموں کی جانب پلٹ گئیں۔

ایک روز میں کلاس کے بعد لاہری میں بیٹھی  
بڑھ رہی تھی جب مجھے سامنے کھڑے ایک ریک کے  
چیمے سے مدھم کی آواز سنائی دی۔ ویسے لاہری طور  
میں ان کی جانب متوجہ ہوئی۔ وہ اور کی نہیں بلکہ

پروفیسر رضا کی بیوی آوازی تھی۔

”آپ روٹیں مت، آپ رہیں ہو جائے گا، میں  
کہہ رہی ہوں کہ ہو جائے گا۔“ میں نے زکون ذرا سی  
ترجمی کی۔ وہ ایک ریک کے عقب میں کھڑے ہاتھ  
اٹھا کر کسی کو کٹلی دے رہے تھے۔

”سر آپ رہیں نہیں ہو سکے گا، ڈاکٹر نے آج کی  
آخری تاریخ دی تھی۔ میری بہن مر جائے گی، مجھے  
کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ وہ زندگی آواز میں یوں ڈورین  
تھا۔ میرا کلاس فیلو، میں نے سنا تھا اس کی بہن کی کوئی  
بیماری تھی۔ وہ سب سے بڑی ہوئی ہے، ہمیں وقت ہی نہیں ملا کہ  
مزید تفصیل پوچھتی۔ دینے بھی میں ان شریف لڑکیوں  
میں سے تھی جو لوگوں سے متعلق نہیں ہوا کرتی تھیں۔  
”اچھا روم نمبر کیا ہے اس کا؟“ وہ اس کے  
شانے پر ہاتھ رکھے اپنے اڑنی نرم انداز میں پوچھنے  
لگے۔ ڈورین نے روم نمبر بتایا اور سر جھکانے آیا، گھمک  
کنارہ انگلی کی ٹوک سے پوچھا۔ میں نے دیکھا،  
پروفیسر کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں،  
میں دھیرے سے سر جھٹک کر پڑھنے لگی مگر اب کتاب  
کی طرف ذہن کہاں متوجہ ہونا تھا۔

یہ مشکل تین دن گزرے تھے کہ مجھے ڈورین  
کیکس میں سے ایک جگہ بیڑھیوں پر بیٹھا نظر آیا۔ ساتھ  
اس کے دو تین دوست بھی تھے۔ اور وہ کسی بات پر  
ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس رہے تھے۔ مجھے ذرا اچھٹیا ہوا  
مگر خیر۔ میں سر جھکانے، بیٹھا سہی سے خود کو گھٹنی  
ان کے قریب سے گزر رہی تھی جب ڈورین کے  
دوست کی آواز میری سماعت سے نکل گئی۔

”بہت مبارک ہو ڈوری، میں گھر پر آئی  
کہ مبارک باد دے بھی آؤں گا۔“

”ہاں یار! میں بتا نہیں سکتا کہ کتنا مسکون  
ہوں۔“ ڈورین کے چہرے پر بچی بچی شگرت تھی۔  
”ارے ہاں، کچھ پتا چلا کہ آپ رہیں کی ہے مسئلہ

کس کی تھی؟“

”نہیں..... مگر وہ جو بھی تھا، فرشتہ تھا میرے  
لیے، اللہ اسے اجر دے۔“ اور اس نے دور جا کر  
ہوئے میرے کیوں سے بے اختیار نکلا  
ٹھا۔ ”آمین۔“ ڈورین جیسے نہ جانتا ہو مگر میں جانتی  
تھی کہ وہ کون تھے۔

☆☆☆

کچھ بدلتے موسم کا اثر تھا اور کچھ میری نازک  
طبیعت، مجھے ایسے نزلے زکام نے گھیرا کہ میں تین روز  
تک بیٹھ کر نہ کھانسی۔ چوتھے روز جب کلاس میں گئی  
تو طبی زکام کی بات بات بانی تھیں۔ کچھ کے اختتام پہ  
جب میں کلاس سے نکلی تو رضا حیات خان کا ریڈیو  
میں جیسے کسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ایک لمبے  
لمبے اس پر رش آیا جس کے انتظار میں وہ تھے۔ ان  
لوگوں کے انتظار نے اس نا معلوم شخص کو متحرک کر دیا  
ٹھا۔

”علیہ داؤد..... کوہر تھیں آپ؟ میں آپ کا  
نہ انتظار کر رہا تھا۔“ میں ان کے قریب سے گزرنے  
کی توجہ مکر کر میری طرف بڑھے۔ میں ٹھٹھک کر رک  
گئی۔ وہ میرا انتظار کر رہے تھے؟

”سچ..... جی پروفیسر؟“ میں سانس روکے  
اٹھ کر دیکھنے لگی۔ وہ میرے بالکل سامنے آ کرے۔ ان  
کے شاندار وجود سے کسی چیٹی پر نفوس کی سمجھ کر ہبک  
اٹھ رہی تھی۔

”تین دن کو کھڑے غائب رہیں؟ میں تو پریشان  
ہی ہو گیا تھا۔“

”مم..... میں ذرا..... وہ فلو ہو گیا تھا۔“  
”اوو..... اپنا خیال رکھا کہ اسٹوڈنٹ کو پتہ

نہیں پڑنا چاہیے اور اتنے براحت اسٹوڈنٹ کو تو ہرگز  
نہیں..... وہ منکر آ کر دھیمے لیے میں کہہ کر پلٹ گئے.....  
اور میں علیہ داؤد اپنے رستے جیلے میں متعین فضا

## پاکیزہ سالگرہ مبارک

تیرے یوم ولادت پر  
میری مسکان کھنسی ہے  
تجھے ایسی بہت سی اور بھی خوشیاں مبارک  
تیرے سب سے حلی پر  
لکھا کتب ”پاکیزہ“

میں بڑھتی ہوں تو پھر میرا

تخیل گدگداتا ہے

تیرے اندر کھنسی

مجھے محفوظ کرتے ہیں

تیری خیزلیں تیرے نغے

میرے اندر کے احساسات کو بھیر کر تے ہیں

تیرے اقوال افسانے

میں پڑھتی ہوں تو پھر خود کو

نئی باتیں یاد ہیں

ادارت سے تیرا نقش کھن جو یاد رہتا ہے

میری جانب سے تجھ کو

تیرے کان کا مجلس کو

شام کے بلوغت کا

سعادت مند لمحہ

ڈول سے مبارک ہو

شاعرہ سیدہ شاہدہ ہارون آباد پنجاب

میں تیرے لگی.....

ڈورین کہتا تھا کہ وہ فرشتہ ہے، مجھے لگا تھا وہ  
کوئی یونانی دیوتا ہے جو آسمانوں سے اترا ہے مگر شاید

وہ اس سب سے بڑھ کر کہہ سکتا ہے۔ وہ ساتر تے۔  
کے ایک اشارے پر پل کھاتی رسیاں ساپ بن جاتا

کرتی تھیں اور مجھے سحر کہاں آتے تھے؟  
ان دنوں مجھے لگا تھا کہ دنیا میرے جیلے کے  
آس پاس نہیں گھل گئی ہے، سب تپا ہو چکا ہے اور

رضاحیات خان کی کلاس کا انتظار انہیں ایک نظر دیکھئے، ان کی ایک مسکراہٹ حاصل کرنے کا انتظار اور پھر کلاس کے اختتام کے بعد اگلے روز کلاس کا انتظار شروع..... کبھی وہ مجھے دیکھتے، کبھی مسکراہٹ دیتے اور کبھی وہ اپنے ارد گرد لگے جھنجھے میں اتنے مصروف ہوتے کہ انہیں میں دکھائی نہ دیتی۔ وہ دن میرے لیے بہت اذیت ناک ہوتا تھا۔ جب ان کی نگاہ میری جانب نہ پڑتی۔ اس دن مجھے کچھ کی اچھا نہیں لگتا۔ میں عجیب بیزاریت کی لپیٹ میں رہتی۔

وہ دبیر کا ایک سرودن تھا جب میں اس کے ساتھ کسی کام سے شاہین کیسٹ تک آئی۔ دوکان کے سامنے سڑک پر خاصا سرد تھا اور ہجوم بھگدوں پر مجھے خوف آتا تھا۔ میں اپنی بیسٹھی کے ہمارے خود کو بستی فٹ پاتھ پر چلتی چارٹیجی جب مجھے سڑک کے دوسری جانب ایک منظر دکھائی دیا۔

ایک جھٹک، ایک گمان..... میں چلی وہ بلاشر رضاحیات تھی۔ اپنے مخصوص طبع سے ہٹ کر وہ جنز اور جیکٹ میں بیسٹھ کر کتارے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا شخص بھی تھا جو آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے سفید اسٹیک پلاے، ہاتھ بولتا ہوا ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے رضا کو کچھ بھجھا رہا تھا۔ رضاحیات میں سر ہلاتے اسے بخورن رہے تھے پھر وہ اس عمر رسیدہ شخص کا ہاتھ تھام کر آئے اور احتیاط سے دو طرفہ بستی ٹریفک کے درمیان سے گزرتے اسے سڑک پار کرنے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں سڑک کے اس طرف پہنچے گئے۔ بوڑھے کوڑی سے کچھ بھجھا کر، اب وہ جانے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ وہ عمر رسیدہ بیانیٹھس دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں دعا دینے لگا۔ رضا بہت نمون، بہت شرمندہ سے واپس لے۔ میری نگاہوں نے اس وقت

تک ان کا تعاقب کیا جب تک کہ وہ واپس اپنی کلا میں نہ بیٹھنے پھر میں مسکرا کر ہولے سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

کہاں ہوتے ہیں آج کل ایسے لوگ؟ ☆☆☆  
”شک کا فائدہ ہر ایک کو دینا چاہیے۔ میں اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ کیا آپ ہیں؟“ کلاس میں سکوت چھایا تھا اور وہ اپنے ازلی محرکین انداز میں بوجھ رہے تھے۔ ہر ذی نفس خاموش، ساکن بیٹھا رہا کسی کو ان سے اختلاف نہیں تھا، سوائے میرے۔  
”میں ہوں۔“ میں نے اپنا کمر دو ہاتھ فغان میں بلند کیا۔ وہ دروازے کے شایہ حیران ہوئے تھے۔  
”علیہ داؤد؟“ وہ جیسے یاد کر کے بولے۔  
”ہمارے بیسٹھ سے براہت اسٹوڈنٹ اس بات سے کیوں متفق ہیں، ہمیں باتیں پلیز؟“

یہ مبالغہ آرائی تھی، میں بہت اوریجینل طالبہ تھی اور یہ بات سب جانتے جانتے معلوم نہیں وہ کیوں مجھے اسی اہمیت دیتے تھے۔ یا پھر وہی دیکھ کر جو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ”مگر کلاس میں بھی دینی دیکھ رہی ہوں۔“  
”مگر خیر خیال ہے کہ کہ فرض کو شک کا فائدہ دیا جانا چاہیے اگر آپ نے کچھ آنکھوں سے دیکھا یا نہیں دیکھا تو بھی سمجھائی کے کیو فوراً مورد الزام ٹھہرانے کے اسے شک کا فائدہ دے کر بری الذمہ قرار دینا چاہیے۔“

”آپ کو لگتا ہے علیہ کہ آپ کا یہ آرگومنٹ کن جگہوں پر اپلائی ہوتا ہے؟“ ہال میں خاموشی چھائی تھی اور وہ ڈاکس پہ کہنیاں رکھے پوری تنہی کی سے میری جانب متوجہ تھے۔ اوہ دھنیا، وہ کتنے ہیڈ

تھے۔ ہر اس جگہ پر جہاں کسی انسان پر ہمیں کسی گناہ، شک ہوتا ہے۔“

صرف انسان؟“ وہ ہولے سے مسکرائے۔ میں کمرے کیڑی ہوئی۔  
”آف کورس، ہم انسانوں کی ہی تو بات کر رہے ہیں۔“  
”تم آپ نے گناہ کا ذکر کیا تو گناہ ایک اور فرق سے بھی مراد ہوتے ہیں۔“ میں الجھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ جانور، درندے، پودے، حشرات الارض میرے ذہن کے پردے پر ایک ایک کر کے کئی آتے آتے گئے۔

”جنات!“ میری خاموشی پر انہوں نے کہا تو ہمارے ہال میں ایک عجیب سنسنی کی رودہ گئی۔  
”جنات؟“ میں ہولے سے بڑبڑائی۔  
”جی ہاں، جنات..... اور یہ جو بیک پیچجر ہیں ان کو نہ بتانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، میں یہاں آپ کو کوئی ہار اسٹوری نہیں سنانے لگا۔“ ان کے ہمارے کا تاثرات جیسے ہی بحث ہوئے آخری نشستوں پر بیٹھے سارے لڑکے تیری طرح سیدھے ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں جگہ جگہ ہڑٹنے لگی۔

”جو علیہ داؤد اگر گناہ کی بات ہے تو کیوں نہ بات کا ذکر کیا جائے؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر پھر رہے تھے اور مجھے لگتا کہ میں غلط ہاتھ لے لی ہے۔

”ہزاروں برس پہلے ایک جن ہوا کرتا تھا، ابو الہن، جنات کا باپ۔ اس کا نام عزرا زیل تھا۔ وہ انسانوں کا سردار تھا۔ یہ کرم تھا جرم تھا۔ اس سے زیادہ ایک اور پارسا کوئی نہیں تھا۔ وہ سب سے بڑا عبادت گزار تھا پھر کیا ہوا؟ آپ بتا ہے علیہ داؤد پھر کیا ہوا؟“ عزرا زیل کو آج آپ الہن کے نام سے یاد

لی ہیں؟“  
میری ہتھیلیاں پسینے سے جھجک گئیں۔

”اس نے آدم کو سمجھ کرنے سے انکار کیا تھا..... یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کیا تھا نہیں؟“  
”جی..... جی۔“

”اس نے کیوں کیا وہ سب؟ کیوں وہ انسان سے حسد کا شکار ہوا؟ کیا، اس کے سمجھنے کے انکار کی کوئی وجہ ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔“

ہال میں چٹاپا چٹاپا تھا۔ سب دم سامنے نہیں بن رہے تھے۔  
”الہن نے جو بھی کیا وہ میں ہی کیا اور وہ آج بھی بہت سے انسانوں کو اپنے جیسا ”الہن“ صرف اس لیے بنانا چاہتا ہے کہ اللہ انسان سے محبت نہ کرے۔ آپ نے بھی سوچا کہ شک کا فائدہ اللہ نے الہن کو کیوں نہیں دیا۔ باوجود اس کے کہ اللہ سے بڑھ کر ہر ماں کوئی نہیں ہے؟“

وہ مجھے دیکھ کر استغفار کر رہے تھے اور میں بنا بلک جیسے سانس روکے کہ اس پر کچھ تیری سی۔ مجھے لگ رہا تھا میری آواز میں کبھی نہیں نکل پائے گی۔

”وہ اس لیے ڈینٹا اسٹوڈنٹس کے ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد پار کر لی جائے تو پھر اس شخص کو رعایت نہیں دی جاسکتی۔ بعض اصول ایسے ہوتے ہیں جن پر سمجھوتا نامکن ہوتا ہے۔ سوائی زندگی میں ایسے اصول بنائیں کہ اگر کوئی انہیں توڑے تو آپ اس الہن کو کوئی رعایت نہ دیں۔ عزرا زیل ہر کوئی بن سکتا ہے مگر عزرا زیل ہے الہن ہے وہ بندگی کی جنت سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کی کہی واپس نہیں ہوتی۔“

میں نے بے اختیار دونوں ہتھیلیاں اٹھا کر تالی میں ملائیں اور ایک دم ہر اہل تالیوں سے کو نچنے لگا۔ ”وہ کم آن اسٹوڈنٹس!“ وہ جینپ کر شیل پر رکھی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے ایک بہت پرانے پروفیسر، سر عثمان راؤ ان دنوں ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کے اعزاز میں ایک شاندار سیٹھ ویل پارٹی کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس پر تمام فیکلٹی ممبران اپنے ازواج کے ساتھ مدعو تھے۔ اس شام میں نے پہلی دفعہ پروفیسر رضا کی بیوی کو دیکھا۔

اس کا نام علینا تھا۔ وہ دراز قد اور بھورے گھنگرائے بالوں والی بے تحاشا حسین لڑکی تھی۔ جیسے موم کی گڑیا۔ رضابلیک ڈنر سوٹ میں لمبوس تھے اور وہ ان کے ساتھ سیاہ اسٹاکس لباس میں پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ کوئی اتنا حسن بھی ہو سکتا ہے؟ پانچ برس کا پیارا سا بیٹا ان کی انگلی تھامے کھڑا تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ اتنے مکمل لگ رہے تھے کہ میں پوری تقریب انہیں تنگ گئی۔ مجھے ان کی بیوی اچھی لگی تھی، وہ انہی کی طرح بے حد ملسار اور شائستہ تھی البتہ میرا ان سے تعارف نہ ہو سکا کہ یہ وہ موقع تھا جب رضا کے ارد گرد لگے جگھٹے کے پیچھے میں چھپ جایا کرتی تھی۔

وہ تینوں ایک تصویر کھینچانے کے لیے ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے اور کمر پکڑے ڈورین کے کہنے پر مسکرائے فلیش کی روشنی میں ان کی کاملیت اور بھی دیکھنے لگی۔ کھٹا کھٹ بہت سے اسٹوڈنٹس ان کی تصاویر لینے لگے اور وہ ریڈ کارپٹ پہ فوٹو شوٹ کروانے والے اشار سلیم ریٹر کے مانند ہر طرف کیمروں اور فلیش کی چکاچوند روشنیوں سے گھر گئے۔ اپنے موبائل سے بہت دور سے ایک تصویر میں نے بھی لی تھی۔

اس رات میں اس تصویر کو دیکھ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ کیوں؟

کارڈور میں اسٹوڈنٹس آ جا رہے تھے۔ میں اپنی بیساکھی سے خود کو گھسیٹتی آہستہ آہستہ اس آخری دروازے کی جانب بڑھنے لگی جس پر رضاحیات خاں کے نام کی تختی لگی تھی۔

دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے دو دفعہ کھٹکٹایا پھر وہ ... نہ پا کر ڈراما دھکیلا تو وہ کھٹکا چلا گیا۔

ان کی کرسی خالی تھی۔ البتہ ایک خالی کونے میں وہ جانماز بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ جس پل میں نے دروازہ کھولا وہ اسی پل بعد میں گئے۔ میرا دل احترام سے بھر گیا۔

ان کے سلام پھیرنے تک میں چوکھٹ میری کھڑی رہی۔ وہ فارغ ہوئے تو سر اٹھایا۔ چہرے حیرت آ گئی۔

”میری اتنی براٹ اسٹوڈنٹ اتنے تکلف ابھی تک دروازے پر کھڑی ہے، اس بات کا مجھے افسوس ہے۔ آئیں، بیٹھیں نا۔“ وہ تاسف و ہندامت سے جانماز ترک کرتے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے لیے کرسی کھینچی۔

”سوری پروفیسر!“ میں لب کاٹتی دروازہ بند کر کے کرسی تک آئی۔ وہ اب گھوم کر میز کے پیچھے جا اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ رہے تھے۔ ان کا کوٹ کمر کی پشت پر لٹکا تھا اور وہ شرٹ کی آستینیں کھینچ کر موڑے، ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کیے بہت بے تکلف اور ریلیکسڈ لگ رہے تھے۔

”لائیں کتاب دکھائیں، کون سا ناپک سمجھانا آپ نے؟“ وہ میرے ہاتھ سے کتاب لے کر پلٹنے لگے۔ صبح کلاس کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ مجھے ایک موضوع کے سمجھنے میں دشواری انہوں نے فوراً مجھے ایک بجے اپنے آفس میں بلایا کہا تھا۔

”تو اس میں کیا سمجھ نہیں آیا آپ کو؟“ مطلب



سوچنا چاہتی تھی سوائے اس کے کہ میں بہت پرست ہو رہی ہوں۔

”اونہوں..... لو میرج! پور کے لذو۔“ ان کا وجہ بہ چہرہ حزن واداسی سے پڑھا۔ میرادل کٹنے لگا۔

”میں آپ کے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟“

”ہتا نہیں حلیمہ..... میں اپنے لیے خود کچھ نہیں کر سکتا تو تم کیا کرو گی..... بعض دفعہ زندگی ایک مقام پر ٹھہر جاتی ہے، سمجھ نہیں آتا کہ کس طرف کو نکلیں۔

آگے یا پیچھے، ایسے میں اگر کوئی دل کا بوجہ ہلکا کر دے تو اچھا لگتا ہے۔ تم سے بات کر کے بھی اچھا لگا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“ پھر وہ میرے ساتھ ہلکی پھلکی دوسری باتیں کرنے لگے۔

وہ ساتیں میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع بن گئیں۔ ان کے آفس سے نکلتے وقت میرے ارد گرد میرا ست رنگا بلبلی ترن چکا تھا۔ میں اسی میں مقید فضا میں تیرتی رہی تھی۔ میں گاتگی آنکھوں سے دن کی روشنی میں پہلی بار ایسا دیکھ رہی تھی۔

اس روز میں نے پہلی دفعہ ایک ٹھنڈا بنایا تھا۔ البتہ یہ بات میں اس وقت نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو اماں رو رہی تھیں۔ ماموں آج بہت سی باتیں سنا کر گئے تھے۔ ان کی مطلوبہ رقم کا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ اور وہ اب مجھے اور اماں کو سامان سمیت مکان سے باہر پھینکنے کی دھمکی دے کر گئے تھے۔

”خون سفید ہو گیا ہے کرامت بھائی کا۔“ اماں کو ماں جانے کی بے بسی رلا رہی تھی۔ میرادل بھی دکھ میں گھرتا گیا۔ عجیب مایوسی کا عالم تھا۔ پریشانی کے باعث رات میں اماں کی حالت بگڑتی گئی تھی۔ بخار نے ایسا آن گھیرا کہ غشی کے دورے پڑنے لگے۔

رات کے تیسرے پہر وہ بہ مشکل دوا سے کچھ

ماتحتہ پاکیزہ — اپریل 2012ء 155

کمال کر اب وہ اس پر سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے رہے تھے۔

”سر یہاں سے آگے.....“ میں آگے ہو کر انگلی بتانے لگی۔ یہ مشکل دس منٹ لگے انہیں مجھے سمجھانے میں، اور ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئیں۔

”اب بتائیں چائے لیس گی یا کافی؟“ کتاب کر کے انہوں نے ایک طرف رکھ دی۔

”دونوں نہیں۔“

”پھر جوس تولیں گی بی۔“ وہ اٹھے اور ساڈر پر لیٹی ٹرے سے ایک کین اٹھا کر کھولا اور ایک شیشے کا گلاس میں انڈیلا۔

”تھینک یو..... آپ کی وائف بہت اچھی ہیں“ میں نے اور جوس کا ایک گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھا۔

”جانے بھی دو حلیمہ داؤد۔“ انہوں نے ایک اس مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا۔ میں شل رہ گئی۔

”کیوں پرو فیسر..... کیا ہوا؟“

”اچھی مسلمان لڑکی وہ ہوتی ہے جو سر ڈھانپے،

باپ پہنے۔ اب آپ ہیں، مجھے آپ بالکل اپنی چھوٹی

کی طرح لگتی ہیں۔ اور سر ڈھکے تو آپ بہت اچھی

لگتی ہیں۔ مگر میری بیوی.....“ ایک تلخ مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھری تھی۔ ”میری بیوی میری نہیں

ہے۔“ ان کا مجھے اپنی چھوٹی بہن کہنا مجھے معتبر کر گیا۔

اماں کی بیوی کا رویہ دھمی۔

”وہ ایسے کیوں کرتی ہیں؟“

”غور..... اپنی ذات کا زعم، کچھ اپنے باپ کی

دھمکی کا تکبر، ایک عام سے پرو فیسر سے اتنے بڑے

باپ کی بیٹی شادی کرے گی تو وہ برابری پہ تو کبھی نہیں

پہنچے گی۔“

”ارنج میرج تھی؟“ میں اس وقت سب کچھ

سنبھلیں تو میں باہر برآمدے میں آ بیٹھی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ پریشانی اور پریشانی ہر سانس کے آخر میں اگر مجھے کوئی ایک شخص نظر آتا جو میری مدد کر سکتا تو وہ رضاحیات تھے۔ کیسے اور کیوں، میں نہیں جانتی تھی۔ حج کے چار بجے بالآخر دل کے ہاتھوں ہمارے گھر میں پہنچا اور رضا کا نمبر ملایا جو انہوں نے مجھے آفس میں دیا تھا۔ دوسری گھنٹی فون پر سیو کر لیا گیا۔

”علیہ داذو نے اتنی جلدی مجھے کیسے یاد کر لیا؟“ وہ اتنا شاش بپاش تھے کہ میں لمبے بھر کو اپنا مسئلہ بھول گئی۔

”آپ جاگے ہوئے تھے؟“

”ہاں، ابھی تھوڑا بڑھ کر فارغ ہوا تھا۔ تم بتاؤ کیسی ہو؟“ جواب میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تو دل بھرا گیا۔ گلا رندہ گیا۔

”علیہ... تم دوسری ہو؟“ وہ فکر مند ہو گئے تھے۔ میں آٹھ سو اور سکیوں میں سب کتنی چلی گئی۔ آخر میں وہ دیر سے نئے۔

”اتنی سی بات؟“ اور میں بھگا کر ہاتھیں کیا ہو گیا۔

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔“

”جے... بالکل ہے۔ اور یہ مسئلہ حج تک حل ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر رچے ہیں تمہارے ماموں؟“ یہ خیالی میں، میں نے ماموں کا ایڈریس اور نمبر دے دیا۔ پانچسوں دن ان کو کیسے سمجھائیں گے۔ ”میں بیچ تک میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ اچھا بتاؤ تم نے رات سے کچھ کیا یا نہیں؟“

”نہیں۔“

”بھروسہ ہو لڑتا ہوں، جاؤ چکن میں اور کچھ پلٹ میں لے کر آؤ پھر باتیں کرتے ہیں۔“

”اچھا۔“ میں نے فون رکھا اور سراتے ہوئے

اٹھی۔ مجھے اپنے ہماری کندھے ہلکے ہوتے ہوئے ہورہے تھے۔

اس صبح ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ بچپن اسکول کے زمانے کی، اپنی اپنی فیملی کی، مگر دوستوں کی۔ مجھے وہ بھی اپنی طرح اکیلے اور اندر زمانے کے ڈسے ہوئے لگتے تھے۔ میں بہت آہستہ ان بہت قریب آ گئی۔

اور پھر اس صبح وہ بخیر بخیر نہیں آئے۔ شام ماموں نے اماں کو شکر یہ کا فون کیا کہ ان کو ہمارے بیچے بندے نے پیسے اور کر دے تھے۔ اماں نے ہمیں ان کو نہیں الیہ مجھے ضرور کہا۔

”کس نے اور کیسے پیسے؟“

”ایک دوست نے مدد کی ہے۔ میں اسے دوں گی۔“

”آپ آم کھائیں، میز کیوں کتنی ہیں؟“

چپ ہو گئیں مگر اگلے روز جب میں نے رضا سے واہی کی بات کی تو وہ ”ارے چھوڑو“ کہہ کر بات گئے۔ میں نے اصرار کیا تو وہ شرمندہ ہونے لگے۔

”اگر اب تم نے جیوں کی کوئی بات کی تو سبھیوں کا کلیہ داذو میری سب سے برا اسٹوڈنٹ نہیں ہے۔“ اور پھر میں نے جیوں کی بات نہیں کی مگر... مگر واقعی... دیکھیں میں واقعی جیوں کی کوئی بات نہیں کی تھی پھر میری کیا کیوں... کیوں چند روز بعد مجھے علم ہوا کہ میں سب سے برا اسٹوڈنٹ نہیں ہو یا شاید یہی رہی؟

کیوں نہیں رہی اور کب سے نہیں رہی؟

ہاں، تب سے جب قزوہ ابراہیم زنگیوں میں آ گئی۔

قزوہ... وہ میرا جو حلتا نہیں، صرف نو

ادفعہ نوئے تو پھر کبھی نہیں سکتا۔

☆☆☆

”قزوہ ابراہیم، ناکس غنہ... مگر کلاس کو یہ تو میں کہ قزوہ کا مطلب کیا ہوتا ہے؟“ پوری کلاس میں سنا چھایا تھا اور بہت سی لگاؤں رنگ و حسد سے احیائیت کی غلاب کو کچھ دیر نہیں۔

وہ لیٹ ایڈیشن تھی۔ دیر سے آنے والے مگر ہاجانے والوں میں سے تھی۔ کاشی لڑکی، بے حد گوری ملائم جلد اور لاجی آنکھوں کی بانگ۔ اس کے بال کبک کرتے تھے۔ سیدے، سلی سیاہ بال اور وہ ایل اینٹیں سمیت کر دین شائے پر آگے کو ڈال دیتی تھی۔ اس کا لباس بھی بہت جدید ترش خراش کا، لڑے بے پاک تھا۔ آستین، غائب، کھلا گلا اور گروں سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ بہت خوب صورت تھی، اور کسی کی اوجھ کھلے پھول کے مانند تھے چھونے

بھی میلے ہوئے کا خدشہ ہو۔

”قزوہ تھی ڈیڑھ گھنٹہ؟“ وہ اپنی ناک، لمبی گروں سے اٹھائے ہوئی تو رضا حیات دیر سے لکھائے۔

”ڈیڑھ گھنٹہ... جو حلتا نہیں صرف نو تھا ہے؟“

”اور اگر ایک دفعہ نوئے تو پھر کبھی نہیں جڑتا۔“

اس طرح سے بولی۔

”آپ نے اتالیٹ ایڈیشن کیوں لیا؟“

”جواب قزوہ نے نزاکت سے شائے اچکا ہے۔“

اس کے شائے اچکا ہے کا اپنا ایک منفرد انداز تھا۔

”موڈ نہیں بنائیں، بس۔“

”چلیں، اچھا ہے کہ اب موڈ بن گیا تو کلاس! قزوہ ابراہیم سے۔ ہماری مستقبل کی برائیت۔“

میری طرح چوکی مگر رضاحیات میری طرف کھڑے تھے۔ وہ قزوہ کی جانب متوجہ تھے۔ آج

## استاد کی قدر و عظمت

قاجار عالم سکندر ایک مرتبہ اپنے استاد اسطو کے ساتھ کھتے جنگلی سے گزر رہا تھا۔ راستے میں ایک بہت بڑا برساتی ٹالا آ گیا۔ ٹالا بارش کی وجہ سے طغیانی پر آیا ہوا تھا۔ استاد اور شاگرد میں بحث ہونے لگی کہ خط ناک ٹالا پہلے نال پار کرے گا۔ سکندر بعد تھا کہ پہلے وہ جائے گا بالآخر اسطو نے اس کی بات مان لی۔ پہلے سکندر نے ٹالا پار کیا پھر اسطو نے ٹالا عبور کر کے سکندر سے بے چھا۔ ”کیا تم نے پہلے ٹالا پار کر کے میری بے عزتی نہیں کی؟“ سکندر نے ادب سے جواب دیا۔ ”نہیں استاد، مگر میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اسطو نے گاؤں پر اردوں سکندر تیار ہو سکتے ہیں لیکن سکندر ایک بھی اسطو جی نہیں کر سکتا۔“

مرسلہ رفت بین رنری رنری رنری

مجھے ان کی لگا ہوں سے اوجھل کرنے کے لیے کسی جہوم کی ضرورت نہیں تھی۔ قزوہ پور سے جہوم پر بھاری تھی۔ مگر میں فیصلہ نہ کر سکی کہ مجھے قزوہ اچھا لگی ہے یا بری لیکن یہ طے تھا کہ وہ میری جگہ لے چکی تھی۔

☆☆☆

کلاس کے دوران وہ لیکچر کم نوٹ کرتی اور کچھ سوال زیادہ کرتی۔ لیچر کا زیادہ تر وقت رضا اس کے ہر سوال کا پورے عمل سے جواب دیتے میں گزاردیتے۔ وہ انہیں زچ کرنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ سے نہ جانے دیتی۔ اس کے بعض سوالوں میں کوئی سنسن نہ ہوتا تھا۔

”بندر کی دم کیوں ہوتی ہے سر حیات؟“ میں حیرانی سے سوچتی کہ اس کے سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔

”کیونکہ بندر کو درخت سے لٹکنا ہوتا ہے۔ سو وہ اپنی دم کو شاخوں پر رول کر دے لٹکتا ہے۔“ رضا بہت

میرے، سگراتے ہوئے ہر بات کی وجہ بتاتے تو میں انہیں داد دے بغیر نہ کہتی مگر پھر.....

”ہندوؤں کا درختوں پر لٹکانا کیوں ضروری ہے، وہ ایسے ہی کیوں نہیں رہ سکتے؟“

”اُف.....“ میں دل ہی دل میں کڑھنے لگی تھی۔ قلزم سے سب ہی اب کوفت کھانے لگے تھے۔ اس کے سوال وقت کا ریاں اتارے اور کچھ نہیں، یہ بات سب پہ محال ہی بھری مضافے جواب ضرور دیتے۔ اب ٹھیک سے پانڈوں کو اس روز میں رضا کے آفس کا کام سے لگتی تھی شاید کوئی اسائنمنٹ جمع کرنا تھا۔ دروازہ نیم داؤد کچھ کر میں نے دیکھا تو سامنے کا منظر عجیب ہوا۔ قلزم رضا کے مقابل کرسی پر بہت بیزاری بیٹھی تھی۔ کئی میز پر لگا کر کھینچی ٹھوڑی تلے جھالے، وہ بلند آواز سے کئی بات پر بحث کر رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور پھر لب سمجھ لے۔

”آئیے علیہ!۔“ رضانی سے سگراتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی قلزم کی کرسی تک آئی۔ اس کے ساتھ ایک خالی کرسی رکھی تھی۔ رضانی اس خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ ”نہیں.....“ قلزم ایک دم کھڑی ہوئی، ایک نیکی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اٹھنے سے کھڑے لہجے میں بولی۔

”آپ مصروف ہیں تو میں اپنا سوال پھر کیلئے کر لوں گی۔“

”ارے نہیں قلزم، آپ تپتی ہیں، میں نے حلیہ سے چند ایک.....“

زور سے دروازہ بند کیا۔ ”نا بچو، بچی ہے، تم برا مت ماننا بچو۔“

”نہیں پروفسر، بس یہ اسائنمنٹ.....“ میں نے کانڈوں کا پلندہ ان کی طرف بڑھایا۔

”اوکے.....“ میں دیکھ لیتا ہوں۔ چائے پیو کر پھر کافی؟“

”کچھ نہیں، مجھے ذرا کام سے جانا ہے۔“ میں یوں بنا کچھ سے غصہ زدوں سے پلٹ گئی۔ میں یوں اور کس کے لیے۔ مجھے اپنا آپ رضا پر ایک یوں لگنے لگا تھا۔ ان کی زندگی کی مکمل تصویر میں میری جگہ تھی۔ آہستہ سے میں نے ان کے کمرے دروازہ بند کیا تو دیکھا قلزم دیوار سے ٹک لگا بیٹے پر بازو لپیٹے کھڑی ہے، میں سر جھکا کر بڑھنے لگی تو وہ ایک دم میرے ساتھ چل دی۔

”کیا ہے تم میں حلیہ داؤد کا تو میری رضا حیات وقت تمہاری باتیں ہی کرتے ہیں؟“ میں ٹھنک کر اس کی جانب بٹتی، وہ عجیب ہوئی کھا ہوں سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ”حلیہ یہ ہے، حلیہ وہ ہے، انہیں حلیہ آگے اور پیچھے کچھ کو کھانی نہیں دیتا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم وہ، وہ میری طرف کبھی نہیں آسکیں گے۔“ اس کے لہجے میں اتنا کرب اور دکھ تھا میں دیکھ رہی تھی۔

صرف ایک ہی شخص دے سکتا تھا۔ رضا حیات خان.....

”مجھے ہر طرف رضا کا چہرہ نظر آتا ہے۔ ہر دیوار، ہر کرسی، ہر درخت ہے۔ میں آسان کو دیکھوں تو بھی وہ نظر آتا ہے۔ ایک دن میں ان کو کیپس میں نہ دیکھوں تو میری سانس بند ہونے لگتی ہے..... میں کیا کر دوں حلیہ؟“ اور مجھے جو لگتا تھا کہ اس مرض میں میں، میں ایلی کی جگہ ہوں تو لڑکھ لگتا تھا کہ وہ بھی میرے جیسی ہی تھی۔

اس روز، ہم دونوں دوست بن گئے۔ ایک قلعہ بھدا سا جوڑ..... مگر جوڑ تو بن گیا تھا۔ ہمارے درمیان ایک ہی اشتراکیت تھی اور کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ کیا تھی؟

☆ ☆ ☆

رات کقلزم کی کال آگئی۔ وہ بری طرح دوربی تھی۔

”ارسل نے کچھ کہا ہے کیا؟“ میں پریشان ہوئی۔

”بھائو میں گیا ارسل..... میری زندگی میں ارسل سے زیادہ مسائل ہیں۔“ وہ چلائی تو میں نے گہری سانس لی۔

”پروفیسر رضا..... وہ میری کال نہیں اٹھیند کر رہے۔“

”تو رور کو ریں ہو؟“

”نہیں؟“

”نہیں..... حالانکہ مجھے پتا تھا کہ میں بھی روروں کی گرگھٹ گھٹ کے اس کی طرح بہ آواز بلند نہیں.....“

گرگھٹ تھا کہ میں یک یک اسے دیکھنے لگی۔ زندگی میں پہلی دفعہ وہ مجھے بری نہیں لگتی تھی۔

”بھائو! میرے ہاتھ چھو دو لوگ دیکھ رہے“ میں آگے چل دی اور ٹپکی ناک مزاج، شاہانہ لڑکی سر جھکا کر میرے پیچھے ہوئی۔

اس میرے کو ٹوڈنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ پہلے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کی روح، دل اور احساسات، سب ٹوٹ چکے تھے۔ وہ وہ تھی جس کی جگہ اس میں لگتی تھی۔ وہ رضا کو بچ کرنے کے لیے سوال نہیں کرتی تھی۔ وہ وقت ضائع کرنے کے لیے بھینس نہیں کرتی تھی۔ وہ تو صرف توجہ کی طالب تھی۔ اسے رضا کی توجہ چاہی تھی۔ اسے صرف ان کی اپنے لیے لگتی تھی چند باتیں چاہی تھیں۔ وہ اپنا بارے کہ روپ میں حلیہ داؤد کا تو میری کمرے بات میں اسے بتانے لگی۔

اس کے والدین آسٹریلیا میں تھے۔ وہ بڑھنے کے لیے پاکستان آئی تھی۔ بڑھنے کے لیے عمو لوگ آسٹریلیا سے آسٹریلیا جاتے ہیں مگر قلزم کا ہر کام الٹا تھا۔ وہ والدین سے دور رہنے کے لیے اصرار اپنی والدہ کے پاس رہنے آئی تھی۔ بڑھائی کا تو بس بہانا تھا۔ اس کے پیڑس کی آپس میں کبھی نہیں ملتی تھی اور نہ اس کا امکان تھا۔ وہ ان کی روز بروز کی بک، بک اور مریش بن گئی تھی اور پھر اصرار اس تھا۔ اس کا لڑا، اس کے عشق میں پاگل..... مگر قلزم کو اس لذت کی حد تک کوفت تھی۔ وہ سارا وقت ارسل اور رہا جسے کی کوشش کرتی مگر اس کی آتش عشق نہ بکڑتی۔ شادی پہ اصرار سے لے کر موروں سے ساتھ تک۔ ارسل ہر بات پہ اس کی منت کرتا اور وہ گرتی رہتی۔ اب تو اس کا گھر جانے کا دل نہیں تھا۔ وہ توجہ کی طالب تھی اور سن چاہی توجہ اسے



160 ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء

رن میں ہے۔ اس کی حالت کو میروسی

وہ اپنے آپ میں یہ سوچ رہی تھی۔

کیرہ — اپریل 12

”وہ تو ہیں نا۔“

”ہاں! وہ پچھلی ہی ہنس دی۔“

”ہاں۔“ علیلہ اس روز میں ان کے آفس گئی تو وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں زین پر بیٹھ گئی اور ان کو نماز پڑھتے دیکھتی رہی۔ وہ جگہ سے جگہ گئے تو میں سانس روکے ان کے اٹھنے کا انتظار کیے گئی۔ ان کی نماز اچھی آواز سے، دھیمی اور خوب صورت تھی کہ میں بتا نہیں سکتی۔“

”سو ہے۔“ اور پھر ہم دونوں گھنٹوں رضا کی باتیں کیا کرتے۔ ہمارے پاس گفتگو کے لائق کوئی اور موضوع رہا ہی نہیں تھا۔ ہمارے واحد بونڈ نے ہمیں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا اور پھر میں اور قلمرو الگ ہو ہی نہ سکے۔

☆☆☆

مجھے شاید یہ اتفاقاً نہ ملے آں گھیرا اور میں کن دن تک بسز پری۔ دو ادنیوں کا ایک ڈھیر تپتی پڑھ رہا رہتا اور میں نیم بے ہوش کی حالت سے بھی نکل پاتی اور بھی نہیں۔

شاید مجھے یونیورسٹی سے نانہ کیے چھار روز تھا جب قلمرو مجھ دیکھنے آئی۔

”دیکھو تو میرے ساتھ کون ہے؟“ اس کی آواز میں خوشی کی رشت تھی۔ میں نے یہ وقت انھیں ٹھوکیں تو دیکھا رضاحنا چوکتے ہیں کھڑے تھے۔

”پرو فیسرا!“ میرے بال پڑ پڑاے، آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

”اب رضا آئے ہیں نا تمہیں دیکھئے، اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ وہ بے تکلفی سے کہتی میرے سر ہاتے انہیں پھر مجھ کے لیے ساتھ ہی کرسی بیٹھی۔

”میں نہیں رضا بیٹھیں نا۔“ وہ اسی طرح ان کو نام سے پکارتی تھی۔

”کبھی ہیں آپ علیلہ داؤ؟“ ہم سب کو پریشان ہی کر دیا۔“ وہ میرے قریب کرسی بیٹھے۔ دھتھے لہجے پھر رہے تھے۔

”بس!“ میرا گھر رندہ گیا۔ میں لیٹی ہی رہی اٹھنے کی بھی قہقہہ نہیں کی۔

”اللہ آپ کو صحت دے گا۔ یہ بیماری کچھ نہیں سوائے اس کے کہ یہ پاک کرنے والی ہے۔“

”ٹھیک یا پرو فیسرا۔“ میری آواز جھکی تھی۔

”رضا۔۔۔۔۔ آپ تو اتنے ٹیک ہیں، اسے عبادت گزار ہیں، کچھ پڑھ کر پھونکیں یا علیلہ پھر کچھ ٹھیک ہو جائے۔“

”اتنا بھی نہیں ٹیک۔“ وہ جھینپ گئے۔

”ہیں نا۔۔۔۔۔ علیلہ تمہیں پتا ہے رضا چھ سال کی عمر سے تھپ پڑھ رہے ہیں اور آج تک ان کی کوئی چیز نہیں چھوئی۔“

”ہاں۔“ وہ قلمرو۔“ وہ شرمندہ ہو گئے اور تھپ سوچنے لگی کہ جس شخص کی ستائیس سال تک کوئی تھپ رہی ہو، اس کا مقام اللہ کے نزدیک کیا ہوگا؟ میرا دل رعب سے بھر نہ لگا۔

پھر وہ اٹھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر ہر کوئی آیت پڑھنے لگے۔ ان کا عربی لہجہ بہت خوب صورت تھا۔ چند لمحے بعد وہ خاموش ہوئے اور داہنا ہٹا دیا۔

”اب تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ جاتے ہوئے وہ نے بس اتنا ہی کہا تھا۔

رات تک وہ ناٹائی فائدہ جو پہلے اترنے کا نام لے رہے تھا، یوں غائب ہوا جیسے کسی چڑھائی پر اگلے صبح میں ہشاش بشاش کسی بیس میں تھی۔ گھر میں حیران نہیں گئی۔

جس شخص نے ستائیس سال اللہ کی عبادت

ہو۔ اللہ اس کی بات کیوں ٹالتا علیلہ؟“ اور میں اس سے متعلق تھی۔

☆☆☆

ان دنوں قلمرو بہت خوش رہنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک چمک اور ابوی مسکراہٹ ہمہ وقت رہتی۔ اب وہ رضا کو بیچ کرنے والے سوال بھی نہیں کرتی تھی بلکہ ہر دم میرے ساتھ رضا کی باتیں کرتی۔ ان کو کھانے میں یہ پسند ہے، ان کو پھونکی یہ براہد اچھی لگتی ہے، ان کا پسند یہ لباس یہ ہے، وہ قرآن کے حافظ ہیں اور ہر وہ بات جو میں نہیں جانتی قلمرو کو معلوم ہوتی تھی۔ رضا کے بارے میں وہ مجھ سے کچھ غلط نہیں سمجھتی تھی۔ گو کہ ارسل کے قصبہ ابھی اس کی زبان پہ ہوتے لیکن اب وہ بہت کم ہی وہ قصے سناتی۔ رضا اس کی ہر بات کا آغاز و اختتام ہوتے تھے۔

شاید رضا اس کی ذہنی حالت اور دیوانگی بھری طبیعت کو سمجھ چکے تھے۔ تبھی اس کو زیادہ وقت دینے لگے۔ وہ اکثر کلاس آف ہونے کے بعد بھی گھنٹوں رضا کے آفس میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ قلمرو کھر لیت جانے لگی تھی اور جب کھر جاتی تو بھی رضا کو فون پر مصروف رکھتی۔ پڑھائی پر اس کی توجہ ہٹ چکی تھی۔ وہ نہ امتحان قریب ہونے پر دھیان دیتی، نہ اسائنمنٹ پر وہ تو اب پیچروٹ کرنے کا تکلف بھی نہ کرتی تھی۔ رضا کی کلاس میں قلم ہونٹوں میں دباے آئینے پھوڑی دکائے ایک تک رضا کو دیکھ جاتی۔ دوسری کلاسز تک کر دیتی۔

پہلے میں بیٹھے میں ایک بار رضا کے آفس چلی جایا کرتی تھی کوئی موضوع سمجھا ہوتا یا ایسے ہی دل ہماری ہو جاتا تو ان سے بات کر کے اچھا لگتا تھا۔ مگر اب وہ قلمرو کو زیادہ وقت دینے لگے میرے لیے اقلت کا خاندان ہو گیا۔ یہاں تک کلاس میں لپچر

کے علاوہ مہینہ گزر جاتا اور میں شاید ہی ان کی شکل دیکھ پاتی۔

میں نے بھی پھر انہیں آزاد چھوڑ دیا۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ اس سے آگے کہاں جاسکتا تھا؟ بھلا؟ مجھے یہ بات سمجھ آگئی تھی۔ مگر پھر بھی اپنے ہر مسئلے کے حل کے لیے میں ان کی طرف دیکھتی۔ میرے دل میں ایک امید جاگ اٹھی تھی کہ اگر رضا میرے لیے دعا کریں تو میری منطوق ناگ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ چھوٹے شرارتی بچوں کی طرح بھاگتے اور دوڑنے کو میرا دل چاہنے لگا تھا۔

مگر ایک اذیت بھی تھی۔ عشق لا حاصل۔۔۔۔۔ کدھر لے جانے کا یہ عشق لا حاصل تھے؟ میری روح چھنے لگی تھی۔ میں رضا کی محبت میں قلمرو کی طرح ڈوب چکی تھی مگر اس کا انجام کار کیا تھا؟ اس دور کی آخری لکیر کو کھر تھی؟ لیکن اپنے بارے میں اب میں کہاں سوچتی تھی۔ میں تو قلمرو اور رضا کی قلم کی خاموش تماشاخی بن چکی تھی۔

☆☆☆

چند ہفتے مزید گزرے تو مجھے قلمرو میں ذرا فرق محسوس ہوا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ ٹھوکی ٹھوکی رہنے لگی تھی۔ میں اس سے مخاطب ہوتی تو وہ پکارے جاتے پڑے بری طرح چوک جاتی۔ کبھی ذرا جانی بات بے بات روئے لگ جاتی۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر بہنے کو تیار ہوتے۔

”قلمرو تمہیں کیا ہوا ہے؟“

”ہوں، کچھ نہیں، کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ وہ پیکا سا مسکرا کر کہتی تو میں مطمئن نہ ہوتی۔

”کوئی مسئلہ ہے قلمرو؟“

”نہیں نا۔۔۔۔۔ اس کی رنگت اب زرد رہنے لگی تھی۔ بہت پتھری پتھری مر رہی تھی۔“

پھر ایک روز وہ ہوا جو مجھے ساری زندگی اذیت





مجازی خدا بنالیا تھا۔ صدیوں پہلے جب نسل کاوریہ پار کر کے اسرائیل کی اولاد ایک بستی پر سے گزری تھی تو ان ناخلف لوگوں نے بستی والوں کے جھوٹے معبودوں کی عبادت دیکھ کر موٹی سے کہا تھا کہ ہمیں بھی ایک ایسا الہ (معبود) بنادو۔ میں نے بھی یہی کیا تھا جب رضاحیات کو دیکھا تو دل نے خواہش کی کہ میں بھی اس پر نچھاور ہو سکوں..... پھر جب موسیٰ کو وہ طور سے نہ لوٹے اور بنی اسرائیل پہ مدت لمبی ہو گئی تو انہوں نے کہا کہ موسیٰ کا الہ اس سے گم ہو چکا ہے۔ مجھ پر بھی مدت لمبی ہو گئی تھی۔ میں نے بھی لاشعوری طور پر یہ سمجھا تھا کہ میری مدد کرنے والا میرا الہ مجھ سے کھو گیا ہے اور پھر میں نے پھڑا بنالیا، جیسے بنی اسرائیل نے بنایا۔ ایک سونے کا چمکتا، دملتا، بے حد خوب صورت پھڑا۔

مجھے اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، میں نہیں جانتی مگر میرا حساب شروع ہو چکا تھا، کوئی میرے اندر بار بار مجھ سے پوچھتا رہا تھا کہ کہاں ہے تمہارا وہ مددگار مجازی خدا؟ پکارو رضاحیات کو۔ وہ آئے اور تمہیں اس اذیت سے نکالے جس میں قلمزہ کے اعتراف نے تمہیں دھکیل دیا ہے۔

میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی مگر وہ چہرے جو ہر مصیبت کی گھڑی میں میرا مشکل کشا بن کر سامنے آتا تھا۔ آج مجھ سے گم ہو چکا تھا۔ میرا عزرا زیل، الیس بن گیا تھا۔

☆☆☆

”میرا تصور نہیں تھا..... انہوں نے مجھے مجبور کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا یہ تعلق مذہب اور معاشرے کی پابندیوں سے ماورا ہے۔“ وہ درخت سے ٹیک لگائے آنسوؤں سے بھیکے چہرے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ انہوں نے مجھے مطمئن کیا اور میں مطمئن ہو گئی۔ تم جانتی ہو وہ لفظوں کے ساجر ہیں۔ ان کو انکار

کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔“

میں ویران نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ قلمزہ کا چہرہ بیماری کی حد تک زرد پڑ چکا تھا۔ آنکھوں تلے حلقے اور گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ وہ اتنی کمزور اور اجڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر پہلی نظر میں بتایا جاسکتا تھا کہ وہ زندہ لاش بن چکی ہے۔

”حلیہ میں انہیں کہتی ہوں کہ وہ مجھ سے شادی کر لیں مگر وہ نہیں کرتے۔ وہ ہر دفعہ شادی کی بات ٹال دیتے ہیں۔ وہ بات ادھر ادھر گھما دیتے ہیں۔ کیا وہ مجھ سے شادی کر لیں گے؟“

”شاید نہیں..... ایک پرفیکٹ فیملی کے ہوتے ہوئے وہ کیوں یہ رسک لیں گے جبکہ انہیں بغیر شادی کے بھی سب مل رہا ہے۔“

”حلیہ!“ اس نے توپ کر مجھے دیکھا۔ ”جب سے میری رپورٹس آئی ہیں میں ان سے نہیں ملی۔ بس فون پر ہی زور دیتی ہوں شادی پر۔“

”اور اب تم ان سے ملو گی بھی نہیں..... سنا تم نے؟“ میرے سختی سے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

چند روز گزرے اور اس نے اپنی خالہ کا گھر چھوڑ دیا۔ وہ میرے گھر آ کر رہنے لگی۔ اماں کو اعتراض ہوا مگر میں نے انہیں منالیا کہ شوہر نے طلاق دے دی ہے، وہ بے چاری کدھر جائے؟ اور جب اماں کو میری زبانی علم ہوا کہ ماموں کو کرائے کی رقم دینے والی قلمزہ ہی تھی تو ان کے سارے اعتراض اور شکوک و شبہات دور ہو گئے۔

میرا ہیرا ٹوٹ چکا تھا اور میں پُر امید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ بھی جڑ بھی پائے گا یا نہیں۔

زرد چہرہ اور نڈھال وجود لیے وہ یا تو بستر پر پڑی خلاؤں میں گھورتی رہتی یا پھر بے آواز آنسوؤں سے روتی رہتی۔ زندگی قلمزہ کے لیے ختم ہو چکی تھی۔

رضاب اس کی کال بھی ایڈیٹ نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کی آواز سننے کو تڑپ مٹی تھی۔ مر رہی تھی مگر وہ بہت معروف تھے۔ آج کل وہ ایک مائیکرین کر دا کے آنے والی لڑکی روا قاسم کے ساتھ دیکھے جاتے تھے مگر اسے نیک، شریف اور پارسا پروفیسر کے ساتھ ظاہر ہے روا قاسم صرف اس لیے دیکھی جاتی تھی کیونکہ وہ اسے آنے والے ڈی بیٹ ٹیچنگ کی تیاری کر دا رہے تھے اور اسی لیے اکثر بچے روا ان کے آفس میں ہوتی تو دروازہ اندر سے لاکھڑا تھا۔

”میں جانتی ہوں وہ لڑکیوں کو اپنے آفس میں گھیر کر کیا کرتے ہیں۔“ قلمزہ درد سے رو رہی تھی۔

”میں سب جانتی ہوں مگر میری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔“ وہ یونانی گلی رتنی اور میں خالی خالی نظر روں سے اسے دیکھنے جاتی۔ دنیا صرف اس کی نہیں لٹی تھی۔

☆☆☆

”مرہم نے سنا ہے کہ آپ قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں۔ پلیز ہمیں بھی سنا دیے۔“ روا قاسم ہمیشہ کی طرح چپک رہی تھی اور رضا جو تا جب کھول کر بیچ شروع کرنے ہی والے تھے ذرا سا تھپ گئے۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔“

”پلیز سر۔۔۔۔۔“

”پلیز پروفیسر سنا دیں نا!“

”مرہم پلیز۔۔۔۔۔“

بہت ساری منت ہماری آوازیں گونجیں اور لڑکیوں نے دونوں سے سر دکھنا شروع کر دیا تو وہ گہری سانس لے کر ٹانگ کے قریب ہوئے۔

میں ہلکے جیسے، دیران دکھان سے ان کا ہنسنہ چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کوئی مثال، کوئی شرمندگی کوئی احساس گناہ، کیا کچھ بھی تھا اور وہ ذرا سا

تکھار کر تیر پڑنے لگے۔

ان کی خوب صورت آواز کا سحر پورے ماحول پر چھانے لگا۔ بہت سی لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ہر شخص اس سال میں بندھ گیا تھا سوائے میرے۔۔۔۔۔ میں بہت غور سے ان کا چہرہ کھوج رہی تھی۔ کہیں کوئی احساس گناہ رقم تھا یا نہیں؟ کیا واقعی انسان کے اعمال اس کی پیشانی پر نہیں لکھے جاتے؟ وہ اتنے ہی ٹرسکون، نیک اور پارسا لگ رہے تھے جتنا پہلے لگتے تھے۔ یہی تو فرق ہے سحر اور مجھے میں۔ سحر صرف آنکھوں کا دھوکا ہوتا ہے اور میری آنکھیں اب دھوکے کی عادی ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

قلمزہ والچہ کچھ راجہ اور دیکھ رہی تھی۔

”اگر وہ میری منتوں ترلوں کے باوجود مجھ سے شادی پر راضی نہیں ہوتے تو اس طرح کیسے ہوں گے؟“

”تم کو کوشش تو کرو۔ تم خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ کسی جا کر تم ان کی بیوی کو سب کچھ بتا دو گی۔“

”میں تو فیسے میں کبھی تھی۔ بھلا ان کی بیوی میرا یقین کیوں کریں گی؟“ وہ میری تجویز پر حیران تھی۔

ان کی بیوی تمہارا یقین کیوں نہیں کرے گی؟ یہ شک بھی رضانے ڈالا ہے تمہارے ذہن میں۔ تم پر اعتماد ہو کر ان سے بات کرو۔ وہ اس دھمکی پر ضرور ڈریں گے۔ اسے شش درج میں جتلا دیکھ کر میں اسے سمجھانے لگی۔ بہت دیر بعد اسے میری بات سمجھ میں آئی۔

”تمہارے بغیر سے کال ایڈیٹ نہیں کر رہے تو تم میرے بی بی سی ایل سے کال کرو۔“ فون کا ریسپورڈ کر لیں گے اٹھا کر میں نے اس کے ہاتھ میں تمہارا اور اسے ایڈیٹ چھوڑ کر باہر چلا آئی۔

الان گھر پر نہیں تھیں۔ میں برآمدے میں تنہا بیٹھ

گئی۔ سامنے میز پر ٹیکسٹن دھرا تھا۔ چند لمحے میں سوہنی رہی پھر آہستہ سے ریسو بوا ڈھالیا۔ میرے اندر موجود رضاحیات کی محبت میں ڈوبی لڑکی مسلسل قلمزہ کو جھوٹا کہہ رہی تھی۔ شک کے باعث مجھ سے رہانہ گیا اور میں نے سماعت ان کی گفتگو کی طرف لگا دی۔ غیر اخلاقی حرکت تو تھی مگر شاید اس سے کوئی فائدہ ہو جائے۔

وہ کہہ رہے تھے۔

”کس نمبر سے کال کر رہی ہو قلمزہ۔“

”علیہ کے لینڈ لائن سے۔ میں آج کل اس کے پاس رہنے لگی ہوں۔“ وہ چند ٹاپے کو خاموش ہو گئے۔

”رضاب! مجھ سے شادی کر لیں۔ ورنہ میں برباد ہو جاؤں گی۔“ تم پر باد ہو چکی ہو قلمزہ، میں نے دل میں سوچا تھا۔

”قلمزہ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”آپ مجھ سے شادی کر لیں۔“ وہ میری ہدایت کے مطابق کہہ رہی تھی۔

”ساری زندگی بڑی ہے شادی کے لیے۔ ابھی کوئی اور بات کرو۔“

”ٹھیک ہے اگر آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے تو میں آپ کی دانف کو سب کچھ بتا دوں گی، یہ بھی کہ میں آپ کے بچے کی۔۔۔۔۔“

”تم ایسا کچھ نہیں کر دو گی۔“ وہ تجویز سے بولے۔

”مجھ سے شادی کر لیں۔“ وہ اصرار کر رہی تھی۔

رضاب چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر دھیرے سے بولے۔

”تم نے علیہ کو تو کچھ نہیں بتایا؟“

”بے فکر رہیں۔۔۔۔۔ آپ کے اس ڈارک سیکرٹ سے کوئی دانف نہیں۔“ وہ جی سے بولی۔

”ٹھیک ہے، ہم کل شادی کر رہے ہیں، کل رات آٹھ بجے تم پلیز اپنا بیچینگ جاؤ۔“ وہاں مرہم بڑبڑ کے شور میں کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑی ہو جانا، میں نہیں وہیں سے پک کر لوں گا۔ وہاں سے ہم میرے دوست کے گھر چلیں گے جہاں نکاح ہوگا، ٹھیک؟“

”جج۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ وہ گنگی ہو گئی۔

”لیکن اگر تم نے علیہ سمیت کسی کو بھی بتایا کہ کل رات تم مجھ سے ملنے آؤ گی تو شادی تو چھوڑ دو، میں تم سے بات بھی نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے آہستہ سے ریسپورڈ کر لیں پھر رکھ دیا۔ منٹ منٹ بعد جب میں واپس کرے میں آئی تو قلمزہ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

”وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔“

”کب؟“

”کچھ دن تک۔“ وہ مسکرا کر ٹال مٹی اور میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ آج بھی رضاحیات کی داسی تھی۔ ان کے حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے والی ان کے فرمان کے مطابق مجھ سے جھوٹ بولنے والی۔

☆☆☆

”مجھے خالد کی طرف چھوڑ دینا، میرے پیڑس آ رہے ہیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔“

اگلی شام جب میں نے اسے دانستہ بتایا کہ میں ماسوں کی طرف جا رہی ہوں تو وہ فونز آئی پھر تیار ہونے لگی۔

تکے گا ہی رنگ کی شلوار قمیص کے اوپر اس نے گلابی شٹون کا دو پٹا پھیلا کر لے لیا تھا۔ بال کھول کر دامن شانے پر اسے کوڑا لے لیا اور آنکھوں کو کاٹ مل سے دھکیلا۔ کالوں میں تھمتے تھمتے ہاتھیں پھنپھن دہت پیاری لگ رہی تھی۔

میں نے جیسی میں اسے اس کی خالد کے گھر کے

”تم جاؤ، میں آگے دو چل جاؤں گی۔“ وہ آکر بولی تو میں نے سر ہلایا مگر میری ہدایت کے مطابق کسی والا ایک راؤ بڑے کے راہیں ادھر آگیا تو قلم و درو ایک اور کسی میں بیٹھ رہی تھی۔ میں نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر کسی والے کی طرف بڑھایا۔

”اس لڑکی کا پیچھا کرو۔ یہ ملیو ایسا جاری ہے۔“ کافی فاصلے سے اس کے تعاقب کے بعد میں فرینکو بیکری کے سامنے کھڑی تھی۔ جہاں میں تھی وہاں اندھیرا تھا۔ قلم و مجھ سے دور سرڈیز بنز کے شو روم کے سامنے خطر کھڑی آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی مگر میں اسے انور دیکھ رہی تھی۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑی دیکھی آٹھ بج کر ایک منٹ تھا اور کسی میں نے دور سے آتی کار کی ہیڈ لائٹس دیکھیں۔ وہ کار مخالف سمت سے بہت تیزی سے آ رہی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس آخری حد تک روشن تھیں۔ اس کی رفتار خطرناک حد تک تھی۔ ”قلم و!“ میرے لب پھڑپھڑائے، بے اختیار میں نے دل پر ہاتھ رکھا۔

تیز رفتار کار نے سے قلم و کے قریب آئی۔ قلم و اور میں نے ایک ساتھ ڈرائیڈ کار چہرہ دیکھا تھا اور وہ چہرہ دیکھ کر قلم و کی آنکھوں کی جوت مل اٹھی تھی۔ وہ بے اختیار چند قدم آگے مزک پر آئی۔

”میں..... قلم و.....“ میں چشتا جا رہی تھی مگر میری آواز طاق میں دم توڑ گئی۔ قلم و اسی طرح مزک پر آگے بڑھ رہی تھی۔ تیز رفتار کار قریب آتی ہوئی عین سامنے آئی اور قلم و کو ایک ڈوردار مگر مارا کر بے ہوش کیا۔

ایک دل خراش چیخ کے ساتھ قلم و لہو اکر پیچے گری۔ میں نے چلائے ہوئے بھانگا چاہا مگر میری

گرگی۔ میں خود اوندے منہ زمین پر جا گری۔ دور قلم و خون میں لٹ پٹ کر رہی تھی۔ وحشتانہ انداز میں چلا رہی تھی اس کے ارد گرد لوگ اکٹھے ہونے لگے تھے۔ یہ مشکل اپنی یہاں بھی، سنبھال کر میں نکلنا آتے ہوئے اس تک پہنچائی لیگوں کے جھوم میں سے یہ وقت راست بنا کر میں نے دیکھا۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کا بے دم وجود خون میں نہایا تھا اور اس کی نگاہیں بے غمی سے پھیلی ہوئی تھیں۔ مگر کتنے سے زیادہ وہ شاید اس آخری لمحے رضاحیات کے چہرے پر چھائی سفاکی کو دیکھ کر بے یقین ہوئی تھی۔

دور ایبیلیس کا سائرن بجنے لگا..... مگر میں جانتی تھی کہ اب دیو ہو چکی تھی۔ میرا ہیرا چمکا چور ہو چکا تھا۔

☆☆☆

قلم و مرگئی اور اپنے پیچھے بہت سے آنسو چھوڑ گئی۔ رضاحیات کو اس کی موت کا کلاس میں بتایا جلا تھا۔ وہ بے حد حیران اور ششدر رہ گئے تھے۔ انہوں نے وہیں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور قرآن کی تلاوت کے بعد ایک رقت آمیز دعا کروائی۔ آخر میں ان کی اپنی آنکھیں میٹ گئیں۔ پھر قلم و کی موت کے تیسرے روز انہوں نے قلم و کی یاد میں ایک پروگرام کا اہتمام کیا۔ اس پروگرام میں قلم و کی ایک خوب صورت تصویر پیچھے آج پر آؤ۔ یہاں کی کئی اور قلم و کے تمام جاننے والوں نے اس کے متعلق تاثرات بیان کیے۔

جب مجھے بلایا تو میں نے ایک دیران نگاہ سب بڑا دل کرس اتاکھا۔

”قلم و وہ ہیرا بھی جسے جوہری تراش نہ سکا۔ جوہری نے اس کی ضرب لگائی کہ وہ نوٹ کر چکا چور ہو گیا۔ ہیرا سب سے سخت کوئلہ ہوتا ہے۔ اگر نوٹ

جانے تو جڑ نہیں سکے۔ وہ بھی نوٹ کی تھی۔“ چند روز گزرے تھے کہ میں نے سنا، رضاحیات نے اپنا رفسٹر کر دیا۔ وہ سنداہ چلے گئے اور اپنے پیچھے اپنے جاننے والوں کو اداس چھوڑ گئے۔ میں نہ کبھی پولیس اسٹیشن گئی نہ کبھی اس ہٹ اینڈران ایکٹوٹ کی تحقیقات کا مطالعہ کیا۔ قلم و کے قاتل کو زیادہ سے زیادہ پچاس ل ل جانی؟ ایسے تو وہ اگلے جہاں اپنے گناہ سے بری ہو جاتے۔ میں نے اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ قاتل اس کے نامزد اعمال کا واحد گناہ نہیں تھا۔ سو ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرتے ہوئے میں نے یہ دعا کی تھی کہ اللہ ان کے ساتھ انصاف کرے اور انہیں ملک کا فائدہ کبھی نہ دے۔ یہ دنیا ایبیلیوں کے لیے اس کی جگہ بھی ہے۔

☆☆☆

کلاس میں پن ڈراپ سائنلس تھا، سب دم بخود، محرومہ سے سر ہٹا، آندری کو سن رہے تھے۔ وہ ہمارے سائیکالوگی کے نئے پروفیسر تھے۔ ہینڈم اساتذہ، جینٹل، حاضر جواب اور ہیرا۔ وہ سب کچھ تھے۔ کوئی منتر تھا ان کے پاس کہ چند ہی دنوں میں ساری کلاس ان کی طرف کھینچی چلی آتی تھی۔ ان کی گرویدہ ہو گئی تھی۔

”کتنے اچھے ہیں پروفیسر آندری.....“ کلاس کے بعد جب میں اپنی کتابیں سیٹ رہی تھی تو میری کلاس لیڈ فاطمہ یوسف نے آہ بھر کر کہا تھا۔

”ہوں گے۔“ میں نے فائل میں صفحے تریب سے لگاتے ہوئے سر ہری کیا تھا۔

”بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں ملیو، اتنے ایک اور ہیرا..... جانتی ہو ان کا تعلق علما کے خاندان سے ہے۔ بلکہ برصغیر میں اسلام کو متعارف ان کے پرکھوں نے ہی کروایا تھا۔“

”میں نے انسانوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیا ہے

فاطمہ۔ مجھے یہ سب مت بتاؤ۔ انسان وہ نہیں ہوتے جو کھائی دیتے ہیں۔“ میں بیک اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ فاطمہ نے غصے سے مجھے دیکھا۔

”سب مرد ایک سے نہیں ہوتے۔“

”ہاں، سب مرد ایک سے نہیں ہوتے مگر فارمولا سب یہ ایک ہی ایلانی ہوتا ہے۔ جو عمر ہے، وہ مرد آپ کے لیے اچھا ہے اور جو عمر نہیں ہے، وہ چاہے آپ کو کس روشتے سے بھی نکالے، وہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہو سکتا۔ جو عمر نہیں، اس سے تنہائی میں ملنے کی اجازت میرے رب سے نہیں دی۔ چاہے وہ تنہائی ملیں فوک گفتگو کو بھی کسی پروفیسر کے آفس میں جا کر اس سے ملنے کی حد تک۔ سب مرد ایک سے نہیں ہوتے فاطمہ مگر فارمولا سب یہ ایک ہی ایلانی ہوتا ہے۔“ ایک غلط مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر میں پلٹ گئی۔ میری بیسٹیا کی تک تک خالی کلاس روم میں گونجنے لگی۔ میں نکلنا آتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

میں جانتی ہوں کہ پیچھے پیچھے فاطمہ کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی کر شاید آپ کو لگتی ہو۔ مجھے قدرت کا یہ اصول اس وقت سمجھا تھا جب میں قلم و کو کھو چکی تھی۔ ہاں میرا ہمدرد..... مجازی خدا رضا حیات تھا۔ وہ جس کے صرف خیال نے ہی مجھے باندھ رکھا تھا۔ مجھے اللہ سے دور کر دیا تھا۔

میں نے اس سونے کے چھڑے کو توڑ کر جلا کر نل کے پائوں میں بہا دیا ہے اور اب میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا آپ کا بھی کوئی ایسا جیسا خدا ہے جس نے آپ کو باندھ رکھا ہے اور آپ کو اللہ سے دور کر دیا ہے؟ اگر ہے تو اسے انہی توڑ ڈالیں۔ نصیحت پھر بعد میں آپ کے پاس نہیں آئے گی..... بعد میں صرف عذاب آتا ہے۔



# پھر کوئی خواب بنو

عذرا یگ



— اچانک —

اچانک فون کی گھنٹی بجی تو کرے میں مختلف آوازوں کا شور یکدم سہم سا گیا۔

”عالیہ بیٹی ذرا دیکھنا.....“ منصور اچھے کہا۔  
 ”جی اچھا.....“ عالیہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور  
 فرن ٹرن بچا فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ کرے میں  
 بیٹھا چوٹا بڑا شخص ہر تن گوش ہو گیا۔  
 ”جی بہتر! میں ابھی بتا دیتی ہوں، آپ فکر نہ کریں جی سب خیریت ہے، خدا حافظ۔“ عالیہ وقتے سے کہہ رہی تھی اور جب گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوا اور وہ فون رکھ کر مڑی تو کتنی ہی سوالیہ نظریں اس کے

”مکی فلک آ رہا ہے۔“ عالیہ نے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے کہا۔ اور بیٹھ کر اس کے منصور احمد کچھ اور پوچھتے، کوئی اور سوال کرتے کرتے میں جیسے شہد کی ٹھکڑوں کا پورا پورا جھٹکا اٹھسا، مگر بے نتیجے لوگ تھے سب یک ذرا بان ہو کر بول رہے تھے۔

”فلک.....فلک اٹکل، بھائی فلک.....فلک بھائی۔“ ہر کوئی اس کا نام لے کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کتنے دن رہیں گے؟“ کسی نے براہ راست منصور احمد سے پوچھا۔

”انہیں یہاں ایک چیک میں بڑی اچھی جا ب مل گئی ہے۔ اب وہ یٹین رہیں گے۔“ منصور احمد نے وضاحت کی۔

”ایسے ہونہار بیٹے کو اس کی محنت کا پھل ملنا ہی چاہیے۔“ دادی نے غرے سے لہجہ میں کہا۔ ان کا سب سے لاڈلا نواسا ہوتا تھا۔

”ہی، امی، آپ درست فرماتی ہیں اور پھر چنید اور بچوں کے امریکہ چلے جانے سے مگر میں جو خلا سا پیدا ہو گیا ہے اس کی کسی کچھ نہ کچھ پوری ہو جائے گی اور سبیل کو بھی اس سائیڈ مل جائے گا۔“ ساجدہ بیگم نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”ان کی ساسی میں جوہں۔“ عالیہ نے ماں کو تسلی دینے کے خیال سے کہا۔

”وہ تو تم شیک کھ رہی ہو بیٹی۔ ویسے سبیل مردانہ کٹھن کی کمی تو محسوس کرتا ہوگا۔ اب سارا وقت تمہارے پایا کے کھنکھوں سے لگ کر بیٹھنے سے تو رہا۔“ ساجدہ بیگم کی آواز پر درد سی تھی۔ شاید جھجھکے بچوں کی یاد آ رہی تھی۔

”سوری امی بی، میں نے خواہوا آپ کو غنیدہ کر دیا۔“ عالیہ نے شرار ہو کر کہا۔

”میں نہیں، بیٹی، امی کوئی بات نہیں، اب تم علیہ اور مدیحہ کے ساتھ مل کر آنے والے سہمان کے قیام کا بندوبست کر دو۔ نور کا کرا شیک رہے گا۔“ دونوں بھائی مل کر رہے تھے۔

”مگر امی تو جانتی ہیں نور امی اور امی رات تک کمپیوٹر کے بیٹھا رہتا ہے اس طرح تو فلک بھائی سے سکون نہیں ہوں گے۔“ علیہ نے دخل اندازی کی۔

”میں نور سے کہہ دوں گی کہ بھائی کے آرام کا خیال رکھے۔“ اب تم بھی انشوار عالیہ کی مدد کرو۔“ ان کی آنکھیں صاف کھیر رہی تھیں کہ انہیں بیٹی کی یہ دخل اندازی کیونچیں نہیں لگی۔

”وہ علیہ شیک کھ رہی ہے امی۔“ عالیہ نے علیہ کی ہاں میں ہاں ملاتی چائی۔

”اب ختم کر دیں بھائی کی بحث..... جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔“ ساجدہ بیگم نے جھکنا نہ کہا اور علیہ، عالیہ کا انتقاد کرتے کرتے نکل گئی۔

”امی آپ نے خواہوا علیہ کو ڈانٹ دیا۔ وہ شیک ہی تو کھ رہی تھی۔“ عالیہ نے آہستہ سے کہا۔

”وہ میری بیٹی ہے عالیہ، جو اس کے دل میں ہے میں بخوبی جانتی ہوں اور اس کی خدا اور تم دھری کو بھی خوب پہچانتی ہوں۔ بس تم ذرا فلک کو پیار سے سمجھا دیتا کہ وہ اپنے اس میں بند رہنے والی لوکی ہے۔ اس کی کسی بات پر نہ لے۔“ ساجدہ بیگم کچھ تجھڑی ہو کر گئیں۔

”میں سمجھا دوں گی امی، فلک آپ کو بھی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔“ عالیہ نے ان کے چہرے پر فکر مندگی کے آثار دیکھ کر تڑپ لی۔

اگلے روز شام کو جب ہر بخورد فلک محسن علی

بڑے بڑے رنگ رنگ سفری بیگ اٹھائے سر پر امریکن کیپ اور ہاتھ میں واٹر بوتل پلڑے ماموں منصور کے گھر پہنچا تو لگا جیسے ساہیوال سے نہیں کسی انٹر پورٹ سے آ رہا ہو۔ سب سے زیادہ حیرت زدہ علیہ ہوئی۔ اس نے تو ذہن میں اس کا کوئی اور ہی حلیہ بنا رکھا تھا۔ سفید گھیر دار شلوار پر ڈھیلا ڈھالا سفید کمرے گریبان میں چپکے ہوئے سونے کے بن، آنکھوں میں سرے کی دھاریاں اور لیے لیے بال تیل میں چپکے ہوئے لیکن یہاں تو زمین آسمان کا فرق تھا۔ تین سالوں میں وہ کافی بدل گیا تھا۔ خاصا رنگ رو بہ اور قد کاٹھ نہ کھلا تھا۔ فٹن کے مطابق جدید لباس اور چہرے پر اگا ہکا بکا کھاس پھوس کافی زیب دے رہا تھا۔

”تو یہ ہے وہ دشمن جان جس سے تیرا ڈراما ہونا ہے..... وہ سارا آنکھوں والا سارا جس کے سحرے اپنے آپ کو بچا کے رکھتا ہے؟ وہ محمود غزنوی جو سارے کو ہزار ڈھوار کر راز راستے، ہندی، نالے، بے جور کے کتھاری سرحد پر آن پہنچتا ہے اور تم اطمینان سے اپنے کاموں میں اچھی رہیں اور اپنے پیٹاؤ کا کچھ نہ سوچا؟“ اس کا داغ جانے اس سے کیا کیا پوچھ رہا تھا۔

”خیر اب ایراراج کبھی نہیں کہہ دیتے ہی خاک کا ڈھیر بن جاؤں۔ ایرانام بھی علیہ ہے، ساری مادہ گردی دھری کی دھری رہ جائے گی۔“ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

فلک یوں بھی ہر لمحہ یز تھا اور سب اس پر دل و جان سے فدا تھے۔ وہ کیا آیا لگتا تھا خوشیوں اور لہجوں کے سارے کا قافلہ اس کے ساتھ چلے آئے والے۔ چھوٹے بڑے سب ہی اس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بھی سب کے لیے اور جدہ جہت کوئی نہ کوئی حضور رو لایا تھا۔

”یہ آپ کے لیے۔“ اس نے ایک کھنکھل شاپر علیہ کی طرف بڑھایا جو اس نے شکر ہے کہہ کر لے لیا۔

”مجھے امید ہے آپ کو ضرور پسند آگئی گی۔“ علیہ نے شاپر قبول کر دیکھا اندر کی کٹائیں تھیں۔ اس نے دوبارہ چمکس کہا۔ کٹائیں دیکھ کر وہ واقعی خوش ہوئی تھیں۔

وہ ایک خوشخوار شام تھی۔ سب چائے پیٹے ڈھیروں ہاتھ کر رہے ہوئے مڑے مڑے کے لوازمات کھاتے رہے جو اس پر سرت موقع کے لیے خاص طور پر رانج کئے گئے تھے۔

”تمہارے آنے سے تمہاری ماما تو ضرور اداس ہو جائیں گی۔“ ساجدہ بیگم نے سربل نہ کرہ کہا۔

”کوئی ایسی دینی، وہ تو میرے آنے پر رضامندی ہی نہیں میں۔ وہ تو ابلا اور کچھ میں سے روشن مستقبل کے لٹکارے دکھا کر راسخ کیا۔ حالانکہ شفق بھائی نے وہاں میں دہائی میرے لیے جا بگئی ڈھونڈ لی تھی لیکن ماما نے اٹھا وہ برا حال کیا کہ کیا بتاؤں۔“ فلک اپنے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”تو پھر کتنیں لاہور بھیجے کر کیسے رضامند ہوئیں؟“ منصور احمد بولے۔

”انہوں نے سوچا ہوگا لاہور کم از کم قریب تو ہے اور پھر آپ سب بھی یہیں ہیں.....“ فلک نے چپکے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”یہی سچ ہے۔“ ساجدہ بیگم لیں۔

”آپ کو دینی نہ جانے گا فوس تو ہوا ہوگا؟“

شاہیان نے چہمیرنے والے انداز میں کہا۔

”سچ پوچھو مجھے کوئی فوس نہیں ہوا۔ زندگی میں اور مواقع بھی آتے ہیں لیکن والدین کو کچھ ذکر اتنی دیا جاتا ہے خود پسند نہیں۔ میرے لیے لاہور دینی سے کہیں.....“ فلک نے تنجید کی ہے۔



”میں تم سے متفق ہوں فلکی۔“ سہیل نے پوری سچائی سے کہا۔

”تو اور کیا، جب چٹھیاں ہوں گی، میں چلا جایا کروں گا۔ جب ان کا دل چاہے گا۔ وہ آ جایا کریں گے۔“ فلک خوش دلی سے بولا۔

”یہ بھی ٹھیک ہے، دونوں شہروں میں فاصلہ ہی کتنا ہے۔“ منصور احمد خوشدلی سے بولے۔

”میرا خیال ہے اب فلک کو اس کا کمراد کھا دو،  
دن بھر کا تھکا ہوا ہے، کیوں فلک میں ٹھیک کہہ رہی  
ہوں؟“ ساجدہ بیگم نے پوچھا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، کچھ ممکن ہو ہی گئی ہے۔“ فلک نے ذرا ہنسنے کے بعد لہجہ میں کہا۔  
”تو چلو پھر آرام کرو، انشاء اللہ شام تھانے پر ملیں گے اور ہاں تمہاری جوائنٹنگ کب سے ہے؟“  
منصور احمد نے اسٹے ہوئے کہا۔

”جی منڈے کو رپورٹ کرنی ہے۔“ فلک نے کہا اور یوں ہتے مکرانے ایک دوسرے کو شب بخیر کہتے سب اپنی اپنی پناہ گاہوں کی طرف چلے گئے۔ سب جا چکے تھے لیکن علیہ اپنی سوچوں میں گم

”وہی تو بندہ بے ضرر سا نظر آتا ہے۔ جولی اور کھلا ڈالا لیکن دل کا حال کون جانے، یہ جو کسی وقت س کی آنکھوں کے کونوں میں ستارہ سا نمودار ہو کر اُسے ہو جاتا ہے، ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ

مکمل تھی۔ جیسے کوئی وارننگ ہو، دراصل یہ سب  
اذاکار ہوتے ہیں ان کے چالاک اور مکار چروں پر  
لوہلیں اور مصعویت کے قلاب پڑے ہوتے ہیں۔  
ن کی ظاہری شخصیت اور جتنی چہری باتوں کے جال  
لا دی ہوتے ہیں۔ اس لیے زیادہ بے تکلف اور  
بریاں ہونے کی ضرورت نہیں۔“ علیہ کا چاق و  
چومہ دماغ کڑے انداز میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔

176 ماحنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء

”بس تم کہتے جاؤ جو سوچ کر وہ آیا ہے یا سوچ  
 آیا ہے، وہ خواب بھی تویر نہیں ہوگا۔ میں اے امی  
 عالیہ بھائی اور داد کے داد پتھر خوب جانتی ہوں، جو  
 جال وہ میرے لیے بچھا رہے ہیں، سارے کے  
 سارے نہ کاٹ دینے تویر انام بھی تلخ نہیں۔ اس  
 کے حسین چہرے پر ثابت قدمی کی ہلکی سی مسکان تھی۔  
 ”کیا ساری رات یہیں بیٹھنے کا ارادہ ہے؟“  
 عالیہ بھائی نے اچانک کرے میں آکر پانی کی فرسے  
 اٹھاتے ہوئے لہجہ۔

”نہیں بھائی، بس اٹھ ہی رہی تھی۔“ علیجہ نے  
 اٹھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی کام ہو تو مجھے بتائیں۔“  
 ”نہیں ایسا تو کوئی کام نہیں بس ذرا فلک کو سنبھال  
 کرنا ہے۔“ عالیجہ نے واپس مڑتے ہوئے جواب دیا۔  
 ”کیا لوری سنا لی ہے؟ فیڈر روٹی ہے؟“ علیجہ  
 نے چیخا۔

”نہیں بھئی، نئی جگہ ہے نا ذرا چیزیں وغیرہ  
سنہالنے میں ہیلپ کروں تو اچھی بات ہے نا، آخر  
میرا بھائی بھی ہے اور مہمان بھی۔“ عالیہ نے نرمی سے  
سمجھایا۔

یہ تو حیک ہے بنی اپ جاں اپنا کام  
کریں۔“ علیہ نے اٹھتے ہوئے کہا: ”آپ مناسب  
سمجھیں تو میں بھی ساتھ چلوں کچھ مدد ہو جائے گی۔“  
”نہیں، اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، اچھا  
خدا حافظ۔“

”خدا حافظ!“

”علیہ ایک بات تو رہ ہی گئی۔“ عالیہ کو اچانک

یہ کچھ یاد آ گیا۔

”کیسے.....“ علیہ جاتے جاتے رکی۔

”کیسا لگا؟“ علیہ نے حیرانی سے دیکھا۔  
”میرا مطلب ہے تم نے اس کی باتوں سے“

مضمر سے، پرستائی سے کیا اندازہ لگایا، اچھا منہ پر  
انسان سے یا ایسے سے؟“  
”دیکھیں، ابھی اتنی جلدی کوئی رائے قائم کرتا،  
انداز سے لگتا، ذرا مشکل ہی سے لیکن اتنا ضرور  
کہوں گی کہ معقول انسان ہیں۔ جس کھل کھل جانے  
والے، دوسروں کی طرح خوشا دوائے نہیں۔“  
”تجربہ اندازہ ہیج سے، فلک ایک نیل دل اور  
سبھا ہوا انسان ہے۔“ عالیہ نے فوری سچائی سے کہا۔  
”آپ کے بھائی ہیں آخر جیسی آپ ویسے وہ۔“  
علیہ نے پھینچا۔

”یہ میری تحریف ہو رہی ہے یا خوشامد“ عالیہ نے چھیڑا۔

”دونوں ہی سمجھ لیں آخر میری پیاری دلاری بھابی ہیں آپ۔“ علیہ نے پیار سے کہا۔

”واہ بھی آج تو کوئی نیک دن چڑھتا تھا جو سب اچھا ہی اچھا ہے۔“

☆ ☆ ☆

”ایمان سے ابھی آپ کی منہ صاحبہ تو بے حد مغرور ہیں اب پھر اپنی ٹیٹھیں سے بالکل پھیل ..... اور کہنے کو مختصر بڑے ہائی فائیڈ میں زیرِ تعلیم ہیں۔“ اپنی جڑیں سیٹ کرتے ہوئے فلک نے عالیہ سے دیکھا کیا کہا۔

پھر کوئی خواب بنو

کوئی چیز ہے۔ خاص کر جب گھر کے کبھی بزرگ ایک جگہ موجود ہوں، کیا وہ سب کے سامنے پوچھتی آپ کی پسندیدہ اکثریتیں کون سی ہیں۔ ستر کون سا اچھا لگتا ہے۔ عاقل اسلم یا جلیبت نگہ وغیرہ وغیرہ۔“ عالیہ اسے گھور کر بکھری تھی۔

”نہیں، میرا یہ مطلب تو نہ تھا۔“ فلک کچھ شرمسار سا ہو گیا۔

”تو پھر کیا مطلب ہے سمجھاؤ نا مجھے۔“ عالیہ بے ساختہ ہنر کر اٹھی۔

”آرام سے جاگی، اپنی خانہ ہوں، میرا مطلب ہے کوئی نہ مہمان آیا ہو تبندہ ایک آدھ بات کر ہی لیتا ہے تاکہ مہمان نکوس ہو کہ وہ دیکھے ہے اور کہ نہیں تو وہ گناے متعلق ہی ایک آدھ سوال پوچھ سکتی تھی۔ آخر اس کی عمر ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم سب اپنے ہی تو ہیں لیکن نہیں، وہ تو یوں تعریف فرما رہی ہیں جیسے وہ مہمان خصوصی ہوں اور سامنے بادول نہیں ہunch back of noter dame: بیٹھا ہو۔ چال ہے جو ایک دفعہ بھی

کوئی دشمن پاسی ہو سوائے شوہر کے ڈبے کے.....  
 کیا یہ میسر کے خلاف نہیں، کیا وہ میسر یا نہیں تھی؟  
 آج پہلی بار دن یہ رویت ہے تو آگے کیا ہوگا۔ آپ خود  
 ہی سوچیں۔ ”فلک نے جیسے دکایتوں کا فرتھول رکھا تھا  
 ”اب تم زیادتی کر رہے ہو فلک، کچھ لڑکیاں  
 ڈرامہ گو ہوتی ہیں۔ بڑوں کے سامنے ذرا خاموش  
 رہتی ہیں۔ دراصل تمہیں وہ لفٹ نہیں لی جو پانے کے  
 عامادی ہو۔ اس لیے احساس کمتری میں مبتلا ہو رہے  
 ہو اور کوئی بات نہیں۔“ عالیہ نے اس کی ٹھوڑی کو  
 چھوئے ہوئے کہا۔

”یہ تو سراسر میری توہین ہوئی نا، آپ چاہے  
کچھ بھی کہیں اور کچھ نہیں تو آپ کے ناتے سے ہی کوئی  
ایک آدھ اخلاقی صفت دکھا دیتی، کم از کم گئی کے



بنائے ہوئے دوپٹے ہی کی تعریف کر دیتی۔ یہ چاری نے دن رات کر کے ایک ایک سوئی لگایا ہے۔ رہنے دیں، محترمہ ایسی سبز پری بھی نہیں خوب صورت ہوئی تو چائیں کن آسمانوں میں ہوئی۔" وہ کر پر دونوں ہاتھ رکھے بڑے عجب سے کہہ رہا تھا۔

"خوب صورت نہیں ہے؟" عالیہ کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ "ہاں.....؟" وہ شہانہ انداز میں کہتا ہنگ پر دراز ہو گیا۔

"بے سب تمہاری نظر کا قصور ہے، کل سب سے پہلے اپنی آنکھوں کا معائنہ کرو اور....." ذرا کھڑے تو ہونا۔" عالیہ کا انداز بھی نادر شاہی تھا۔

وہ حیران سا ستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

عالیہ نے چند لمحے اس کا اوپر سے نیچے تک اور نیچے سے اوپر تک معائنہ کیا۔ اس کے چاروں طرف ایک مختصر سا چکر لگایا۔ اس کی ٹھوڑی اونچی کر کے اس کی حیران حیران آنکھوں میں جھانکا۔

ہاتھ کے ذرا تخت جھکے سے اس کے جھپٹے سیاہ بالوں کو اوڑھ اُڑھ کر اچھا پھر اسی نادر شاہی لہجے میں بولی۔ "ذرا بے تباؤ، یہ ہوائی کس دھن سے اڑانی کے لیے تھیں کہ گھٹام ہو؟ بس لے دے کے ذرا نین نقش کہیں ہیں۔"

"صرف فیک.....؟" اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"تو اور کیا صرف فیک اور قد کتنا ہے؟"

"چھوٹ دواؤں۔"

"کچھ زیادہ ہی ہے۔" عالیہ نے حد سیریں تھیں۔

"اور.....؟" انہیں چپ کا پرہ بے چینی سے بولا۔

"رنگ ذرا گوارا ہے۔" عالیہ کی سیاہ آنکھوں

سے شرارت جھانک رہی تھی۔

"گوارا..... یعنی صرف گوارا۔" وہ تڑپ کر بولا۔

"چلو تمہارا دل رکھنے کو مان لیتی ہوں کہ گوارا نہیں گوارا ہے، خوش؟ دیے کتنی بات ہے تمہارا اور کتنے کو کوئی مقابلہ نہیں، میرا کوئی گوارا بھائی ہوتا تو ضرور اپنی بھائی بنا لیتی۔"

"اور میں کیا ہوں..... آپ کا دشمن.....؟" وہ غصیلے انداز میں بولا۔

"تو اتنی بھانگی علیہ؟" عالیہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

"ایمان آئے آپ بھی بس کسی بھڑکے کم نہیں ہیں۔ ایسے ایسے نشانے لگائے ہیں کہ بندہ بولہاں ہو گیا ہے۔" وہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے بولا۔ "جائے جذبات میں آکر زبان سے کیا بھول گیا۔"

"یہاں بیٹھو فکلی..... یہاں میرے پاس....." عالیہ نے نرمی سے اس کا بازو پکڑ کر پکچ کر پڑھا لیا۔

وہ بڑی فرمانبرداری سے بیٹھ گیا۔

"دو سو فک، تم میرے حب سے پیارے دلدارے مٹتے ہو، تمہیں تمہیں میں بھول سکتی ہوں؟ لیکن کرو میرے دل میں تم دونوں کی تصویر کی ہے اگر کوئی میری رائے پوچھے تو میں یہی کہوں گی کہ تم سے بہتر علیہ کے لیے کوئی دوسرا جیون ساتھی نہیں ہو سکتا لیکن علیہ کو یہ باور کرانا کوشش کرنا دنیا کا دشوار ترین کام ہے۔" عالیہ کے منہ سے نکلا ایک ایک لفظ سچائی کا تیز دار تھا۔

"لیکن کیوں بھائی؟" آپ خود سنا لگے، دیکھیں ایسا کون سا بندہ بشر ہے جسے کسی کے ہاتھوں سے، زبان سے، رویے سے، کسی

کی وقت کوئی چوٹ نہ پہنچی ہو لیکن چروقت ہر ذمہ بھر کر لیتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ساری مخلوق ایک جیسی تو ہو سکتی۔ کوئی نہ کوئی تو ایسا انسان ہو سکتا ہے جو اس نے خاص توجہ سے بنایا ہو۔ اس کے اندر اچھے اچھے جذبات اور خیالات بھرے ہوں۔ شے بیسا صاف شفاف دل دیا ہو۔ پاکیزہ اور روشن داغ دیا ہو۔ اس کے جسم میں نورانی درخشاں ہو۔ ہو سکتا ہے نا ایسا.....؟" اس کا دل اس کی روح جیسے اس کی آنکھوں میں سٹ آتی تھی۔ فک کی آواز کی لڑائی اور چہرے پر پاکیزگی کا نور دیکھ کر عالیہ کی اور آنکھوں میں نیکی آئی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا صرف فک کی آنکھوں سے پھونکنے چائی۔

"دھارے دیکھ گئی۔"

"معتنی کا ٹوٹنا کسی بڑے حادثے سے کم نہیں، میں مانتا ہوں لیکن ایسی قیامت بھی نہیں کر انسان اپنی تیاگ دے، زندگی تو تب بھی نہ رہتی اگر وہ صرف دنیا سے ہی رخصت ہو جائے۔" فک نے ہلکے بھانڈے انداز میں اضافہ کیا۔

"دنیا سے رخصت ہو جائے کو اللہ کی رضا کچھ کر جاتا ہے لیکن کسی کا دیا اور فریب کسی کے کردار کی بنا پر قیامت نہیں بھونکتی۔ تمہارے لیے شاید یہ کوئی بات نہ ہو لیکن ایک لڑکی کے لیے یہ خصوص علیہ کے لیے اس کی زندگی کا حکم ترین حادثہ ہے بغیر کسی وجہ سے ملکر اسے جانے کا حاصل صدمہ نہ کا کی اور بدنامی ہماری بوجھ اٹھا کر جیتا کوئی معمولی بات نہیں، تم نے اسے آرام سے کہہ دیا کہ کوئی قیامت تو نہیں، مصلحتی کا کہہ دیا کہ کوئی غلامت بھی جوس ہوئی نہ تھی دوسری کا کہہ دیا کہ ایک معصوم پاک و شفاف لڑکی جس کے سینے میں نئے جن جنوں نے انہی سانس ہی کی ہو، کی فکھر آنکھوں میں پہلا در پہلا ستارہ بھلایا ہو" کے ساتھ یہ ناروا سلوک ہوا اس کے جذبات کیا

ہوں گے، اس کی زندگی کیا ہوگی۔ اسے مستقبل پر یقین کیسے ہوگا؟" عالیہ کا لہجہ پروردہ تھا۔

فک یوں کھڑا ہو گیا جیسے الیکٹرک شاک لگا ہوا۔ وہ جھلانے انداز میں پیٹھ کو ذرا اوپر کھینچے ہوئے پگھلیزے لہجے میں بولا۔ "بھائی مجھے بتائیں وہ انسان کہاں ہے، پہلے میں اس کا تیاگ چاہتا ہوں کہ اس کے۔"

عالیہ نے اس کے جوش اور جذبے پر ہلکے سے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا اور رحمت بھری آواز میں بولی۔ "دھیر دھیر میرے بھائی، دھیر دھیر جوش کا نہیں ہوش کا سلسلہ ہے جو میں ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ سے حل کرنا ہے صحیح تو ہم نے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔"

"ہاں یہ تو آپ درست فرماتی ہیں۔" اس نے فوراً اس میں ہاں ملاتی۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں اور تم بھی داغ پر زیادہ زور دالے بغیر آرام سے سو جاؤ۔ گھبراؤ نہیں ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"i hope so" اس کا انداز تھا کھکا سا تھا۔

"خدا حافظ! " عالیہ نے نرمی سے اس کی پیشانی مسلائی۔

"خدا حافظ! آپ واقعی بہت ہی اچھی ہیں عالیہ بھائی کتنی حواس بندھائی ہے آپ نے۔" وہ منونادہ لہجے میں بولا۔

"اور تم بھی ملتی....." عالیہ جاتے جاتے بولی اور اسکی سے دروازہ بند کر کے چلی گئی اور فک دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے سامنے کی پینٹنگ کو دیکھ رہا۔ "بہاں بادلوں میں ابھرے سورج کا ایک حصہ دکھایا تھا کیا سورج کا ہر دروز روشنیاں اسے لکھنا بھی تو ہی امیدوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔"



”اب اگر لڑائی سے ادھر ادھر ہوئے تو آہنی کو آواز دے کر میرا یہ حشر دکھا دوں گا۔“ فلک نے اپنی استعجال شدہ باتیں بھی اس کی طرف کر دیں۔

”کیوں مرداوتے ہو فلک جان، اب میں واقعی میریں ہوں، ہاں تو میرا مشورہ ہے کہ ایک دم جملے کے بجائے اس کی نظروں میں بھولے بھالے نفس سے بندے بن کر رہو، تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ تم کوئی داندیش ڈال رہے ہو بلکہ بہتر یہی ہوگا کہ کوئی براوہ راست سوال جواب ہی نہ کرو۔“ بلکہ گفتگو کا زیادہ رخ بزرگوں، بھائیوں اور بھائی کی طرف رکھو اور جب محترمہ کو یقین ہو جائے کہ تم تو بہت نیک بیٹے ہو تو پھر کچھ بے کی طرح آہستہ آہستہ پاؤں نکالو، بس سب کو ڈر پر لے جاؤ، بھی چھوٹے موٹے نفس لے آؤ، مثلاً کتا، بلی، میز، سی ڈی گیمز، آکس کریم وغیرہ..... کچھ ہاتھ پاؤں چلاؤ، کچھ جیب ڈھکیں کرو، خود داری اتنا بھی خطرناک چیزوں کو اپنے پاس بھی نہ چھپکے دو، جتنی پتھری لگاؤ کہ اتنا ہی رنگ چو لھا آئے گا۔ یہ میرا فاضل فیصلہ ہے۔“ راتیل نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”لیکن مجھے یہ بتاؤ یہ سارا کھانا کچھ پلانے سے ہوگا کیا؟“ فلک کو راتیل کا یہ لہجہ چڑا ہلان ایک آنکھیں بھالیا تھا۔

”اس سے یہ ہوگا میرے بھائی کہ تمہارے اور علیہ صاحبہ کے درمیان شیشے کی جھان دیکھی دیوار حائل ہے وہ خود بخود دور ہو جائے گی اور جب ایک دفعہ وہ دیوار ہٹ گئی تو ساری رکاوٹیں، اندیشے، وسوسے دور ہو جائیں گے۔ اور پھر موصاں ہی موصاں، کیوں میں شیک کہہ رہا ہوں تا فلک مہاراج؟“ راتیل، فلک کی پھر آکھوں میں سمراتی

نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”تم کسی کدھر رہے ہو، میں صرف یہ سوچ رہا ہوں پلان بنانا منصوبہ بندی کرنا ایک مشکل کام ہے، میں لیکن اس پر عمل کرنا دریا جان جو کھوں کا کام ہے۔“ فلک تنبیہ کی بولا۔

”کیا کی کوئی نپ کرنے جا رہے ہو؟“ راتیل کو بتاؤ آگیا۔

”تو یہ کیسی باتیں کر رہے ہو راجی؟“ فلک نے سرشاری سے کہا۔

”تو پھر تذبذب کیسا..... کیا ڈرتے ہو؟“ راتیل نے چوٹ کی۔

”ڈر..... تو چوتھو۔“

”کیا تو یہ بوجھ کا رو کر رہے ہو، ایک لڑکی ہی ہے، معصومی، نازک سی، بھولی بھالی سی۔“ اس کی پتھکا پٹھ دیکھ کر راتیل نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”جی ہاں، معصومی، نازک سی، بھولی بھالی سی؟“ فلک نے سر ہل کر کہا۔ ”جی ہاں، بالکل ایسی ہی جی جی آپ نے فرمایا۔“

”تمہاری جگہ میں ہوتا تو.....“ راتیل بڑے زعم سے بولا۔

”ہاں، بتاؤ، میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟“ فلک نے چٹختی کہا۔

”کھڑے کھڑے دو لفظوں میں پوچھ لچھ منظور یا منظور.....؟“ راتیل نے بڑی شان سے نہان کر کہا۔

”جی ہاں..... ایسی کبھی مٹی کی بنی ہوئی دور سے پہاڑا اچھٹے گتے میں خرب جاتا تو آنے والے بماء و معلوم ہو جاتا ہے۔“ فلک جمل بھن گیا۔

”تو ابھی سے اُنجان، بھجان اور بماء و اندازہ ہو گیا۔“ راتیل نے طنزی پر اور تھیل چڑھا کر فلک کی فضیلت نظریں دیکھ کر ابے معاملے کی بڑا کر

ادہ احساس ہو گیا وہ ستانہ انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ بولا۔ ”فلک تیار سے میں نے تو کدھو پیٹا کی کرنی ہے، کوئی کرپا نے کی دکان کھولی ہے، ہاں ہوئی تو مل اینڈ لکٹ نہ ہوئی تو نہ کئی ایک ہی تو جان ہے وہ بھی گواہوں۔ ایک خند کی اور سر بھری لڑکی کے لیے نیور پھر تم ثابت قدم نہیں ہو تو پھر فوجیں بٹاؤ۔ شاندار پہاڑی اختیار کرلو۔ خواہ مخواہ حمایہ کھولنے سے کیا فائدہ..... خواہ مخواہ بزرگوں کی توپوں کا رخ تمہاری طرف ہو جائے گا۔“ راتیل اس کی پھر آکھوں میں کہتے ہوئے سمجھا رہا تھا۔

”تمہارا مشورہ بھی اپنی جگہ درست ہے راتیل لیکن اب اس پر عمل کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔“

فلک نے دھیر دھیر سے کہا۔

راتیل نے فوراً کوئی جواب نہ دیا۔ ہاتھوں کی اداوں انگلیاں جوڑے جیسے کسی گہری سوچ میں تھا۔

”اچھا کھوتو اور پڑا کا آڈر دے دوں؟“ فلک نے موضوع بدلنے کے لیے کہا۔

”گولی مارو بڑا کو ایک لڑکی تو جانتیں سکتے اور بچے عیش کرنے۔“ مجھے نہیں پتا تھا تم اس قدر جلد اظہار چیک دو گے۔“ راتیل نے بڑا کھالی ڈیوں گرفت بال کی طرح کٹ لگائی جیسے سارا قصور ان ہاتھوں کا ہو۔

”اب جانے بھی دو وضعہ..... کوشش تو بہر حال تم لے آؤ گی۔“

”غصہ تمہاری حالت زار پر آ رہا ہے، میرا اتنا ہمارا اور عزیزان دوست اتنی پریشانی میں ہو، دنگی اور میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہوں۔“ راتیل نے بڑی تنبیہ کی۔

”میرا انخیال ہے وہ فریڈ شپ گفٹ اسکیم اچھی ہے، اسی سے ابتدا کرتا ہوں۔ دو ایک دن میں اس منصوبے پر عمل کر کے رزلٹ سے تمہیں آگاہ کروں

گا۔“ فلک نے اٹھتے ہوئے کہا۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر دوسرے نے کوئی اتنا سمجھ کر مسرتو نہ تھا کہ فصول داغ پٹی کرتے رہے۔

اسے تیس اور لہنے پڑا ہنر کرتے رہے۔

جاتے آج کون سا مٹی ڈے تھا وہ راتیل سے اچھی خاصی مغز ماری کرنے کے بعد اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا سامان لیے جیسے ہی کار پڈ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ ڈش جان کچھ کتا میں اٹھائے ادھر ہی آ رہی تھی۔ آگنے کی طرح صاف شفاف چہرے پر کائنات کا سارا حسن سمیٹے لان کا لپکے کا سنی رنگ کا سوٹ پہنے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ فلک کی روح و جان اندری اندر زور کر رہی تھی۔ رعب حسن ہی اتنا قہر کہ محبت میں ڈوبا دل ساری چوڑیاں بھول گیا تھا۔

”ذرا رکت پلیر۔“ جانے کیسے وہ ہول پایا۔

”جی کیسے۔“ طنز کی آواز میں ہلکی سی تڑپ تھی۔

”یہ دیکھیں، میں آپ کے لیے لایا ہوں۔“

اس نے ایک تنگن شاپر اس کی طرف بڑھایا۔

”کیوں؟ خاص طور پر میرے لیے ہی کیوں، آج میری برتھ ڈے ہے؟“ اس نے ذرا تسنے

ابروں اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے سب کے لیے ہیں، کھول کر دیکھیں تو کی۔“ فلک نے بڑی ہمت سے کہا۔

طنیر نے اس کے ہاتھ سے شاپر یوں لیا جیسے کوئی بہت بڑا احسان کر رہی ہو پھر بے دلی سے کھولا۔

اندر درجن بھر دی وی ڈیز کے علاوہ چاکلیٹ کے پیکٹ اور کئی دوسری چیزیں تھیں، اس نے چاکلیٹ کا ایک پیکٹ شاپر اٹھا کر کٹ کر شاپر فلک کے ہاتھ میں تھمایا۔

”سوری میں نے یہ دیکھی ہوئی تھی۔“

”لیکن یہ بالکل جی ہیں۔“ فلک کی نظریں اس





پکڑوں کی خوشبو ستارہ ہی ہے جو مسئلہ زیر بحث ہے اس پر غور کرو کوئی حل تلاش کرو تا کہ یہ ہر وقت کی جھک جھک ختم ہو اور مجھے شانتی ملے۔“ اس کا پھر اہوا دماغ بے تحاشا گر جا۔  
”اور مجھے بھی۔“ دل نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

”ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو یہ واقعی مہابھارت سے کم نہیں۔ ہاں تو میں کیا سوچ رہا تھا؟“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔  
”کبھی اپنی صورت آئینے میں دیکھی ہے؟“  
اب اس کا دماغ معاملے کی سنگینی سمجھانے پر مُصر تھا۔  
”صورت.....؟“ وہ یوں اٹھ کر بیٹھ گیا جیسے کرنا لگا ہو۔

”ہاں یہ بھی تو ہو سکتا ہے آپ جناب اس کے معیار پر ہی پورے نہ اترتے ہوں۔ یوں بھی آج کل ماڈلز اور سنگرز کا زمانہ ہے، ایک سے بڑھ کر ایک اور تم ظہرے ایک عام سے سیدھے سادے انسان، نہ اسٹائل کا پتا ہے نہ بدلنے ٹرینڈ کا۔ آج کل کی یہ تیز طرار لڑکیاں دور بینی نظروں سے ایک ایک چیز کا جائزہ لیتی ہیں یہاں تک کہ ٹیل مینرز آتے ہیں یا نہیں، کھاتے کیسے ہو؟ نشو و نما کتنی ہے؟ پشست سے منہ پونچھ لیتے ہو۔“ سوالوں کی بوچھاڑ فلک کو بے حال کیے دے رہی تھی۔  
”یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ فلک نے بے بسی سے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

”تو اب سوچو نا۔ اپنا تنقیدی جائزہ لو، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔“ اس کے دماغ نے بڑے شانت انداز میں سمجھایا۔

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو بڑے میاں میں تمام تفصیلات چیک کر لیتا ہوں لیکن مجھے یقین تو نہیں آ رہا کہ میری کھوپڑی میں ایک ایسا بیجا فٹ ہے جو میرا

ہی دشمن ہے، اب کیا کروں دوست ہے یا دشمن؟ اپنا ہی۔“ وہ تیزی سے اٹھا اور ڈریسنگ کے بڑے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور ناقہ نہ نظروں اپنا جائزہ لینے لگا۔

اس کی خوش خلقی اور قد کاٹھ کے تو لوگ گن کرتے تھے۔ اور بڑی پانچی تو ہمیشہ کہا کرتی تھی فلک اپنی یہ دودھیارنگت تھوڑی سی مجھے بھی دے دے پلیز۔ وہ تو دادا ابو، بابا جانی اور اماں کا ڈرنہ ہوتا تو اب تک ملک کا نامور ماڈل بن چکا ہوتا اور معصوم معصوم نازک نازک لڑکیوں نے اس کے یہ بڑے بڑے پوسٹر اپنی الماریوں کے اندر چوری چوری لگا ہوتے۔

اتفاق سے آج وہ بڑی اسٹائش سی نیلی جینز سیاہ سی بلیک ٹی شرٹ میں کہیں کا ٹورسٹ لگ رہا تھا اس پر نئے انداز میں کئے ہوئے ڈارک براؤن بال..... ہر نقش اللہ میاں کا بنایا ہوا شاہکار..... پھر کسی چیز کی کمی تھی جو علیحدگی بی بی ایک نگاہ غلط انداز ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ اماں ہوتیں تو اس حلیے میں دیکھ کر پہلے تو ذرا گرم ہوتیں کہ کیا روز روز بدلیسی پہناؤ اپنا ہی لیتے ہو؟ پھر خود ہی نظر اتارنے کا سامان کرنے لگتیں۔  
”پھر وہ تمہیں گھاس کیوں نہیں ڈالتی؟“ اس دفعہ ذہن کے کسی گوشے سے جھپٹا ہوا سوال ابھرا۔

”مہی تو سوال ہے میرے بھائی آخر اس ناچ میں کیا کمی ہے جو اس نے ماتھے پر نو لٹ کا ان دیکھا اسٹیکر لگا رکھا ہے۔ آخر وہ کس مٹی کی بنی ہوئی ہے کہ کسی نگاہ کا جادو کسی مسکراہٹ کا ظلم، اخلاق کا سحر اس بہتر کے صنم کو موم بنانے میں کامیاب نہیں ہوتا۔

”بہتر ہوتا اگر کسی سے مشورہ کر کے کوئی قدم اٹھاؤ۔“ اس کے ذہن میں کرن سی پھوٹی۔  
”مشورہ.....؟ لیکن کس سے؟“ وہ حیران تھا۔

والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”پڑا کی وجہ سے.....؟“ راحیل کو وہ کچھ تھکا

تھکا پُر خیال سالگا۔

”نہیں..... دراصل گھر سے نکلنے میں ہی دیر

ہوئی تھی۔ امی کا فون تھا۔“

”ٹھیک تو ہیں آنٹی؟“ راحیل نے ہمدردی سے

پوچھا۔

”بس ذرا اداس ہیں۔“

”تو ایک چکر لگا آؤ نا.....“ راحیل بڑے

ایکسرٹ انداز میں پڑا کاٹ رہا تھا۔

”ابھی نہیں، شاید دو ایک ہفتے بعد۔“ فلک نے

ایک کواٹر پلیٹ اٹھائی اور اس میں پڑا کا ایک سلائس

رکھ کر کچپ کی بوتل اٹھائی یہ سب کچھ وہ بڑے چپ

چپ انداز میں کر رہا تھا۔

”کوئی خاص مسئلہ ہے؟“ راحیل نے سنجیدگی

اختیار کی۔

”یوں تو کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوگا، خاص کر

تمہارے لیے لیکن میرے لیے بہت بڑی پر اہم ہے

یعنی لائفل مسئلہ.....“ وہ بڑے غور سے اپنے ہاتھوں کو

دیکھ رہا تھا۔

”یعنی کوئی پر اہم ستارہ ہے باقی جو تم نے کہا

وہ تم ہی سمجھ سکتے ہو۔ تم مجھے بتاؤ شاید میں کوئی مدد

کر سکوں۔“ راحیل نے بڑے دوستانہ انداز میں اس

کا ہاتھ پکڑ کر کہا اور اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ

ہنکپاتے ہوئے کچھ شرمساری سے سارا داتھ سا ڈالا۔

”اور اب میں نے کہیں اور منتقل ہونے کا فیصلہ

کر لیا ہے۔“ یہ جیسے اس کا پکا ارادہ تھا۔

”ایک مثل اس قدر آسانی سے ہار مان لے وہ

بھی ایک کامیابی لڑکی ہے، ڈوب مرنے کا مقام

ہے۔“ راحیل نے غیرت دلائی۔

”وہ بھی کر سکتا ہوں، راوی کون سا دور ہے اور

”عالیہ بھابی کس دن کام آئیں گی۔“

”عالیہ بھابی؟“ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔

”نہیں یہ بہت جلدی ہو جائے گا، ابھی میں اور

راحیل جو تداویری جنگ لڑ رہے ہیں شاید اس سے کوئی

طرح خواہ نتیجہ نکل آئے۔ ورنہ یہ صورت دیگر عالیہ

بھابی تو ہیں ہی.....“ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

”یہ بھی ٹھیک ہے، کر لیتے ہیں انتظار.....“

دماغ، دل جگر سب دبک گئے اور اس نے ایک گہری

سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

”راجی.....؟“ اس نے موبائل اٹھا کر نمبر

دیا۔

”ہاں کہو۔“

”میں ذرا تمہاری طرف آ رہا ہوں، مصروف تو

نہیں ہو؟“

”میری کیا مصروفیت ہوئی ہے بھلا.....؟“ وہ

بہا۔

”پڑا کا اسٹاک ہے یا ختم ہو گیا ہے؟“

”بس ختم ہی سمجھو۔“

”تو لے آؤں دو چار؟“

”نیکی اور پوچھ پوچھ.....“

”اچھا..... بس پہنچتا ہوں۔“

”چٹورا کہیں کا کھانے کے سوا کوئی کام نہیں۔“

فلک موبائل آف کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

کچھ دیر بعد وہ راحیل کے ہاں پہنچا تو وہ دو چار

ہم وگداز کشنوں کے سہارے بڑے شاہانہ انداز میں

بٹھا تھا۔ سینئر ٹیبل پر خوب صورت پلیٹیں گلاس اور

پیشی کی بوتلیں سجی تھیں۔

”بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔“ راحیل

نے ایک استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ کر کہا۔

”بس ذرا دیر ہو ہی گئی۔“ وہ اس کے سامنے



ہے ناں.....؟“ راحیل نے مضبوط لہجے میں سمجھایا۔

”تجربہ میری مرضی کے خلاف نکلا تو باہل بھی نہیں ہے۔ راوی بھی نہیں ہے اور... تم بھی“، فلک نے اپنا چاک اٹھ کر اس کی گردن پکڑ کر دوشین ہنسنے دیے۔ ”چھوڑو گا نہیں یاد رکھا۔“ اس نے گردن چھوڑتے ہوئے دھمکیا۔ ”میکڈونلڈ نہیں ہے، تمہاری بساؤری سے ابھی اجڑا نہیں بلکہ زیادہ قشر کر رہا ہے۔“

پچھلے دو دنوں دوست پیچھے چھا کر رہے۔ بنائے گئے منصوبے کی باریکیاں سوچتے رہے، بحث کرتے رہے۔ جب کچھ دیر بعد فلک ہاں سے نکلا تو اپنے آپ کو بادل کی طرح پلکا چمکا محسوس کر رہا تھا۔ چرسکون اور خوب صورت خوابوں اور سنہرے ارادوں میں ڈوبا ہوا۔

☆☆☆

فلک نے راحیل کے مشورے سے بنائے گئے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے کمر بستہ ہو کر لی۔ اب کی دفعہ اس نے نوازشات اور محتاطیت کا زبردست چارہ لگا لیا۔ دل میں آس و امید کے لاکھوں دیے جلانے، اللہ کا نام لے کر ڈور چھینگی اور صابر و شاکر ہو کر کنارے پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ کبھی رنگ رنگ ٹیشن میگزین لے آیا تو کبھی سوور اسکوپ کی کبس..... کبھی آئس کریم، کبھی قلفہ فائوہ اور کبھی کتاب بننے کی پارٹی وے ڈانسی تو کبھی گیمز چارٹرز ریسورٹ میں الا بلا کھلانے لگیا۔ کبھی سینڈ وچز، آلو کے پرائے اور چائے سمیت لاکھ ڈرائیور پر نکل گئے۔ کبھی گولڈنزی کی خستہ کراچی چمپلی اور سووندے سووندے گھر کا کرسمس نان لے آیا۔ کبھی جنس کے لیے وہ یہ کلوٹاگ پھیلاتا تھا، وہ بیل بری اس کے دام میں نہانی نہانی..... البتہ پایا کا خوشوارسم کا

گرا ہوا، باہل ماموں جان کا گھر یا پھر راوی..... القاب تمہارا ہی ہوگا نا.....؟“ راحیل پکارتے بنا کر کہہ رہا تھا۔

”عالم پتاہ اگر جان کی امان پاؤں تو کیا یہ غلام آپ سے ایک چھوٹا سا سوال کر سکتا ہے؟“ فلک نے راولوں ہاتھ جوڑ کر جازانہ کہا۔

”بے شک کر سکتے ہو آخر تم ہمارے پرانے ملک خوار ہو اور ہمارے اس کا لے دھندے میں برابر کے شریک ہو۔“ راحیل نے پڑا کے ذبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہانہ انداز میں کہا۔

”میرا سوال یہ ہے کہ آپ نے اس خادم کے لیے جو جان لیوا منصوبہ بنایا ہے، کیا یہ آپ کے کسی گھر سے پھٹی ہے؟“

”یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اس کا لہجہ جلال امیر تھا۔

”میں نے نہیں پڑھا تھا کہ ذاتی تجربے پر مبنی منصوبے زیادہ پائیدار ہوتے ہیں۔“ فلک نے بڑی محنت سے صورت بنا کر پوچھا۔

”تجربہ.....؟“ راحیل نے انھیں چھائی۔ ”ابھی راوی عربی کیا ہے کہ ایسے رنگ رنگے دودھا گرجیوں نے گزرتے البتہ لوگوں سے سنا ہے کہ ایک بہترین درس گواہا پائیس ہے، اس میں داخلہ تو لے کر ماہر ہوئے۔“

”مناجیح بھی ہمارے ہیں۔ ضرورت پڑی تو ہم بھی لے لے دو چار تجربوں سے گزر جائیں گے۔“ راحیل جیسے پڑا رہا تھا۔

”راہی کے بیچے تم کسی دن میرے ہاتھ سے کھیں ضائع نہ ہو جاؤ۔“ فلک کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے ذہین انسان کا کیا کرے۔

”آخر آ زمانے میں حرج کیا ہے، کچھ نہ کرنے سے کچھ کر لیتا ہی بہتر ہے۔ تجربے خود نہ ہوں تو کیا ہوا سنائے تجربوں پر عمل تو ہو سکتا

ہلایا۔

”میرے دوست ممبر.....“ راحیل نے نکل دی۔

”اس کا مطلب ہے کوئی ٹیوب لائن آن نہیں ہوئی۔ کوئی چھوٹیں پکا؟“

”ایک خدی اور سر پھری لڑکی کے پتھر دل میں پیار کا دیبا چلنا ہے کوئی تعلق نہیں پکڑنی جو کتنی ضرورت پڑے گی۔“ راحیل نے ٹھیک ٹھیک جھمکا۔

”اب ایسی اموشن باتیں نہ کرو کہ میں رودوں۔“ فلک کوئی آگئی۔

”تمہارا تو وہی حساب ہے نہ تپتے چین ٹھنڈے چین۔ پھاڑے مسائل کا حل بھی ڈھونڈو تلیوں اور جینٹوں کے پیچھے بھی دوڑ لگاؤں اور اموشن باتیں بھی نہ کروں۔“ راحیل نے گھور دیکھا۔ بجوڑا فلک ممبر کر کے بیٹھ گیا۔ راحیل کچھ سوچ کے سمندروں میں غوطے کھاتا رہا اور جب کچھ دیر بعد سر اٹھا کر فلک کی طرف دیکھا تو بڑی بڑی آنکھوں میں موتی چمک رہے تھے۔

”میرے پاس ایک بہترین آئیٹیم یا بے سٹونہ تو پھڑک اٹھو گے۔“

”تو کیا میں یہاں پڑا کھانے بیٹھا ہوں، جلدی بناؤ کیا حل نکالا ہے تم نے اس سے معاف؟“ وہ بے تاب سے بولا۔

راحیل نے دھیرے دھیرے مارا پلان کے سامنے رکھا۔

”لیکن راہی یہ تو بہت لمبا چڑا مانا ہے اور میں اتنا حوصلہ کہاں.....؟“ فلک وہ ٹھٹھکی سے بولا۔

”مقدمہ میں کامیاب ہونا چاہیے ہو۔ منزل پانا چاہیے ہو تو کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

ممبر، حوصلہ، عزم، ہمت ان سے ہی تو سرور ہوا تھا پتھر کو موم بنانا آسان تو نہیں؟ اب فیصلہ تو تمہیں

سالگرہ نہیں ڈوبنا کون سا مشکل.....؟ اسے بھی تاؤ آ گیا۔

”اوکے، اوکے، فی الحال یہ راوی چننا ہی باتیں چھوڑ دو، تمہارے منہ سے یہ بڑا دلنا الفاظ اچھے نہیں لگتے۔ کچھ لڑکیاں ٹیوب لائن قسم کی ہوتی ہیں۔ ان کے پیچھے میں کوئی بات زرا دور سے آتی ہے۔ اور تم نتے سیریس ہو گئے۔“ راحیل نے نرمی سے سمجھایا۔

”تو تم پیچھے میں اب تک وہی تپا ہی رہا کتا، بکواس کر رہا تھا؟“ میرے لیے تو غیرت اور عزت کا معاملہ ہے۔“ ایذا فزا کر سٹنڈ انفاشر میں، میں بے حد سیریس ہوں اور یہ حد کا مطلب ہے بے حد۔“

فلک بے مشکل اپنے کھولتے ہوئے غصے پر قابو پا کر بولا اور سمجھایا یا سمجھایا یا ساٹھ کھڑا ہوا۔

”کنٹرول میری جان، میں شب سمجھ گیا ہوں، معاملہ بہت نازک اور سیریس ہے اور مجھے ایک ذرا دیر دوست کی پیشیت سے نہ صرف تمہارا ساتھ دینا ہے بلکہ اسے کامل ڈھونڈنے میں تمہاری مدد بھی کرنی ہے۔ تو بس سوچتے ہیں کچھ اور خدا کے واسطے یوں قلعہ بنان بن کر میرے سر پرست کھڑے ہو۔ یہاں آرام سے بیٹھو، کہیں کھڑے کھڑے میرے دماغ کی رہی سہی تپ بھی نہ لگ کر دو۔“ وہ اپنے مخصوص چلیپے لیے بیٹھا ہوا۔

”کہو تو دو چار پڑا اور منگوا دوں تا کہ ذہن کچھ تقویت پائے۔“ فلک کے لبوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ لہرائی تو انہو ادا سے پیارے دوست پر گرم ہو گیا۔

”نہیں..... اب میں پوری طرح ارلٹ رہتا چاہتا ہوں۔“ وہ بے ساختہ منہ دیا۔ چند لمبے کرے میں سکوت چھایا رہا۔ راحیل پیشانی پر انگلیاں پھیرتا کسی سوچ میں تھا اور فلک خستہ نظروں سے اس کی صورت دیکھنے گیا۔

”سوچنے کی؟“ فلک نے مضطرب انداز کا کندھا

”یہ تم لاہور جا کر کرنے گئے ہو یا پاکستان کا ٹور کرنے گئے ہو؟“ وہ انتہائی غصے میں تھے۔ وہ تو غیبت تھا کہ ان کے لہجے کی گرمی اور آواز کی کڑک سے فون نہیں جل گیا۔ فلک بے چارہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

”دراصل وہ بابا، ماموں کہہ رہے تھے۔۔۔۔۔“  
”ہاں، ہاں نیچے پتے پہنچو ڈیڑھ پہلے ہی منصور کافون آیا تھا۔ بچوں کی چٹھیاں ہونے والی ہیں اس لیے آؤ ٹنگ کا پروگرام بن رہا ہے لیکن تم تو گھر میں گرو اور جاب کی طرف توجہ دو۔“ ان کا لہجہ بدستور آگئی تھا۔

”جی وہ میرا بھی لانگ ویک اینڈ ہے۔“ وہ بہ مشکل کہہ رہا۔

”اچھا؟؟ چھاٹھیک ہے۔“ وہ بڑبڑائے۔  
”سوری بابا، آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔“ وہ شرشار سے بولا۔

”you better“ اور ساتھ ہی فون کھٹ سے بسند ہو گیا۔

”ادو میرے خدا!“ اس نے جلتے چھنجھناٹے کانوں پر ہاتھ رکھ کر سر کھرا لیا۔ وہ تو غیبت تھا کہ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ سب کے درمیان بیٹھا ہوتا اور ایسی ہیبت ناک مہماری سب کے سامنے ہوتی تو کیا عزت رہتی۔

کتنی ہی بار وہ سینے کی بائبل سنہانے کی کوشش کرتا رہا لیکن جذبہ تھے کہ اٹھ بھٹل ہو رہے تھے شاید پاپا ٹھیک کہہ رہے تھے۔ بچوں کی چٹھیاں تھیں اسے ساتھ تھیں ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اپنا وہامیان صرف اور صرف کام پر ہونا چاہیے تھا۔ اس نے فوراً دل کا بوجھ ہٹا کر گئے کے لیے راجیل کو دکھ بھری داستان سنائی۔

”بھلے آدمی تم سے یہ تھوڑی سی کہا تھا کہ استادوں سے مشورہ کیے بغیر ایک ہی جہت میں مہالیر سر کرلو بحیرہ عرب کو تیر کر پار کرلو۔ میرے بھائی نواز شاد اور مہرا بیوں کے اہل ذرا آہستہ آہستہ لگاتے ہیں جال درادرجے دجے پھیلاتے ہیں تاکہ۔۔۔۔۔“  
”تاکہ کیا؟؟“ فلک نے بے مہری سے اس کی بات کاٹی۔ ”جب نسخہ عیادت فرمایا تھا تو اس کے ساتھ احتیاطی تدابیر بھی بتائی چاہیے تھیں نا۔۔۔۔۔ تاکہ رومل کی صورت میں بندہ اپنا بیچ بچاؤ کر سکے۔ جب لوگ ڈی وی ڈی، میگزینز، چائیز فوڈ، کباب پارٹی اور کتا بوں سے خوش نہیں ہو رہے تھے تو سہیل بھائی کے ساتھ مل کر آؤ ٹنگ کا پروگرام بنایا۔ اس امید کے کہ ٹھنڈی ٹھنڈی معطر اور ہری بھری وادیوں میں گھومتے پھرتے کوئی ناکل یہ اتفاق ہو جائے اور یوں سرد مہری اور بے رخی کی دیواریں ٹوٹ کر جائیں۔ سیاہ بادلوں میں چھپا امید کا کوئی تمنا تار اٹھائے گئے۔ گھٹکھڑکھٹائیں۔۔۔۔۔“

”خدا کے لیے فلک میرا داغ پتی بنتی کر، میں سب سمجھ گیا ہوں، میرا مطلب صرف یہ تھا کہ سہیل آپس میں مشورہ کر لیتے، پکا پروگرام سیٹ کر لیتے تو آج میں شکایت کا موقع نہ ملتا۔ اور اٹکل اتنے باہر نہ ہوتے۔ اور ہاں تم مجھے اتنی کاٹھی کا ڈنڈی کا درد بولا کہ رو کر بچنے بچنے ڈھونڈتی پڑے۔۔۔۔۔ ناکل باتفاق یہ کیا ہوا بھلا؟ اور اوپر سے شاعر بھی ہوتے جا رہے ہو، درد مہری کی دیواریں، سیاہ بادلوں سے جھاگتے ستارے، گھٹکھڑکھٹائیں۔۔۔۔۔ نہیں ڈی وی پر موسم حال ستانے کا کوئی پروگرام تو جوائن نہیں کر لیا؟“

راجیل نے چوٹ کی۔  
”نہیں بھئی، بس آج کل ذرا خواتین کے معصوم معصوم سے بوجھ لے جائے میگزین سے استفادہ کرنا۔۔۔۔۔“  
”فلک بھئی، تو زبان و ذہن کا ساتھ دے سکے۔“ فلک بھئی

کہ اور خوشہ چھوڑا۔

”کون سے میگزین؟“ راجیل نے تانہ بانہ بولا۔

”کئی بلند یا یہ میگزین ہیں۔“

”جہنیں یہ کہاں سے ملتے ہیں؟“ راجیل پھر

پہلے ہی سے بولا۔

”عموماً عالیہ بھائی کے کمرے سے اور کبھی کبھی

بھائی کے کچے کے نیچے ہے۔“

”سہیل بھائی off all people“ راجیل

جھرت سے بڑبڑایا۔

”وہیے ہرک انساں پر بھی مل جاتے ہیں، کو تو

تھہارے لیے بھی لا دوں؟“

”میں تو حیران ہوں آج کل کل کیا کیا کتنے سوچ

لپتے ہو، ٹھٹھل اردو، خواتین کے میگزینز، سرسبز

اداراں، سیاہ ہادل۔۔۔۔۔ آپ پہلے تو ایسے نہ

تھے؟“ راجیل نے چھیڑا۔

”واقعی پہلے ایسے نہ تھے بس حضور کی صحبت اور

کھیل کا اثر ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو میرے دوست، یا فلک

ہری ایک بات غور سے سنو بھل کرنا نہ کرنا تمہارا کام

ہے۔ سب کے چہروں پر دو دو آنکھیں نہیں دو رہیں

فلک ہوتی ہے اور سروسوں میں کمال کا بیجا۔ تمہاری

فرخ بھس نہیں بھرا ہوا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ

فلک جی کہ کہیں تمہارا بھانڈا اسراہ نہ پھوٹ جائے

اور تھل تھل، کھلی پکارتے پال بکھرانے کر بیان چاک

بھال روڈ پر چلتے پھرتے نظر آؤ۔“

”کیا تم مطلب کی بات مختصر اور ذرا سیدھی نہیں

کر سکتے؟“ اس کی روایتی بے یقینی، کیا تم نے مجھے بالکل

سمجھ رکھا ہے اگر تم میرا یہ مسئلہ حل کرنے میں میری

بھائی نہیں کر سکتے، مذہب نہیں کر سکتے تو سیدھے

مے بتا دو نا۔ میں خود مرکب لوں گا فلک فلک واقعی

اٹھیں آ کر بولا۔

مبکی ہوئی اک شام تیری ساگرہ ہو

آج کے روز تیری نظریاں کرلوں جانوں

جان تو پہلے ہی تیرے نام لگا رہی ہے

اسے میری جگہ کے تارے تیری خاطر میں نے

اپنی بھراس کے ہونٹوں پر دغا رکھی ہے

چاہت ہو خوشی ہو تیرے دامن میں دنا ہو

مبکی ہوئی اک شام تیری ساگرہ ہو

اس دن کے قصور سے سنو جاگیں غفار سے

اس دن تیرے قدموں میں بکھر جائیں ستارے

اس دن یہ میری ڈیوٹ کا کھڑو فدا ہو

مبکی ہوئی اک شام تیری ساگرہ ہو

ہے آج کے دن میری عبادت کی بھی ہوں

انصرہ میری جان تیرے لب نہ بھی ہوں

غم کی نہ بھی پھر دھانیں بے گنا ہو

مبکی ہوئی اک شام تیری ساگرہ ہو

میرزہ رواں دایا جلا ہوا رکھے

اللہ جہاں میں تجھے بٹسا ہوا رکھے

پوچھنا نہ بھی تم تیری چٹوں کی بردا ہو

مبکی ہوئی اک شام تیری ساگرہ ہو

تو جی نہ ہو میری طرح نا کام محبت

اچھا ہو میری جان پر اتنا حیران محبت

محبوب کی آنکھوں میں تمہاری ہی فیا ہو

مبکی ہوئی اک شام تیری ساگرہ ہو

چاہت کے دلوں سے بھی جذبہ نہ تم ہوں

ایسے ہی اکروں تو یہ دن رات نہ تم ہوں

اللہ کے سر میری تجھ کو عطا ہو

مبکی ہوئی شام اک شام تیری ساگرہ ہو

شاعر: بلیر احمد

سرمد: امینہ عابد، سلاووالی





عالیہ بھائی نے مجھے تنگ انداز میں کہا۔  
 ”چلیں، آپ یوں ہمت نہ ہاریں۔“  
 میں ہوں نا، اب آپ تھوڑی دیر ریٹ کریں تب تک  
 میں یہ چیزیں سنبھال سکتی ہوں۔“ عالیہ نے پیار سے  
 ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔  
 ”اچھی فلک بھی آتا ہی ہوگا تمہارا ہاتھ بنادے  
 گا۔“ عالیہ نے یوں کہا جیسے یہ روز کی بات ہو۔  
 ”بھائی ایک بات پوچھوں؟“ عالیہ نے فرخ  
 میں سے شہنشاہ پانی کی بوتل نکالنے ہوئے کہا۔  
 ”پوچھو.....“ عالیہ نے ہنس دھیر سے کہا۔  
 ”کیا مسٹر فلک کے بغیر ہم کب لوگ دفتر کے  
 لیے نہیں جاسکتے؟“ عالیہ کے سوال میں ہلکا سا طعنے کا  
 لہجہ تھا۔  
 ”جانتا تو کتنے ہی گڑیاں۔“ لیکن کچھ مناسب نہیں  
 لگتا کہ ہم تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہری بھری فضاؤں  
 کے مزے لے رہے ہیں اور وہ غریب کیا کیا لوگ  
 کے سہارے گرمی میں جلتا رہے۔ آخر وہ ہمارا  
 مہمان بھی تو ہے۔ خود سوچو کیل کس کس کو سنبھالیں  
 گے اور پھر ایک ایک شرا ڈرا بیکری بھی تو ضرورت  
 ہوگی۔“ عالیہ نے شریرانہ نظروں سے اس کی آنکھوں  
 میں جھانکا۔  
 ”یہ تو آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“ عالیہ فوراً مان گئی۔  
 ”تم مجھے ایک بات بتاؤ ملیدہ تم فلک سے اتنی  
 ابر یک کیوں ہو؟“ عالیہ نے بڑی بھادوں کے ساتھ  
 انداز میں سوال کیا۔  
 ”اگر یک اور میں؟ اور وہ بھی مسٹر فلک سے،  
 تو یہ کریں، میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی۔ آخر  
 پہلے ہی تو ہمارے سارے کام ان کے بغیر ہوا کرتے  
 تھے۔ اب گھر کے ہر چھوٹے بڑے فرد کو ہر کام کے  
 لیے ان کے مشورے اور مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔  
 آخر کیوں.....“ عالیہ نے ذرا تجویز کی ہے پوچھا۔  
 ”کیونکہ اب وہ اسی گھر کا ایک فرد ہے، تھوڑی  
 194۔“

بہت سہل کرنا اس کا فرض ہے اور اس کی دیکھ کر  
 ہمارا۔“ جانے کیوں عالیہ کے لیے جیسے ہلکا  
 کر دیا یوں محسوس ہوا۔  
 ”یاں تو تو ٹھیک کہتی ہیں، میں نے تو یونہی ایک  
 بات کی تھی۔“ اچانک عالیہ کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ  
 ہی بول رہی تھی۔  
 ”یہ جو ایک لفظ یونہی ہے نا، یہ یونہی نہیں ہوتا۔  
 اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی سوچ، کوئی خیال ضرور ہوا  
 ہے۔“ عالیہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔  
 ”آپ بھی نا بھائی بات کہاں سے کہاں سے  
 جاتی ہیں۔“ اس نے شرمساری سے نظریں جھکا لیں۔  
 ”دیکھتی ہوں اس جادوگر کے جادو سے کہ  
 تک بچوگی۔“ عالیہ نے دل ہی دل میں سوچا پھر اٹھتے  
 ہوئے بولی۔  
 ”میں ڈراما سوں اور ممائی کا پتہ کر دوں، دھلائی  
 کا کچھ سامان ہو تو ڈانگ شیشن میں ڈال دوں۔“  
 عالیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔  
 ”آپ بیٹھیں میں پتا کر کے آتی ہوں۔“ عالیہ  
 نے پیشکش کی۔  
 ”تم رہنے دو میں جاتی ہوں، جب تک تم اچھی  
 سی جائے بنا کر رکھو پھل کر بیٹھتے ہیں۔“ عالیہ نے  
 جاتے جاتے کہا۔ وہ چھوٹی سی کتلی میں چائے دم گرم  
 تھی کہ فلک بلائے ناگہانی کی طرح آن پہنچا۔  
 ”آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں چائے پینے آ رہی  
 ہوں؟“ اس نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے خوش دل  
 سے پوچھا۔  
 ”عالیہ نے فائز ایکس میں چائے بنا کر فلک  
 کی طرف بڑھایا تا کہ اس کا دھیان جلتی اٹنی چائے  
 کی طرف ہو اور غیر ضروری سوالات سے پرہیز  
 کرے۔“  
 ”جب تک چائے ذرا ٹھنڈی ہو، مجھے کچھ کام  
 194۔“

بتادیں۔“ اس نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔  
 ”عالیہ جو شین کی طرف منہ کیے قہر میں دھوری  
 تھی، ایک گہری سانس لے کر مڑی، اسے پتا تھا کہ یہ  
 بندہ بشریوں نہیں بلگا اور اسے اپنے ڈرامے کا پہلا  
 سین بھی تو شروع کرنا تھا۔ جس کی وہ ریمپرل کر رہی  
 تھی۔  
 ”آپ یوں کیجیے فلک صاحب کہ جو تیکری کا  
 سامان ہے اس کی پینکٹ میں احتیاط سے رکھ دیں  
 اور یہ جو شاپر ہیں بی بی المال فرخ میں رکھ دیں، ان کو  
 صبح پیک کر لیں گے۔“ عالیہ اس کے چہرے کے  
 تاثرات، دیکھتے دیکھتے کتلی کی پینکٹ کی طرح آڈر دے  
 رہی تھی۔  
 ”بت بے کھڑے فلک کے کانوں میں جیسے مٹی  
 مٹی نکلیں انج رہی تھیں آج پہلی بار عالیہ نے اس  
 سے براہ راست گفتگو کی، وہ بھی اتنی مٹی اور خوب  
 صورت خرابی ہوئی پر بڑی سونٹ کی مسکراہٹ بھی  
 تھی۔ اسے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ زمین پر کھڑا تھا یا  
 آسمان کی نیلا بھوں میں جو پرواز تھا۔  
 ”اس کے علاوہ گوشت اور تھپے کے پکٹ  
 فریزر میں رکھ دیجیے، صبح یاد سے انکس میں رکھنے  
 ہیں۔“ وہ دسر ڈاؤن تھا، ٹیضا ٹیضا شہنشاہ جیسا۔  
 ”مٹی میں سمجھ گیا جو آپ کہہ رہی ہیں۔ دیا ہی  
 ہوگا پہلے یہ چائے پی لیں۔“ وہ دل کی زنجیریں سنبھالتا  
 کرسی کیٹھن ہو گیا۔  
 ”یہ خیال ہے چائے کے ساتھ یہ بھی نوش  
 جان مانجیے تا کہ اتنا جان لیوا مشن شروع کرنے سے  
 پہلے کچھ جان میں جان آجائے۔“ عالیہ نے ایک  
 لفافے میں سے خستہ بیٹھیر نکال کر پلیٹ میں رکھے  
 فرخ نے کچپ کی بوتل نکالی اور دونوں چیزیں فلک  
 کے سامنے رکھ دیں۔  
 ”وہ..... وہ..... مٹی.....“ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا

لیکن حیرت کے پہاڑ کچھ اس طرح ٹوٹ کر اس پر  
 گرے تھے کہ کچھ کہہ نہ سکا۔ شکر یہ بھی نہیں  
 ”بس اس شروع ہو جائیں ورنہ چائے ٹھنڈی  
 ہو جائے گی اور اچھی کتنا سارا کام بھی ہے۔“ عالیہ یوں  
 مڑی سے اور کچھ بولی رہی تھی جیسے ہمیشہ ایسے ہی  
 بولتی رہی تھی۔  
 اصر فلک کا ٹوٹا ہوا بدن میں ابھٹیں والا حساب  
 تھا۔ وہ سخت ترس ہو رہا تھا۔ کتنا کی ڈے تھا آج۔  
 عالیہ نے اسے نہ صرف اپنی ذہنی قہم بلکہ اپنے ہاتھوں  
 سے چائے بنا کر دی تھی۔ بڑے مہذبانہ انداز میں  
 بات کی تھی۔ وہ فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ آج سورج  
 مخالف سمت سے نکلا تھا یا وہ کوئی سہانا پتا دیکھ رہا  
 تھا۔ وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ عالیہ کی مدد آواز سننے  
 چوٹ لگادی۔  
 ”آپ فارغ ہو جائیں تو کام شروع کریں۔“  
 ”جی ہاں تم کیا کرتے؟“ اس نے جلدی سے  
 خالی گ۔ ایک طرف لٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اب  
 بتائیے کون سے شاپر کون سی باسکٹ.....“ اس نے نشو  
 سے ہاتھ پوچھتے ہوئے پوچھا۔  
 ”عالیہ کے دل میں آئی شاپر سارے کچل کر ان  
 کے اندر کا چورا فلک کے سر پر اٹا دے اور باسکٹ  
 کھول کر سر پر اونٹنی رکھ دے۔ اس کی گھبراہٹ  
 ریشہ کھی اور پریشانی دیکھ کر کچ سے اپنی اپنی روٹی  
 مشکل ہو رہی تھی۔  
 فلک کا دل چاہ رہا تھا، سارا دن کچن میں گزار  
 دے، چاہے وہ پینکٹ کروائے، برتن دھوئے کھری  
 کھری سناتی رہے لیکن رہے اسی طرح آڈر  
 دیتی، ہدایت دیتی، روک ٹوک کرتی بس آنکھوں کی  
 پیاس بجھتی رہے۔ بہت سادہ بہت سادہ لیکن ہر چیز کا  
 ایڈوٹ ہونا ہی ہوتا ہے، وہ ابھی حسبِ ہدایت نکلی  
 باسکٹ میں سامان ترتیب سے رکھ رہا تھا کہ عالیہ آئی  
 194۔“

اور دونوں کو مل کر کام کرتا دیکھ کر حیرت سے بڑی بڑی آنکھیں کھولے یہ کیا پلٹ دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

وہ کھڑکی میں کھڑا دھندلی رخ پہلج جسٹن دیکھ رہا تھا۔ دور دور تک سرخمی سی دھند چلی ہوئی تھی۔ نئی کوئی کرنیں دھند کے نازک پردے اٹھا کر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گھر کے اندر سے بھی اب مدھم مدھم سی آوازیں آتی شروع ہو گئی تھیں۔ لگتا تھا سارے لوگ گہری نیند سے اٹھ کر روزمرہ کے معمولات کا آغاز کر رہے تھے اور پھر آج تو بہت خاص دن تھا، کیسے کہلی تان کر سوتے رہتے؟

اس نے ایک نگاہ کمرے میں ڈالی..... اس کا بیگ اپنے اندر پار پار چوڑے چوڑے اور ضرورت کی دوسری اشیا سینے پیار تھا۔ اس کی نظروں کا کلاک پر..... پڑی، چھوٹا سا رہا تھا۔ ان کی روگائی میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ کیوں نہ ذرا دیر کے لیے کمرہ سیڑھی کر لے۔ یوں بھی ساری رات جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے میں گزری تھی۔ ایک لمحہ بھی ایک سے پلک نہیں جڑی تھی۔ نہ اس نے سونے کی کوشش کی نہ اسے نیند آئی اور یہ بھی تو حتمی کہیں وہ آنکھوں کے پردوں سے چٹکیں نہ موٹا کر رہی صورت..... مگم نہ ہو جائے۔ کہیں کافوں میں گوجہی مدھری آواز بند نہ ہو جائے۔ کہیں علیحدہ کے نام کا جاپ کرنے والا سرتوں کے جھوٹے دل جھک کر سونہ جائے لیکن اب ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد سب نے آنکھا ہوتا تھا۔ ان میں وہ بھی ہو گئی اور وہی اس کے امانوں بھر سے دل کی سرشاریاں..... مٹی سوچ کر وہ بیٹ پر آ کر لیٹ آ گیا اور دوسرے ہی لمحے نیند کا سرسرا تا آنچل اس کی آنکھوں پر پھسل گیا۔ پتا نہیں ایک گھنٹہ گزرا تھا یا ایک ہل علیحدہ کی آواز نے آنکھوں

پر پڑا غفلت کا پردہ کھینچ لیا۔

”جسٹن! اٹھ جا! بارہ بجے ہیں، سب تیار ہو گئے ہیں۔“

”میں بھی بالکل تیار ہوں بے بی، تم چلو میں پانچ منٹ میں آیا۔“ اس نے علیحدہ کے نرم کافوں کو پیار سے چھوا۔

”اچھا اب دیر نہ کریں ورنہ ہم پیچھے رہ جائیں گے۔“ علیحدہ لاڈ سے بولی۔

”میں آ رہا ہوں جانی۔“ اس نے علیحدہ کو تسلی دی اور خود دواش روم کی طرف بڑھ گیا۔ سونہ علیحدہ جلدی ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارے اور بالوں کو دوست کر کے باہر آیا۔ پتا ہیگ اٹھا یا اور جلدی جلدی نیچے کیا گیاں افراٹری پہلی ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد جب وہ سب کی ہمراہی میں دل میں ایک نئی گان اور حوصلہ لیے آنکھوں میں سنہرے اور سہانے خواب بجائے ایک سے سفر پر روانہ ہوا تو زندگی کے خوب صورت نظریں قاتل میں دیکھتی تھی کلیوں میں اس کا بھی شیر تھا۔ اس نے جھکتے ہاتھ بڑھا کر وہ بیکرہ گلیاں اٹھائیں اور ان کی حیات آفریں خوشبو اور ملاحت سے اس کی روح کی سوتی سوتی وادی مہک اٹھی۔

بے نشان منزل کا کوئی پسا نشان مل جائے تو.....؟ یہ قرار دل کی ساری چٹا منٹ میں جانیں تو.....؟ کیسے یہ تاب دل میں مچھلے پیاں سی چھوٹے لگتی ہیں۔ ذہن میں فکر و اندیشے کے اٹھتے طوفان جب شانت ہو جاتے ہیں تو انسان اپنے آپ کو کتنا فری اور ہلکا جھکا سمجھو کرنے لگتا ہے۔ کتنی جلدی بہل جاتا ہے۔ آرزو کی کوئی تھی سی کرن جھگمگے تو کیسے اس کا نور پکڑنے کو پکڑتا ہے۔

نہ راستے کے سراب نظر آتے ہیں۔ نہ دھند نہ کنکر نہ کانٹے، فلک کی ذہنی اور روحانی حالت کچھ

بھوکے ہو۔“ فلک نے ہنسنے سے پہلے ہی کوئی پاس کی کوئی چیز ہی متاثر نہیں کر دی تھی۔ علیحدہ کے رویے میں بھی کسی ایک نظر آتی ساری دنیا ہی بدلی بدلی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ سمجھ رہی تھی اس نے سب سے پہلے راتیں کونوں کیا تھا۔

”اب اٹھ بھی چکو یا! آدھا دن گزر گیا لیکن تمہاری نیند ہی ختم نہیں ہو پانی۔“ اس کی غنودہ ”ہیلو“

فلک کا دل ہی جلائی۔

”تم بھی تو جیجی سر پر سو رہا ہو جاتے ہو۔“ لگتا تھا راتیں اب بھی پوری طرح بیدار نہیں تھا۔

”صبح صبح.....“ غصہ خدا کا تمہیں پتا ہے کیا وقت ہوا ہے؟“ فلک کا بلایا۔

”اچھا..... اچھا..... پتا وہاں کیا رہتی ہے، کوئی زلزلہ..... کوئی سونامی..... یا پھر..... قیامت.....؟“

راتیں کی فطری خوشی اجاگ ہو گئی تھی۔

جواہر فلک نے موتی موتی ہیڈ لائنز سنائیں۔

”خدا کا شکر ہے کوئی کوشش تو رنگ لائی بہت بہت بدھائی۔“

”بس دعا کرو امی، جوش میں سمجھا، محسوس کیا کوئی خواب ہے ہو۔“ اچھا پھر بات کروں گا کبھی بھائی

کافی کے گگ لیے اور ہی آ رہے ہیں۔“ وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔

”ساتھ میں کوئی اسپیک ٹیک بھی ہے یا خالی خالی کافی۔“ راتیں نے لپٹائی آواز میں کہا۔

”پتا نہیں، ویسے دو تین شاہ پرتو ہیں“ فلک نے سر کوئی کی۔

”اللہ اللہ ابھی سے یہ خاطر دیاں، گرم، گرم، گرم کافی اور goodies مزے ہیں تمہارے۔“ راتیں نے چھیڑا۔

”تم جیجی اٹھ کر چار چھ پراٹھوں اور درجن بھر امداد کا ٹافٹا کرلو۔ ترس تو یوں رہے ہو جیسے اڑی

جنگ اس کی دیکھ کر اپنے آپ کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ چیختر اس کے کالیہ شرارتی نظروں سے پیچھے دیکھتے ہوئے اسے ہاتھ میں پکڑا میگزین کھول کر آنکھوں کے سامنے رکھ دیا۔

”اچھا ہوا مسلمان اور تو بھی وقت بے بیخبر گئے۔“ اس کیل نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

”ہم بھی بہت مس کر رہے تھے پاپا۔۔۔“ علیہ کے ساتھ بیٹھے بچے ایک زبان بولے۔

”چلو اچھا ہے۔ آپ کو بھی کھنی ملنی لگی۔“ سیل نے جواب دیا۔

علیہ چند منٹ بچوں کی باتیں سنتی رہی پھر ہاتھ میں پکڑے میگزین کے صفحات میں کم ہو گئی یہاں ایک دلچسپ ہی نہیں پر فکرمند بحث چل رہی تھی اور حسب حال تھی۔

”میں جانتی ہوں خار کی بے وفائی نے تمہیں۔

گہرا صدمہ پہنچایا ہے۔“ گتھت ہوراندہ بولی۔

”ہاں اس کی بے وفائی میری آرزوں،

ارمانوں اور خواہشوں کی موت تھی۔“ روحانہ بہ مشکل کہہ سکی۔

”میں مانتی ہوں یہ درست ہے مگر قدرت کے

کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے؟ یہ چوٹ ہے زخم

سب نصیب کی بات ہوتی ہے۔ انسان تو صرف مبر

کر سکتا ہے۔“ گتھت نے پیار سے اسے اپنے ساتھ

لگایا۔

”ہاں، یہ بہ قسمت کے کھیل ہیں لیکن چوٹ

دکھ تو دیتی ہے، دل تو خون کے آسودہ ہے۔ انسان

کب تک اور ایسے مبر کرے۔“ روحانہ کے آنسو ہم ہی

نہیں رہے تھے۔

”ہاں، یہ سب زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ جس

۔۔۔۔۔ سے مفر نہیں لیکن اس سے زندگی کا رنگ اور

کائنات کا حسن پیکا نہیں پڑتا۔ چاہے انسان اندر سے ریزہ ریزہ ہو جائے کچھ بھی نہیں بدلے۔ وہی شب و روز، وہی مسملا، وہی رنگ بدلے موسم، وہی ذمے دار ہیں، وہی فرائض سب کو ساتھ لے کر زندہ رہنا پڑتا ہے۔ زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے جس کی حفاظت ہر انسان کا فرض ہے جس اپنے حوصلے، ہمت اور قوت برداشت کوئی قوت دینی پڑتی ہے۔“ گتھت نے کسی اسکا لری طرح سمجھایا۔

”اور یہ سب کہاں سے آئے گا۔ بلند حوصلہ، ہمت، وغیرہ آئے گا کیسے؟“ روحانہ طنز آہولی۔

”کوئی مشکل نہیں۔ صرف اپنی سوچ بدلنی پڑتی

ہے۔ اپنا ذرا دیکھ بدلنا پڑتا ہے۔ ماضی کا بوجھ ہینک

کر اچھل میں تازے پھل بھرنے پڑتے ہیں۔ بس

ذرا اپنے آپ کو بدلنا پڑتا ہے۔ ٹوٹے خوابوں پر

آنسوں بہانے کے بجائے نئے خواب بننے پڑتے

ہیں۔“ گتھت جانے کون سا فلسفہ جھاڑ رہی تھی۔

”لیکن کیوں۔۔۔؟“ روحانہ جیسے جیسے پوچھ

پڑی۔ ”یہ تبدیلی میں ہی کیوں لاؤں؟ میں خود کوئی

پھوٹی، زخموں کا شکار، رسوا، زخموں اور بدنامیوں کے سیاہ

رنگ میں گر چکی ہوئی، میں ہی کیوں یہ سب کروں؟“

”صرف زندہ رہنے کے لیے اور اللہ کی دی

ہوئی امانت زندگی کے لیے۔ ہر دکھ ہر کھ کے ساتھ زندہ

رہنا انسانیت کی معراج ہے۔ اس کی سرخروئی ہے،

اس کی عظمت ہے۔“

جوں جوں وہ پڑھتی جا رہی تھی، توں توں پہلو

میں کوئی چیز ٹوٹنے کا گنج کی طرح چپے چارے تھی اور

پکڑوں کے نیچے کی طرح ہوتی جا رہی تھی۔ میگزین

میں لکھی ہوئی خبر اسے اپنے ماضی اور زندگی کا عکس

محسوس ہو رہی تھی۔ مصنف نے جو بھی حقیقت بیان کی

تھی جانے کیوں اسے اپنی زندگی کا ایک حصہ لگ

رہی تھی۔ جیسے وہ اسی سے مخاطب ہو، اسے ہی سمجھا

رہی ہو۔ اس کوئی زندگی کی راہ دکھا رہی ہو۔

”وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ زندگی ایک امانت ہے، اس کی حفاظت کرنا میرا اولین فرض ہے۔ میری زندگی میرے والدین اور بھائی بہن سے جڑی ہے اور مجھے ہر صورت یہ ذمے دار بننا ہی ہیں۔“ علیہ نے میگزین بند کر کے اپنے قریب رکھ لیا۔ زندگی کے قارئینوں میں یہ خوش رنگ چھوٹے چھوٹے میگزین زندگی کے کتنے بڑے بڑے سبق سکھا دیتے ہیں۔

تاریک راہوں میں نئے نئے چراغ روشن کر دیتے

ہیں۔ وہ ہاتھ میں پکڑا میگزین دونوں ہاتھوں میں

دبا لے کھڑکی سے باہر دوڑتے تھے ہاتھ درختوں کو دیکھ

رہی تھی۔ گلے کی ٹھن سے سانس لینے خواہش اور

آنکھوں میں چنگاریاں بھری تھیں۔

”اب میری زندگی میں یہ بھی کئی۔۔۔۔۔ نہ وہ

جذبات نہ وہ آرزوئیں نہ وہ خواب بھی کچھ تو برباد

ہو گیا۔ دل کی سنہری خواہشیں اور آنکھوں کے

جگمگاتے خواب اسی دن اور ریزہ ریزہ ہو گئے تھے جس

دن تو قیر نے نگاہیں بدل دی تھیں۔ طور طریق بدلے تھے

اور پھر بڑے جا کر کسی اور سے شادی کر لی تھی۔ منطقی

خوب صورت اور معصوم سارشیہ توڑ کے نہ صرف

انازو مال بھرا دل توڑا بلکہ شفاف پیشانی پر رسوا نیلیاں

اور بدنامیوں کی سیاہی بھی مل دی۔“ شاید لوگوں کے

لیے منطقی کا رشتہ ایک کھیل یا معمولی سارشیہ لگانا ہو لیکن

علیہ جیسی خوددار۔ اور غیرت مند لڑکی کے لیے موت

سے کم نہیں تھا۔ بھگتارے جانے کا احساس یا کتر کے

جانے کی چوٹ تو زندگی کی سب سے گہری چوٹ ہوتی

ہے۔

”اب میرا مقصد حیات صرف اور صرف اپنے

بیادوں کی خدمت ان کی دیکھنی اور دیکھ بہا کرنا

ہے۔ اب میری زندگی میں کوئی قصہ خیر یا فلک نہیں

آ سکتا۔“ اور پھر اس کے ہونٹوں پر بے اختیار ہنس بکسی

مسکراہٹ آگئی۔

”تھو خیر اور فلک۔۔۔ کیا کیمینشن ہے۔ میں بھی اکثر ساری حدیں پار کر جاتی ہوں۔ بے چارہ فلک اب اتنا بھی برا نہیں ہے۔“ اس نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے اپنے آپ کا اندر ہی اندر جھڑکا۔

”تو اس کا مطلب ہے فلک، تو قیر اور قنو

خیر سے اسے اچھا ہے۔“ معصوم سے دل نے سرگوشی

کی۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔ سب ایک ہے ہیں۔“ اس نے

ڈانٹا۔

”اور اس کا دل گم مہم سا ہو گیا۔

”ہاں سب ایک ہے ہوتے ہیں پھر میں کسی کی

آنکھوں کے خاموش پیغام کیوں پڑھوں؟ کسی کا

الفاظ بھرا ہاتھ کیوں خاموش؟ پھر نئے خوابوں کی

بستی کیوں آباد کروں؟ گتھتوں ارمانوں کی ان تکیوں

کے پیچھے کیوں سرگرواں رہوں جو ایک ہل جلی نہیں

غیرتیں۔ کیوں کسی کی دستک پر دروازہ

کھولوں؟ کیوں اندر آنے کی اجازت دوں؟ کیوں

خیر مقدم کروں؟ کیوں چادر کے کھیل کو حقیقت کا

روپ دوں؟ نہیں۔۔۔۔۔ یہ نہیں ہو گا مجھ سے۔۔۔۔۔ کبھی

نہیں ہوگا۔ اس دل کے دروازے پر اتنی زنجیر پڑی

ہے جو نہ کھلے گی نہ ٹوٹے گی، چاہے دستک دینے

والا فلک ہو یا آکاش، آسان ہو یا عرش۔ یہ دروازہ

ہمیشہ بند رہے گا۔ ہمیشہ۔۔۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔۔۔

وہ جانے کن وادوں میں رواں دواں تھی، کن

گہرائیوں میں غرق تھی کہ چاک بکلا سا جھٹکا کھٹکے

چوٹک پڑی۔ تینوں گاؤں ایک لائن میں رکھ دیتی

تھیں۔ چوٹی بڑی آوازوں کا کلا جلا شور پر پاتا۔

اسی شائیں،

سکیل اگلن شائیں

ماموں جان شائیں



”ٹھائیں نہ ہوئیں گرم گرم کپڑے ہو گئے جو ہلے بھر میں کوئی اٹھا کے لے جائے گا۔ دنیا بھر سے نرا لے جتے ہیں۔ فلک بے پٹی اتر کر سنبالو ان کو۔“ ماموں ایک گہری سانس لے کر بولے۔  
فلک ابھی اپنا دروازہ کھول بھی نہ پایا تھا کہ خواتین لڑکیوں اور بچوں کی پوری پلٹن اتر کر سڑک کے کنارے کئی لائن میں غلی رنگ رنگ شالوں پر حملہ آور ہو چکی تھی۔

”ماموں آپ ذرا بچوں کا دھیان رکھیے گا پلینز، کہیں سوک پر نہ نکل جائیں۔“ فلک اس انفرقٹی سے سخت فیشن میں تھا۔  
”یہ گرمیوں میں گرم شالوں کی خریداری میری سمجھ سے تو باہر ہے۔“ ماموں سخت طے ہوئے تھے۔  
”یہی تو بہاں کی سوغات ہے، گفٹ دینے کے کام آتی ہے۔“ ممانی نے دو پٹا درست کرتے ہوئے پرس سنبالا۔

ابھی پٹرول پمپ روانے رکے تھے تو بیچ ساری ٹک ٹاپ ہی اٹھالے تھے۔ ذرا سنبھال کے ابھی آگے خرچے ہی خرچے ہیں۔“  
”کسی کو خوش دیکھنا تو آپ کو آتا ہی نہیں۔“ ممانی بڑبڑا رہی۔  
آدھ کھٹنے کی مسلسل بک بک جھک جھک کے بعد میں پسند شالوں کی خریداری مکمل ہوئی۔ شاپرڈ کی میں رکھے گئے اور سارا خاندان خوش خوشی آگے کو روانہ ہوا۔

”قاتلین بھی اچھے دے رہا تھا۔ خاص کر وہ اسیل گرین اور خان کھلاوا، خیر ادا پسری پر دیکھو گی۔“ ممانی نے اپنی سانس درست کرتے ہوئے کہا۔  
”تو یہ نیک کام بھی آج کر لیا ہوتا۔“ میرا کیا ہے میں بس پر آجاتا۔“ ماموں نے طنز ا کہا۔ ممانی نے

چپ رہنا ہی مناسب سمجھا کیونکہ ایسی بحثوں کا کوئی انتہا نہیں ہوتا تھا۔  
ابھی یہ مشکل ایک کلومیٹر ہی طے ہوں گے کہ گاڑیاں پھر رستے کے انداز میں سلو ہونے لگیں۔ سسٹین نے اشارہ کر کے بتایا کہ گاڑی سڑک کے کنارے پر روکیں۔  
”کیوں بیٹے خیریت؟“ ماموں فکر مندی سے بولے۔

”آپ نے پھلوں سے لدے یہ اسٹال نہیں دیکھے؟“ سسٹین نے دوتا زہ، شاداب اور رنگ رنگ بے سبب پھلوں کی طرف اشارہ کیا۔  
”کیا سنہری سنہری آڑو ہیں اور سب تو دیکھ گئے ہیں۔“ ماموں خوشی سے پھولے نہیں رہے۔  
”آپ اتریں تو سبھی بس وہیں سے مزے لے رہے ہیں۔“ اس نے ماموں کو اترنے میں مدد دی۔

جس طرح خواتین نے اپنی خریداری کی تھی اسی طرح مردوں نے پھلوں کی چیز بڑے ڈبے گاڑیوں کے اندر تقسیم کر دیے گئے اور باقی کرینٹ ڈکی میں فٹ کر دیے گئے۔ سب سب سیٹل ہو گئے گاڑیاں چل پڑیں تو ممانی نے اپنا پرس کھولا چند لمبے کچھ کرتی رہیں پھر کسی کو غلط بے بغیر بولیں۔  
”میرے پاس واپس چنڈی تک کرایہ ہو جائے گا۔“

”اور اس سے آگے۔“ ماموں ہنسی دبا کر بولے۔  
”آگے اللہ مالک ہے۔“ ممانی بے اختیار ہنس دیں۔

”کوئی ایسی پر اہلم ہے تو میرے والے میں بھی تمہیں چار ہزار ہوں گے ہی۔“ فلک نے مودبانہ پیشکش

کی۔“ اسے نہیں بیٹے، تم فکر نہ کرو، جہاں رہنا صرف مجھے آزما رہی ہیں۔“ اور پھر یونی جیپر چھاڑ اور نئی مذاق میں یہ سزا پتی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔ اب جن راستوں پر یہ چھوٹا سا قافلہ چل رہا تھا، وہ سبز معطر اور فرحت بخش تھے۔ جھلی ہوئی سڑکیں گرد و غبار سے اتنی ہوائیں اور دم سخت کر دینے والی گرمی بہت پیچھے رہ چکی تھی۔ سب کے چہرے شاداب اور طبیعتیں چوچھل تھیں۔

اگر جس طرح طیگر اندر ہی اندر اپنی سوچوں میں گم تھی۔ کئی جوہر دکھا دیکھا جائے گا کہ مصداق سب کچھ بھلا کر سیکڑن کے صفحات میں کھجائی پانچوں سے ہنسی مذاق کرتے گئے۔ کئی عالیہ اور سیل کے ساتھ کسی بحث میں الجھ جاتی۔ اسی طرح دوسری طرف فلک ماموں ممانی کی ٹوک جھوک اور میوزک کی ہلکی لہروں پر بہتے ہوئے اندر خانے اپنے خیالوں کی وادی میں گم

تھا۔ دو تین بار اتفاقاً آیا ہوا تھا کہ اس نے طیگر بچوں کی کسی بیماری یا بات پر ملاحظہ ہوتے دیکھا تھا یا گھر کے کسی فرد کے ساتھ کھٹنے سے ہنسنے مگر اسے پایا یا اس کے چوت زہہ دل کے کسی کونے سے ہلکی لہر ابھر کر جب اس کے خوب صورت ہونٹوں کو چھو جاتی تو اس کی آنکھیں نہ اختیار ایک نورانی چمک سے لہریز ہو جاتی تھیں۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ اس کے دل کا دروازہ مگر شہ جان لیوا طوفان کے بعد بھی مکمل بند نہیں ہوا تھا۔ کہیں نہ کہیں ہلکی سی درجہ باقی تھی، جہاں سے نکل کر کوئی بھولی بھلی کرن اس کے لبوں کو چھو جاتی تھی۔ گم گم آنکھوں میں نئی جوت سی جھللائے لگتی تھی۔ یعنی ابھی امید کی رقم باقی تھی۔ شاید اسی کی ان تھک کوشش سے اس کے جذبہ راسخ سے کچھ گن سے وہ بے نشان سی روز بگم اور وا ہو جائے اور اس کے دل میں کسی پیار کی خوشبو اس

## جاسوسی

ممانی کی پلٹن میں  
اپریل 2012 شمار  
کی ایک خوش فہم رشتہ

**جنون •** مشرق کی کہانیوں میں پلٹن کی شہر کا شہر میں خبر

**مغرب کے نالے انداز •** مغربی کی کہانیوں میں پلٹن کی شہر کا شہر میں خبر

**کر داب •** پلٹن کی کہانیوں میں پلٹن کی شہر کا شہر میں خبر

**لکار •** طاہر جواد مدلل کے بعد پلٹن کی شہر کا شہر میں خبر



**چنی**  
**کن**  
**چنی**

آپ کے گھر سے  
شہر کی خوشیاں  
اپنی آنکھوں میں  
پلٹن کی شہر کا شہر میں خبر

**دیوانگی •** محبت کی کہانیوں میں پلٹن کی شہر کا شہر میں خبر

**کھانی دیکھانی •** سب کچھ کے کچھ پانے والوں کا کہہ سہروں کی دلچسپ کہانی

**سہروں کی کھانیاں**

راستے سے داخل ہو کر علیحدہ کے مہماتے  
دل کو گل و گلزار کر دے۔ پھر بہار

کر دے؟

”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ اس نے اپنے آپ  
سے پوچھا۔

”کیوں نہیں؟“ اس کے دل سے ایک  
آواز ابھری ”جب کسی کے فولادی جذباتوں  
دودھ کی تھریں بن سکتی ہیں تو تمہارے چٹائی جذباتوں  
کی شدت سے ان مٹ ارادوں سے نازک نازک  
سے گواڑیوں نہیں کھل سکتے؟“

”ضرور کھل سکتے ہیں، صرف صبر و استقامت،  
جرات اور ارادہ و دل ہمت کی ضرورت ہے۔ ساتھ میں  
آن تک حوصلہ اور بے پایاں جذبہ ہو جو جنت ہی جنت  
ہوگی۔“ اس کا دماغ آج دل کا ساتھ دے رہا  
تھا۔ پارٹیاں بولنے میں تو دونوں کو کمال حاصل تھا۔

”فلک بیٹے کن سوچوں میں گم ہو؟“ اچانک  
ماموں کی آواز نے اس کے خیالات کی سنہری ڈور  
کاٹ دی۔

”کچھ نہیں ماموں بس یونہی.....“ وہ کوئی  
معقول جواب نہ دے سکا۔

”ضرور آپ بھی سوچ رہے ہوں گے اس گلی کو  
رتی گلی کیوں کہتے ہیں اور اس کا مطلب کیا ہے۔“

بیچے سے کوئی بولا۔  
”تو واقعی سوچنے کی بات؟“ فلک نے ذرا  
سارخ پھیر کر بیچے جیسے چڑوں کی لائن دیکھی۔  
”نیکو میں سمجھاتا ہوں، عالم گم زبان میں رتی  
یا رتیرنگ رنگ کو کہتے ہیں۔“ ماموں منصور نے تمہید  
بانٹ دی۔

”لیکن یہاں تو سبز یا سبز رنگ ہے۔“ بیچے  
سے گزرنے میں آوازیں آئیں۔

”آج کا یقین ہو گیا کہ ان بچوں میں کوئی کٹر  
2020 ملحدانہ ہدایت ہے۔ اپریل 2012ء

بلا سبب نہیں۔“ ماموں کھل کر کہنے۔  
”بلکہ نہ کرے۔“ ممانی جو سیت پر سر رکھے

شاید سوچی سمجھی چونک کر بولیں۔

”یہاں ایک ایسا موسم آتا ہے جب سارے  
درخت سرخ پھولوں سے بھر جاتے ہیں اور جب وہ  
پھول زین پر گر جاتے ہیں تو یوں لگتا ہے سرخ  
پھولوں کی چادریں بچھی ہوں۔ اس لیے اس جگہ کو رتی  
گلی کہتے ہیں اور جہاں ہم جا رہے ہیں جہاں انکل  
کمال احمد کا خوب صورت گھر ہے اس جگہ کو ریشم گلی  
کہتے ہیں۔“

”کیا وہاں ریشم پھول ہوتے ہیں؟“  
”نہیں میری جان، وہاں دراصل شہباز  
درخت ہوتے ہیں۔ جہاں ریشم کے کیڑے ان  
درختوں پر رہتے ہیں اور ان بیڑوں کے ہرے  
بھرے پتے پتے کھا کر زندہ رہتے ہیں اور ریشم کا دھاگا  
بناتے ہیں۔ جن کو بیچ کر کے کارخانوں میں بیچ دیا  
جاتا ہے اور اس ریشم سے ریشمی کپڑا بناتے ہیں۔ اس لیے  
اس جگہ کو ریشم گلی کہتے ہیں۔“ ماموں نے پوری تفصیل  
سے سمجھایا اور یونہی اس علاقے اور خاص مقامات کی  
خصوصیات بتاتے ہوئے سفر کا اختتام ہو گیا اور منزل  
پر پہنچ کر سب کو یوں لگا جیسے وہ کسی اور دیس میں  
آگئے ہوں۔ جنت میں آگئے ہوں۔

☆☆☆

کمال احمد، ماموں منصور کے اُن دیرینہ  
دوستوں میں سے ایک تھے جو زندگی کے الگ الگ  
شعبوں میں کام کرتے ہوئے الگ الگ رہا ہوں پر  
چلتے ہوئے درمیان میں غافلہ ہوتے ہوئے بھی ایک  
دوسرے سے رابطہ رکھتے ہوئے تھے اور جب ایک  
بتیج دودھ پر بچوں کی یلغار سے گھر کا منصور ماموں  
نے کمال احمد کو فون پر ریشم گلی جا کر دو چار دن وہاں  
ضمہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو کمال احمد کی خوشیوں کا

کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ آج پہلی دفعہ ان کے گھر کی دوست  
نے ان سے کچھ مانگا تھا۔

”بس زیادہ سے زیادہ تین چار دن ہی رہ  
پائیں گے۔“ منصور ماموں نے انکار ہی نہ کیا۔  
”اتنی دور سے آؤ گے تو صرف تین دن، یہ تو  
کوئی بات نہیں ہوئی نا۔“ کمال احمد نے شکایت کیا۔  
”اب سالوں بعد ملے ہو تو بچوں کو خوب گھماتے  
پڑاتے۔“

”وہ تو تم ٹھیک کہتے ہو بس کال جا ہے گا پُر فضا  
مقام چھوڑ کر واپس لاہور آئے لیکن تم تو جانتے ہو  
سکیل کی جاب ہے، فلک اور علی بھی تعلیم کے سلسلے  
میں مصروف ہیں۔ اس سے زیادہ کا stay ممکن  
نہیں۔“

”تو بس ٹھیک ہے مائی فریڈ جتنا چاہو آرام  
سے رہو۔ تمہیں، بھائی اور بچوں کو کوئی تکلیف نہ  
ہوگی۔ تمہاری دیکھ بھال کے لیے برٹن مولانا بندہ وہاں  
موجود ہے۔“ کمال احمد نے پورے وقت سے  
جواب دیا۔ منصور ماموں نے تڑول سے فخر یہ ادا کیا  
اور فون کر سکتے ہی سب کو فوری تیاری کا حکم سنایا۔ جس  
کا نتیجہ یہ نکلا کہ..... سب ہی بھری فضاؤں میں  
سانس لینے ہوئے آرام آراہنوں کے جھونے جھونے  
لگے۔

عالیہ کافی کے گم ٹرے میں رکھے ادھر ہی  
آرہی تھی، جہاں بھی چیز کی خوشبو دار چھاؤں میں  
سنہری سنہری دھوپ میں پھولوں کی باسکٹ درمیان  
ہیں رکھے پھولوں سے شغل فرما رہے تھے۔

”کامیابی حاصل مزہ تو ایسے ہی موسم میں آتا  
ہے۔ لاہور میں تو کافی کی تصویر ہی سے پسینہ پھوٹ  
پڑتا ہے۔“ سہیل نے کافی کے لہالہ بھرے گ  
پیتے ہوئے کہا۔

”یہ تو تم بائبل ٹیک کہتے ہو۔“ ممانی نے اپنا

## سالگرہ

سالگرہ کے موضوع سے

ساجن ردھ جاتے ہیں

ان کو یہ بتانا ہے

سالگرہ منانے کو

تم ہر انیس جانو

یہ جتنا سائنس فکشن تو

خوشیاں منانے کا

سب کو بلانے کا

ہٹے مسکرانے کا

لٹے اور ملنے کا

دعا میں پیار پانے کا

تم سے خفہ لینے کا

اور پھول دینے کا

جھوٹا سا بہانہ ہے

گفتہ شفیق، کراچی

گک اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ج پوچھتو کچھ یوں گک رہا ہے جیسے یہ ریشم گلی  
جنت کا چھوٹا سا کلاہو۔ یہ نرم گرم دھوپ..... یہ ہلکا  
ہلکا گلابی جاڑے جیسا موسم، مذہم مذہم غنڈی ہوا کی  
یہ شاہانہ آن بان سے گھڑے ہرے بھرے سبز  
پودے.....“

”ابھی پہنچے ہیں اور میری سے زبان ہی بدل گئی۔

گلابی جاڑا، نرم گرم دھوپ، غنڈی ہوا کی، اور جب  
چھینکیں زکام شروع ہوگا تو دس جوشاندے۔“ ممانی  
نے فخر اُن کی بات کا کیا۔

”کچھ نہیں ہوگا ممانی جان، ہم لیں؟“ سہیل

ماہنامہ ہدایت، اپریل 2012ء

سائگر ہنسبر  
لیں گے آپ نے فکر ہو کر گرم گرم کافی  
پیش اور ماموں کو شہر و شاعری کرنے  
دیں۔ سر سبز فضاؤں کو سکون اور دل کو راحت ملتی ہے تو  
اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔“ عالیہ نے ان کے ساتھ بیٹھے  
ہوئے کہا۔

”تو اور کیا۔ لاہور کی سڑکی گرمی اوپر سے لمبی  
لمبی لوڈ شیڈنگ میں ایسی خوب صورت باتیں کہاں  
سوچتی ہیں۔“ سہیل نے بیوی کا ساتھ دیا۔  
”ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو اور ہاں عالیہ بیٹے وہ  
رات کے کھانے.....“ ساجدہ بیگم نے عالیہ کی طرف  
دیکھ کر بات بدلی۔

”جی، وہ میں نے فضل دین کو سامان دے دیا ہے اور کچھ بھی دیا ہے۔ وہ سارے ہی کام کر لیتا ہے۔ میں اور علیہ بھی پکڑتے رہیں گے۔ آپ اور ماموں کچھ گھوم پھر لیں۔“ عالیہ نے کافی چپے ہوئے کہا۔

”ہاں، یہ تم نے ٹھیک کہا۔ بیٹھے بیٹھے مانگیں تو بالکل اگر کڑی ہیں۔“ ممائی نے ذرا تپتی نظر دلوں سے ماموں کی طرف دیکھا جیسے سارا قصور اُن کا ہو۔  
”لامیں میں وبادوں۔“ عالیہ نے ہمدردانہ کہا۔

”اللہ تمہارا بھلا کرے، دو چار قدم چلوں گی تو  
 ٹھیک ہو جائے گا۔“ ممانی نے بڑے دلار سے کہا۔  
 ”علیہ نظر نہیں آ رہی، کہن میں تو نہیں رہ گئی۔  
 ممانی نے ادھر ادھر دیکھا۔

”نہیں، وہ تو میرے پیچھے ہی آئی تھی۔“ عالیہ نے کہا۔

”ماما، پیچھو اُدھر گئی ہیں۔“ علیزہ نے ایک انگلی اُدھر اٹھا دی جہاں کچھ فاصلے پر سبزہ زار کے بعد ڈھلان شروع ہوتی تھی۔

”فلک میرا خیال ہے یہ مگ علیہ کو وہیں پنچا دو  
ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء 204

## ناؤٹ

ہر لڑکی خوب صورت ہوتی ہے  
ہر لڑکی نازک ہوتی ہے  
ہر لڑکی گانچ سی ہوتی ہے  
ہر لڑکی حساس ہوتی ہے

کامیاب کی طرح کی

انجمن انصار

اور

ہر ان کی اپنی والدین کے دل کا ٹکڑا ہوتا ہے۔  
کیا ہماری یہ احساسات صرف اپنی بیٹیوں کی لیے ہوتے ہیں؟

دوسروں کی بیٹیوں کے لیے نہیں؟

پانچواں حصہ



بھی بھول گیا کہ ہمارے پاس آ کر مدتوں کے بعد تو نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا تھا۔ لگتا ہے تو سب ہی بھول چکا ہے۔“

”نہیں سر، یہ بات نہیں ہے۔“ وہ تجل سے لہجے

ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء 205

”اے کیا تو کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے یا اپنی  
وقت بھول گیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں... تو اپنی  
حقیقت ہی بھول بیٹھا ہو۔ یاد کر..... ہاں یاد کر لے کہ  
جب ہمارے پاس آیا تھا تو کیا تھا تو.....؟ کیا یہ



”ہاں تو ابھی تو نے کیا کہا تھا..... کیا کہا کہ وہ لڑکی بہت شریف ہے۔“ سرفراز صاحب نے متمغز بھرے لہجے میں اس کا جملہ دہرایا۔ نواز نے تائید میں سر ہلایا۔

”ابے..... تو کیا اسے حقیقتاً اپنی منگیت سمجھ رہا ہے؟“

”نہیں سر“، دوخت بھرے لہجے میں بولا۔  
 ”نہیں، نہیں، تو یقیناً فی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔  
 کہیں محبت تو نہیں ہو گئی۔ اپنے آپ کو کبیر تو نہیں سمجھ  
 رہا ایسے کپڑے اور ایسے تحفے لے کر جارہا ہے ناں جو  
 حیرت پر باپ نے بھی اپنے خواب میں نہیں دیکھے ہوں  
 گے۔ تحفے لگا ہوا کہ کوئی صاحب ہے..... ہے ناں  
 اور اتنے پیسے تحفے مانہ نہ جارہے ہیں کہ کبھی تصور  
 میں بھی نہیں سوچے ہوں گے۔“

”ہاں سر“ پانچ ہزار کا نوٹ تو اسے ہمارے یہاں آکر ہی ملا۔ اس سے قبل اس نے دیکھا بھی نہیں تھا۔“ ان کے گھبرائی ہوئے منہ سے نکلا۔

”وہ لڑکی اگر بدعاش ہوتی تو تجھے پالنے کے لیے ہمیں پیسہ توڑی بہانا پڑتا۔ ہماری پریشانی یہی تو ہے کہ وہ شریف ہے اور ہمیں اس کو بدعاش ثابت کرنا ہے۔“ سرفراز صاحب اپنے اسے اور ہتھتے ہی چلے گئے۔

”اس کے باپ نے اس کا نام نہیں رکھا ہے  
 ناں۔ اب وہ وقت دور نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اسے  
 عیاں کے نام سے پکاریں۔“ سرفراز صاحب  
 مسکرائے۔  
 ”سر میں کوشش کروں گا کہ آپ کا کام جلدی  
 ہو جائے۔“

”اگر کام نہیں کر سکتے تو بتا دو، پولیس مقابلے میں تمہیں مرنا کر، ہم کسی دوسرے لڑکے کی بھی خدمات

حاصل کر سکتے ہیں۔“ نواز اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا چلا گیا اور سرفراز صاحب کے چہرے پر ایک وحشت زدہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆  
رات کے بارہ بجے نہاں جاگ رہی تھی۔ اسے  
معلوم تھا کہ نواز ضرور فون کرے گا۔ جب سے اس  
کے نام کی آغوشی اس کی انگلی میں آئی تھی، نواز اسے  
روزانہ ہی فون کر رہا تھا۔ آج اس کے فون کا وہ انتظار  
کر رہی تھی تو فون نہیں آ رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے اس  
نے نواز کے نمبر پر کرایے۔ پہلی ہی نکل پر اس نے  
فون اٹھالیا۔

”کیا بات ہے؟“ ”نہاں نے پوچھا۔  
 ”طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ”نواز نے پڑمردگی  
 سے کہا۔

”کیا ہوا؟“ لہجہ میں بے چینی سی چل گئی۔  
 ”تمہیں نہ دیکھنے کی وجہ سے بیمار ہو گیا ہوں۔“  
 ”ایسی بیماری تو میں نے کہیں نہیں سنی۔“ وہ  
 ہنس رہی تھی جیسے جلتے تنگ سے بچا اٹھے ہوں۔

”اڑالو مذاق مگر میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں دیکھنے اور تم سے باتیں کرنے کے لیے تڑپ رہا ہوں۔“

”باتیں تو تم روزانہ مجھ سے کر لیتے ہو۔“  
 ”تو کیا مجھے تمہیں دیکھنا نہیں چاہیے۔“  
 ”میرے پاس تو تمہاری ایک تصویر بھی نہیں ہے کہ جب

دل چاہے اس سے باتیں کر سکوں۔“

”ہاں..... تو کیا مضائقہ ہے، آخر تم میری ہونے والی بیوی ہو۔“

”امی کہہ رہی تھیں کہ اگر زرینہ باجی تمہاری تصویر مانگیں تو اپنی شناختی کارڈ والی تصویر دے دینا۔ شناختی کارڈ اسی ماہ بنا ہے تو سب سے تازہ تصویر

میری وہی ہے۔“ نہاں ہئی۔  
 ”پلیز نہاں کل کالج سے واپسی پر تمہیں پک  
 کر لوں؟“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ میں کہیں جاؤں۔“  
 ”ایسا لگتا ہے کہ تمہاری وجہ سے میری جان ہی  
 چلی جائے گی۔“ نواز اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آپ کی جان کون لے لے گا؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہہ دے اگر میں نے تمہاری تصویریں کھینچ کر اپنے پاس کوئیں دیں تو شاید وہ مجھے بھی کروادے مگر وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”تم لوکی میری جان..... تم۔ جب تم اپنے  
عالم سے ملو گی ہی نہیں تو کیا وہ اپنی جان سے نہیں  
جائے گا۔“ مگر نہاں تو اس کی بات میں ہی اڑا کر فون  
بند کر چکی تھی اور نواز اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا  
سر تھامے بیٹھا تھا۔

☆ ☆ ☆

کھتے دنوں بعد وہ کسی تقریب میں شریک ہوا تھا۔ کسی دوست کے ہمراہ جانے والی تقریب میں وہ بڑا مشراسا بیٹھا تھا۔ وہ خوش تھا کہ اپنے دوست کی بات ان کر رہا ہے اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔ میزبان کون تھے ان کے بارے میں بھی وہ قطعی لاعلم تھا۔ موسم سرد تھا، کسی کینا فائبر ہول کا خوب صورت ہال تھا جو موسمی تابست سے خاصا گرم تھا۔ چائے اور کافی کا دور چل رہا تھا۔ اپنی پشت پر ایک مانوس سے چھتے کون گھیر کر ارادی طور پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سرفراز احمد بچے کی دوست کی بات پر ہنس رہے تھے۔ رحمان کے ساتھ ہی ان کی نظر بھی اس پر پڑی تو وہ ہنسنے ہنسنے یکدم چپ ہو گئے اور انھوں میں غصہ سا بلکروے لگنے لگا۔ رحمان ان کی کیفیت محسوس کر کے حیران رہا اور وہ اگلے سر کے اشارے سے نہیں سلام کیا۔

## کانچ سی لڑکی

”تم ابھی تک یہیں ہو؟“ وہ پاس آ کر جیسے طیش میں بولے۔

”میں تو یہیں رہتا ہوں ہمیشہ سے ہی۔“ وہ مسکرایا۔

”میرا مطلب ہے مری سے کب واپس آئے؟“

”مری سے .....؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں شاید تمہارے کسی دوست نے ہی بتایا تھا کہ تم مری گئے ہوئے تھے تو کب آئے؟“ رحمان جانتا تھا مری جانے کی بات تو صرف مالی کو بتائی گئی تھی۔

”اوہ مری سے..... وہاں سے آئے ہوئے تو مجھے مہینہ ہو گیا ہے اور میں پھر جانے والا ہوں۔“

”کب جاؤ گے؟“ وہ پھر چونکے سے ہو گئے۔

”ابھی شیڈول بنا نہیں ہے جب بنے گا تب۔“

وہ اس نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گئے اور رحمان سوچ میں ایک بار پھر پڑ گیا..... کیا مجھ پر قاتلانہ حملے کے ذمے دار کہیں۔ یہی تو نہیں تھے۔ گھر اظہر ظہیر حسن کو یہ سب رووا دیتا تو کیا تو انہوں نے اسے استخاطار رہنے کے ساتھ یہ بھی کہا۔

”سرفراز احمد ان دنوں ٹکی سے ہو گئے ہیں اور ان کے بعض کاروباری دوست تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ بیٹی کی موت کے بعد وہ کافی حد تک پاگل بھی ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ تمہارا شبیہ ہو۔“

”مگر انہیں کیسے پتا چلا کہ میں مری گیا ہوا تھا، یہ  
تو صرف مالی کو ہی بتائی گئی تھی۔“

”تم بھول رہے ہو مالی نے ہمارے محلے میں نوکری حاصل کرنے کے لیے کئی لوگوں کو یہ بتایا تھا کہ ریحان بھائی کے گھر والے مری جا رہے ہیں اس لیے اسے نوکری درکار ہے۔ کئی لوگوں نے مجھ سے



”گلتا ہے میری جملہ طبیعت کی وجہ سے یہ خیال میرے ذہن سے چپک گیا ہے۔“ ریحان نے سوچا۔ وہ پھر واک کے خیال سے کھڑا ہوا، ہلکی سی دھوپ اسے اچھی لگ رہی تھی کہ سامنے سے آتے ہوئے شخص سے اچانک ہی یوں ٹکرایا کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ شاید گرنا چاہتا اگر پیچھے سے دو شخص ہاتھ اسے سنہال نہ لیتے۔ اس نے مزید دیکھا تو وہ سرفراز صاحب تھے جو ان ہی ساعتوں میں پارک میں داخل ہوئے تھے اور اسے یوں گرتا دیکھ کر لپک کر انہوں نے سنہال لیا تھا۔

”کیا بات کرنی ہے آپ کو مجھ سے، جلدی کریں۔“ اس نے کہا۔  
”یہاں بات کیسے ہو سکتی ہے؟“ اور گردن کو ان کی نظریں محسوس کرتے ہوئے اس نے کہا۔  
”کیوں نہیں ہو سکتی بات؟“ وہ حیرت سے پوچھ رہی تھی۔  
”چپ چاپ میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ، کھانسیں جاؤں گا تمہیں۔“ وہ محبت سے اسے دیکھتے ہوا بولا۔  
”نہاں نے ایک لمحے سوچا جاں نے بات کرنے کی اجازت دے دی تھی وہ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

فجر کی نماز کے بعد واک کے لیے جانا اس کا ہمیشہ کا معمول تھا جو کافی عرصے سے ٹھٹھ چکا تھا۔ آج ظہر کی نماز کے بعد وہ پارک چلا گیا مگر آج وہ جب واک کے لیے آیا تو اسے لگا جیسے اس کی مگرانی کی جارہی ہے۔ ایک چمٹی حس اسے بار بار تیر کر رہی تھی کہ یہاں سے چلے جاؤ۔ وہ پارک میں بنی ہوئی سینٹ کی بیچ پر بیٹھ گیا۔ یہ پارک نوجوان آباد علاقے میں ہونے کے باعث موسم سرما میں ہر وقت ہجرار ہوتا تھا۔ خواتین، مرد بڑے، بڑا کیلاں سب کی ہاک کر رہے تھے۔ کوئی بھی کسی دوسرے کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اسے پارک میں کوئی شخص بھی ایسا نظر نہیں آیا جو مشکوک قسم کا ہو۔

آخر یہی تھیں اور نواز اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے لپکا چاہا جائے گا۔

”نہاں! تم اس طرح کیسے گھر جا سکتی ہو؟“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”ایسے چلی جاؤں گی خودی۔“ وہ مسکرا کر بولی اور تیزی سے باہر گر سامنے آئی آؤ رکشا کو ہاتھ دیا، سرعت سے اس میں بیٹھی اور ہوا ہوئی۔ نواز جو اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے باہر آیا تھا وہ دیکھنا کا دیکھنا نہ دیا۔

”بیوی۔“  
”یہی چالاک لڑکی ہے یہ نہاں بھی..... مراد کے لیے رہے گی مجھے۔“ وہ دانست چپکاتے ہوئے خود لڑائی میں بو بڑا رہا تھا۔

☆☆☆

”ہوگئی بات آج؟“ سرین تیکم نے پوچھا۔  
”جی ای۔“ وہ شرما سی گئی۔  
”کوئی خاص بات بھی کیا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”خبریں کوئی خاص بات نہیں کی انہوں نے۔“  
”تو پھر خبریں بات کرنا چاہ رہا تھا؟“

”جی ایسے ہی۔“ وہ پھر شرما مائی اور سرین تیکم کے یوں برہمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”مجھت کرنے والے لوگوں کے پاس باتوں کے لیے کوئی موضوع تھوڑی سی ہوتے ہیں جس میں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی انہیں رانیت ہو جاتی ہے اور مکتبی اور شادی کے درمیان کا فرق نہ تو ہر لڑکی بلا کے کے لیے بے حد دردمان پرور رہا ہوتا ہے۔“ وہ سوچ رہی تھیں اور خود مسکراتے دے دے رہی تھیں۔

”پارہ العالین میری بیٹی کا جینو ساتھی اس سماعت کرتا رہے۔ بھی اس کی محبت میں کوئی کمی

آئی۔“

☆☆☆

پھول کی بیٹی کے نام

اسے میری بیٹی بتاتی ہوں  
چند باتیں میں سناتی ہوں  
دشمن دل اپنا دکھاتی ہوں  
قول زریں میں ہوتی ہوں  
پرورش کرتے ہیں گو ماں باپ ہی  
شخص بھی جھٹکتے ہیں  
پڑھائی کی کھڑکی دیکھتی نہیں  
دل پہ پھر رکھ کر کیسے دیکھتی ہیں  
تو سمجھتا سانس کو ماں آج سے  
رکنا خوش تم اپنے کام کاج سے  
ذکر جب بھی ہو تیرا ہو ناں سے  
بے برابر کہنا، ہوتی ہوں  
تم سر کے مت ادب کو بھولنا  
سامنے ان کے منہ کو مہکنا  
مٹھی بولی رہے کسی سے بولنا  
کہہ رہی ہوں میں ہوتی ہوں  
زنگی کا مقصد ہوتا ہے احرام  
کر کے مگر تو شہر کا احرام  
اس کی پاں میں پاں ملانا ایک نام  
کرتی ہوں اس کا ہا۔ ہوا  
سیرت و عصمت تیرے زہار دینا  
خیر، زن ہر دم تیرے چہرہ میں  
خوش تیری سب نہیں اور ہمایاں رہیں  
دل میں ساری باتیں گھلے ہوں  
پرورش کرتے رہے۔  
کی ادا حضرت نے اسلامی روش  
آپا آخر وقت سن اسے بیٹی  
فائلہ کو کر دیا گھر سے  
بیٹی دنیا، آخرت میں پہنچتی رہو  
عالمہ و دینار بن کر ہمیشہ خوش رہو  
خوش رہو تم سانس، شہر، سر کو  
تیرے نام کی سب میرے ہیں ہوں  
تیری ماں بھی کہہ رہی ہے ہوں  
ہوا اسے جان مار ہوں  
از طرف: سیدہ بشری ماس نفی مگرانی



”اے ذرا سے کام پر تو کتنا خرچ کروائے گا؟“ منیر نواز کو ڈانٹ رہا تھا۔ ”مجھے معلوم بھی ہے روزانہ تجھ پر کتنا خرچا ہو رہا ہے اور اسی تک تو نے دھیلی کام بھی کام نہیں کیا ہے۔“

”میں کیا کروں، تمہاں تصویریں منھوانے پر راضی ہی نہیں ہوتی۔ دو بار بار منھوں سے کہنے کے چاچا کو ہوں مگر وہ کسی صورت راضی نہیں ہوتی۔ میں کوشش تو کر رہا ہوں نا!“

”تجھ جیسا پگل لڑکا کچھ نہیں کر سکتا۔ بس جس دن تو اسے ہوٹل لے کر جائے تو میں خود کر دیتا ہمارا آدمی اس کی تصویریں بھی بنا لے گا اور ہماری دو کراس کا حجاب بھی اتار دے گی۔ بس تجھے اس سے لپٹ کر تصویریں بنوائی ہیں۔“

”تمہاں سے لپٹ کر؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”مردہ اسکی لڑکی نہیں ہے، میں بے حد خراب لڑکا ہوں مگر میں نے اسکی پارسلز کی بھی نہیں دیکھی وہ تو مجھے اپنا ہاتھ کچلے نہیں دیتی۔ وہ بے حد شریف ہے بھی آداب نہیں ہوگی۔“ نواز نے پریشان سے لہجے میں بتایا۔

”میں جگ کہہ رہا ہوں اس سے لپٹ کر تصاویر بنوانا ناممکنات میں سے ہے۔“

”اے جاہل تامل تصویریں بنواتے وقت ہوٹل کا ہیرو این جانا اس کو چاہے دیتے ہوئے تصویر بنوالیہا اس سے نہ لپٹے ہوئے پورے دینا، اس کو سلولٹ مارتے ہوئے اپنا ہونڈ بنوالیہا۔“ منیر نے کالیوں کی برسات برساتے ہوئے اس سے کہا۔

”مر آپ میری بات نہیں سمجھتے کہ میں شاید وہ پھر کھینچاؤں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ بے حد شریف..... آپ جیسا سمجھ رہے ہیں ناں وہ اسکی لڑکی نہیں ہے۔ میں اس کے ساتھ تصویریں کیسے بنواؤں۔ میری

تو عقل بھی کام نہیں کر رہی۔“ وہ مسلسل ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ تب منیر نے اس کے برابر بیٹھ کر نواز کے گلے میں ہاتھ ڈال کر تیزی سے جھکا دے کر نواز کو لٹایا اور ماتھے پر بوسہ دے کر اور ہاتھ لگا کر بولا۔

”اب کھینچا ہے اور طریقے بھی بتاؤں گا لڑکی کے ساتھ ڈھیر کچرہ دیکھ بوائی جاتی ہیں اور طریقے بتاؤں؟“ وہ بے غیرتی سے ہنسا۔

”ٹھیک ہے سر، میں سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا اب غلطی نہیں ہوگی مجھ سے۔ بالکل بھی نہیں۔“ نواز اپنے کپڑے چھڑاتا..... کھینچا ہوا سا اٹھ گیا اور منیر اسے دوبارہ غلط گالیاں سناتے لگا۔

”گند ذہن، منحوس، کم بخت ذرا سے کام کو کر ہی نہیں پارہا ہے۔“

☆☆☆

”واقی بہت ہی اچھی کہنی ہے..... وہاں کے بڑے افسر نے کہا ہے کہ ہمارے ہاں دو گر کو سال بھر کے بعد ایک ماہ کی چھٹی لازمی دی جاتی ہے، آپ کل سے چھٹی پر ہیں۔ اس ماہ کی تنخواہ آپ کو اس وقت فوراً دے دی جائے گی جب آپ اپنی چھٹیاں گزار کر آئیں گے۔“ ریاض صاحب نے سرشاری سے بتایا۔

”ہاں، یہ سب نوازی وجہ سے ہوا ہے اور اسی نے آپ کو چاہ دوائی ہے اور اسی نے آپ کے دل و دماغ سے اس دشمن کا خوف باہر نکالا جس کی وجہ سے آپ بالکل گھر میں ہی نظر بند ہو کر رہ گئے تھے۔“ نسرین تنہم نے کہا۔

”منیر کہہ رہی ہو تم مگر ابھی میں سو رہا ہوں کہ میرا دشمن ایسا کون ہے جو مجھے یوں جاہد رہا کر ہاتھ اور اب وہ یکدم کہاں چلا گیا ہے۔“

”دنیا میں بلایات بھی تو ہوتی ہیں۔“ گنگا نے لوگ کسی آسیب کے ذرا پرائز آگئے تھے۔“

”میں ان باتوں کو نہیں مانتا کہ وہ کوئی آسیب تھا۔ وہ یقیناً کوئی ایسا دشمن ضرور تھا جو شاید کسی غلط فہمی کی وجہ سے مجھے اپنا دشمن سمجھ بیٹھا تھا۔ میں نے تو اگر کبھی کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کیا تو بھی کسی کو نشانہ سمجھی نہیں پہنچایا۔ نہ زبان سے نہ ہاتھ سے نہ بال سے۔ مجھے حیرت سے زیادہ دکھ اور افسوس ہے کہ آخر کس نے اور کیوں مجھے اپنے حباب کا شکار بنایا۔“ ریاض صاحب ٹولے سے لہجے میں بیڑی سے کہہ رہے تھے۔

”اللہ کا شکر ہے ہمارا دشمن خود ہی پیچھے ہٹ گیا۔ یہی باتوں کو یاد کرنے کا کیا فائدہ؟“ نسرین تنہم نے سمجھایا۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ ریاض صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

”اب آپ یہ بتائیں کہ ان ایک ماہ کی چھٹیوں میں آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ نہیں اور تمہاں کو ساتھ لے کر میری حکومتوں۔“

”مری کیوں جائیں؟“ نسرین نے حیرت سے کہا۔

”بھئی میں آج تک تمہیں اور تمہاں کو کہیں گمناں پھرنا نہیں چاہتی تھی۔“ چند ماہ بعد ہاں کی شادی ہو جانے کی، وہ اسے شوہر سے کیا کہے کی کمی سے ابوتے ہمیشہ سمجھ اپنے گھر میں رہا۔

”میری کراچی سے باہر تک نہیں لے کر گئے۔“ جہاز تو کیا ری ریل میں بھی نہیں بیٹھی۔“

”مگر کھوتے پھرنے سے تو بہت خرچ ہو جائے گا۔“ نسرین تنہم نے نظر بھرے لہجے میں کہا۔

”ہو جانے دو، ہماری جیب بھی خوش ہوگی تو اس کو شیشی ہمارے لیے بہت کچھ ہوگی۔ کسی خرچ کا اس تک نہیں رہے گا۔“ ریاض صاحب نے بے

فکری سے توجہ لگا کر ہونے لگا۔

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ نسرین تنہم بھی مسکرائے لگیں۔

☆☆☆

”..... کیا کہہ رہی ہو تم؟“ نواز کے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔ فوراً اٹھایا اور پگلوں سے لہجے میں بولا۔

”نہیں..... نہیں تم کہیں نہیں جاسکتیں۔ ہرگز نہیں جاسکتیں۔“

”پگلی مرتیہ تو ریل میں بیٹھوں گی۔ سچ بہت مزہ آئے گا۔“ تمہاں نے سرشار سے لہجے میں اتایا۔

”کب تک جانے کا پروگرام ہے؟“ اس کا دماغ اڑا جا رہا تھا۔

”کل ایونٹ لینے جائیں گے، کہہ رہے تھے اس اتوار کو ہم چلے جائیں گے۔ اچھی تو پورے چھ دن ہیں ہمارے جانے میں۔“

”تمہیں تمہاں..... نہیں۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”حیرت ہے آپ کو فوٹی کیوں نہیں دور ہی۔“

”تم میرے شوہر سے کہیں دور چل جائیے میں کیسے برداشت کر پاؤں گا۔ ایمان سے میں سر جاکوں گا اور مجھے تو اب یقین آ رہا ہے کہ میری موت تمہاری وجہ سے ہی ہوگی۔“ اس نے گنگی سے لہجے میں کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

”صرف چار ماہ بعد ہماری شادی ہے اچھا ہے ناں میں اپنے امی اور ابو کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزاروں۔ بعد میں کہاں موقع ملے گا مجھے یوں کھوتے پھرنے کا۔“

”ہاں بعد میں تو تمہیں واقعی کوئی موقع نہیں مل سکتا۔“ وہ بے رحمی سے ہنسا۔







کر آؤ جو چیزیں اس کو دی گئی ہیں سب واپس لے لو۔“ آدھے کھٹے میں گنجنا سورج بکھی لڑکا پرانے سے شلوار قمیص اور دوپٹی کی ٹوٹی ہوئی چپل پہنے جب منبر کے ساتھ آیا تو سرفراز صاحب ہنس کر بولے۔

”اے تو دروازے کا واج میں بھی نہیں پہچان پائے گا کہ یہ شخص کون ہے اور آفس میں کیسے گھس آیا۔“

”ہاں واجد جہاں سے آئے تھے وہیں واپس چلے جاؤ اور یہ بات تم خواب میں بھی مت سوچنا کہ تم ہیرو جیسے لگتے تھے۔ دوبارہ کراچی آنے کی کوشش مت کرنا اور یہ سب باتیں کسی ڈروانے خواب کی طرح بھول جانا ورنہ..... آوارہ کتوں کو مروانے پر انعام بھی مل جایا کرتا ہے اور ہم نے بہت سے آوارہ کتے مروائے بھی ہیں۔ اس لیے تمہیں اب صرف یہی بات یاد رکھنی ہے کہ تم واجد ہو۔“ منبر نے اسے تھوڑی سی رقم دیتے ہوئے کہا۔ واجد سلام کرتے ہوئے باہر نکل گیا اور اس تیزی سے باہر بھاگا جیسے کوئی اس کی جان نہ لے لے اور سرفراز صاحب کے قہقہہ چھت کو پھاڑنے لگے۔

”بھاگ گیا سالا..... بے وقوف کہیں کا۔“

☆☆☆

ساجدہ بیگم کی طبیعت اچانک ہی خراب ہوگئی تھی۔ ظہیر حسن اور ریحان ان کے پاس ہی تھے مگر انہیں یوں لگ رہا تھا کہ شاید اب وہ جی نہیں پائیں گی۔ انہوں نے ریحان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”میرے پیارے بیٹے تم مجھے معاف کر دینا میں نے مینا بھی لڑکی سے تمہاری منگنی کر کے تمہاری زندگی میں کانٹے بھرے اور نہاں جیسی فرشتہ صفت لڑکی اپنی برادری میں ہوتے ہوئے بھی مجھے نظر نہیں آئی۔“

”امی کون نہاں؟“ وہ حیرت سے ماں سے

پوچھ رہا تھا۔

”ایک ایسی ہیرا لڑکی جو شاید تمہاری قسمت میں ہی نہیں تھی۔ میں نے جب اسے دیکھا تو اس کی منگنی ہو چکی تھی اور تمہاری بھی اور پھر معلوم ہوا کہ کسی نے اس کی منگنی تڑوا دی۔“

”کس نے؟“ ریحان نے پوچھا۔

”یقیناً اس کی کوئی پچھو ہوگی یا کوئی چچی یا تائی کہ وہی لوگ اس کے پیچھے بلا وجہ لگے ہوئے ہیں کہ ان کی اپنی بیٹیاں بیٹھی ہوئی جو ہیں۔“ ساجدہ بیگم نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تو اب کیا ہوا؟“ ریحان نے الجھ کر کہا کہ اسے سوائے نہاں کے نام سے کوئی دوسری دلچسپی ہرگز نہیں تھی۔

”تمہاری منگنی کے بعد جب میں ان کے ہاں گئی تو اس کا رشتہ دوبارہ طے ہو چکا تھا کہ واقعی وہ تمہاری قسمت میں ہی نہیں تھی۔“

”امی، لڑکیوں کا ایسا قحط تو نہیں پڑا ہے کہ آپ خواہ مخواہ اس بیچاری لڑکی کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔“ ریحان نے مسکرا کر کہا۔

”آپ کا بلڈ پریشر اس قدر لو ہو رہا ہے اس وقت بھی آپ کو ریحان کی شادی کی باتیں کرنی ہیں یا اسپتال جا کر ڈرپ لگوانی ہے۔“ ظہیر حسن نے بیوی کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی، گھر میں ہی رہوں گی اپنے بچے کے پاس۔“ انہوں نے ریحان کے ہاتھ تھام لیے۔

”پتا نہیں کیوں میرے بچے کی شادی میں دیر ہوئی جارہی ہے۔ طبیعت ذرا سنبھلے تو سلطانہ خالہ کے پاس جا کر کہتی ہوں کہ کوئی اچھی سی لڑکی مجھے دکھائیں، اب اتنی دیر نہیں ہونی چاہیے کہ میں چل دوں اور میرا بیٹا اکیلا رہ جائے۔ کوئی تو ہو جو اس کا خیال رکھے۔“

سنتان سڑک پر کھڑی خوبصورت دوشیزہ نے ایک کار والے سے لفٹ لی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد لڑکی نے اچانک اس لڑکے سے سوال کیا۔

”کیا تم ایک ہاتھ سے ڈرائیو کر سکتے ہو؟“

لڑکے نے پُر جوش آواز میں کہا۔ ”ہاں ہاں.....“

اس نے پھر یہی سوال کیا۔ ”کیا واقعی تم ایک ہاتھ سے ڈرائیو کر سکتے ہو؟“

لڑکے نے پھر خوشی سے جواب دیا۔ ”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“

”تو پھر مہربانی کر کے دوسرے ہاتھ سے اپنی ٹاک صاف کر لو۔“ لڑکی نے کہا۔

مرسلہ: روحی، طبیبہ..... سیالکوٹ

”نہیں اماں، ظالم کمزور ضرور ملتی چاہیے ورنہ لوگوں کو کبھی یہ معلوم ہی نہیں ہو سکے گا کہ ان سے غلطی کب اور کہاں پر ہوئی ہے۔“

”بیٹا اللہ تو سب دیکھتا ہے تم کس جھیلے میں بڑھ گئے۔“ اماں اکٹا کر ان کے کمرے سے ہی باہر نکل گئیں۔ تو وہ یہ تصویریں لے کر اپنے بیٹوں کے پاس چلے آئے۔

”شاید بیٹا دیکھو، بیٹا یہ تصویریں کیسی ہیں؟“ انہوں نے مسخرے سے کہا۔

”پاپا کیا آپ اب بھی ایسی تصویریں دیکھا کرتے ہیں۔“ ان کے بڑے بیٹے دانش نے ہنس کر پوچھا۔

”تم یہ بتاؤ کہ یہ تصویریں کیسی ہیں؟“ انہوں نے نہاں کا اہم ان کے سامنے رکھ دیا۔

”یقیناً کسی طوائف کی ہوں گی۔“ شاہد کل کر ہنسا۔

”نہیں بیٹا، یہ ایک شریف زادی کی تصویریں ہیں۔“ وہ بخیدہ سے ہو گئے۔

”شریف زادیاں اب اس انداز میں تصویریں

اب ہو جلدی سے گھر آ جانی چاہیے۔“

”ابو آپ ڈاکٹر آرزو کو فون کر کے کہیں کہ اپنے ہسپتال کی نرس جلدی سے گھر بھیج دیں تاکہ امی کے آپ گھر میں ہی لگ سکے۔“ تب حکیم حسن اپنے بائبل کے نمبر تیزی سے پلٹ کرنے لگے۔

☆☆☆

”اماں دیکھیے، یہ لڑکی ہے نہاں بے شرم، بے باسی جس کے گھر والوں کے کہنے پر پریمان کی منگنی لڑتی تھی۔“ سرفراز صاحب نے نہاں کی تصویریں دکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ تو مجھے خراب سی لڑکی لگ رہی ہے۔“ اماں نے تصویر کو دیکھ کر کراہیت سے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ..... بہت خراب لڑکی ہے یہ۔ اس سے کوئی منگنی یا شادی تو کیا کوئی بات کرنا ہی پسند نہیں کرے گا۔ خاندان تو کیا دروازے کے لوگ اگر اپنی لڑکیوں کے پاس اس کو آتا دیکھیں گے تو ہلکے دے کر بھاگ دیں گے۔“ سرفراز نے ہنس کر اپنی ماں کو بتایا۔

”کوئی کچھ بھی کرے یا نہ کرے ہمارا اس سے کیا تعلق؟“ انہوں نے کہا۔

”ہمارا تعلق تو اس لڑکی سے بہت گہرا ہے۔“ وہ انداز نہ لہجے میں بولے۔

”وہ کیسے؟“ اب حیران ہونے کی باری ان کی تھی۔

”صرف اس لڑکی وجہ سے مری مینا نے یہ دنیا بھڑی ہے۔ اسی نے تو بے پرکی باتیں اڑائی تھیں۔“

”بیٹا پیٹھ پیچھے تو لوگ بادشاہ تک کو گالیاں دیا کرتے ہیں۔ ہماری مینا کی زندگی ہی بس اتنی سی تھی تو میں اس کا کیا دوش؟“ ماں نے بیٹے کو سمجھانے کی لگائی۔

ہوائے لگی ہیں۔" دانش نے الہم اپنے ہاتھ میں لیا۔

"یہ ہمارے دشمن کی تصویریں ہیں۔" وہ غصے سے بولے۔

"تو پھر آپ کے پاس کیا کر رہی ہیں؟"

"اُن کو اس کنٹرین ڈال دیجیے نا۔" دونوں بیٹے کھیا آواز میں بولے۔

"ہاں بیٹا نہیں کنٹرین ڈالنے سے پہلے تمہیں دکھانا چاہتا تھا کہ زندگی میں بھی یہ چہرہ نظر آجائے تو تھوک کر آئے بڑھ جانا، رکنا نہیں۔"

"پاپا! رکنے کے لیے ہمارے پاس نارٹ کم ہیں کیا جوڈن کے پاس ہم کسی جانے کا بھی سوچیں گے؟" شاہد نے مسکرا کر دانش کی جانب دیکھتے ہوئے ایک آنکھ دوپائی مگر فرار احمد تو وہاں البم ہاتھ میں لیے یوں روانہ ہو گئے جیسے کسی خزانہ لے کر گئے ہیں۔

☆☆☆

"بیمایم نے جو آپ سے کہا تھا وہ غلط نہیں کہا تھا۔ آپ نے غیر کے خون کو لے کر بالاف کر دیا یا ناں اپنا نقصان۔" فون پر ان کے چھوٹے بھائی غصے سے ہاتھیں سارے تھے۔

"شہباز! تم نے پہلی بار ہاکی بے کسمی تو سیدی بات کر لیا کرو۔" ریاض صاحب نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"حیرت ہے بیما، تمہاں نے آپ کی ناک کاٹ دی ہے اور آپ کو پھر بھی کوئی آنکھیں نہیں ہے۔"

"میری بیٹی کسمی ہے اس کو کچھ سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔ اس لیے آئندہ کوئی اسکا دیکھنا بات کرنے سے پہلے تم سوچ لیا کرنا، یہ نہ ہو کہ میں تمہیں کچھ کہہ دوں اور تم ناراض ہو کر بیٹھ جاؤ۔" رشتے

داری کو تو ڈرنا اگر گناہ نہ ہوتا تو میں کب کا اپنے خاندان کو چھوڑ چکا ہوتا۔" ریاض صاحب غصے میں اپنے بھائی کو ڈانٹنے لگے تو شہباز نے فون ہی کاٹ دیا۔

ریاض صاحب انیشن جارہے تھے، شہباز کا فون آجائے سے ان کا سموڈ آف ہو گیا تھا۔ سرین بیگم بچل کاٹ کر ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولیں۔

"لجیے بچو کھا لیجیے اور گھر پر آرام کریں۔ کٹ کل جا کر لے لیجیے گا فون پر بنگلہ تو آپ نے کروا دی ہے ناں۔" انہیں شہباز کے فون کا علم نہیں تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ پچھلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "آج ٹینک جا کر کچھ بیسے گا ناں ہوں اگر تم نے انہماں نے کچھ شاپنگ کر دی تو کوئی تم لوگوں کے کام آجائیں گے۔" سب کے ایک دو کھڑے کھا کر ریاض صاحب باہر نکل گئے اور سرین بیگم بڑا ایک لاؤنج میں رکھ کر سوچنے لگیں۔

"اس میں پہلے وہ تمام ضروری چیزیں رکھ لی جائیں جو سفر میں یا کسی بھی اجنبی شہر میں جا کر لازمی ضرورت بن سکتی ہیں۔" دروازے پر پتل ہوئی تو وہ دو سہجین کر ریاض صاحب یقیناً اپنی کوئی چیز چھو کر باہر بھول گئے ہیں جو دوبارہ لوٹ آئے ہیں۔

دروازے پر آئیں تو ڈاک کیا کھڑا تھا۔

"ریاض احمد کا گھر بھی ہے ناں؟" اس نے تصدیق کی کچھل کر مہیاں کے ہاں ڈاک آئی تھی۔

"ان کے نام رجسٹر آئی ہے۔" اس نے بھاری لافانہ انہیں دیتے ہوئے کہا۔

"تمہاں سے آئی ہے؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"آئی تو کراچی سے ہی ہے مگر پیسے دالے نام نہیں لکھا ہے۔" سرین بیگم نے دھچکا کر کے لافانہ وصول کر لیا۔

"یہ لافانہ کہاں سے آیا ہے؟" انہیں حیرت سی ہو رہی تھی کہ کسمی کی کاغذی ٹیکٹ آیا تھا۔ سارے رشتے دار اس شہر میں تھے۔

"کہیں آفس سے نہ آیا ہو۔" یکبارگی انہوں نے سوچا اور پھر غیر ارادی طور پر وہ لافانہ انہوں نے کھول لیا۔ اس میں کوئی خط، کوئی کاغذ کچھ بھی نہیں تھا بلکہ ایک الہم لکھی ہوئی تھی۔

"یقیناً ڈاک کیا کسی دوسرے کی البم ہمارے گھر آئے کیا ہے؟" وہ یہ سوچ کر مسکرائیں۔ "دیکھو تو کسمی تو میری البم ہے۔" کٹلے میں کی ہوئی تو جا کر رکھی تو دو گئی۔" انہوں نے البم کھولی اور یوں لگا ہے آسان سر پر آگرا ہو۔۔۔ یکبارگی وہ کا پ کی گئیں۔ کسی نے بڑی مہارت سے نہاں کا چہرہ لگا کر ریاض تصویریں بنائی تھیں۔ ہر تصویر میں نہاں کسمی مگر اس کے ساتھ مختلف لڑکا۔

"تمہاں تو کسمی ہی تھی کہ لوازے ان کے ساتھ بہت دروازی کی کسمی کسمی تصویریں لوازہ تو نہیں ملتا تو کیا کہاں کو کسی پلان کے تحت ہوں لے جایا کہاں۔" انہوں نے اپنا سر تھام لیا۔

"تو کیا لوازہ بھی وہ نہیں جو نظر آ رہا تھا۔ تو پھر ان کی تو کسمی بھی اسی سازش کا حصہ تھی، نہیں، کسمی۔۔۔ سب نہیں ہو سکتا۔ میری بھول سی بنگی پر عالم کسمی نہیں کر سکتا، دشمن بھی نہیں۔ اولاد والے تو ات اور دولت کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔ اسی حرکت سے اسی مسلمان تو ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔" انہوں نے الہم کو دیکھا جیسے وہ کوئی دکنی ہوئی آگ ہو۔ کسمی بڑی وہ الہم سمی بیٹھی ہیں۔ ریاض صاحب ایک سے ہو کر آگے انہیں ہانپی نہیں چلا۔

"اٹا بڑا بیگ ہے مگر کم مفر دے گا۔" منبر پر الہم نے کہا۔

"اس کی ماہ کی ٹکری تو کیا گزشتہ ماہ کی نہیں آئی ہے۔ اب میں پہلے آفس جا کر معلوم

کرنا ہوں کہ وہاں کسی سسٹم میں تو کوئی خرابی نہیں ہوگئی۔"

"آپ کو کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟" سرین بیگم نے بے مشکل گھو گھر سے لے کر بیٹھا۔

"کیا ہو۔۔۔ بات کیا ہے؟ یہ تم اپنی جلی سی کیوں لگ رہی ہو۔ ارے تمہارے تو ہاتھ کی ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔" ریاض احمد نے ان کا ہاتھ کھم کا کہنا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر دوڑیں۔

"سرین! تم تو کسمی کی بات ہے۔"

"گھبرا۔۔۔ میں ابھی لوازہ کو فون کرتا ہوں۔" وہ سرین کو روکتا چھوڑ کر لوازہ کو نمبر ملانے لگے۔

"تمہاں اس کا فون اس وقت بند کیوں ہے۔" خیر تعویذی دے رہے تھے اسے بھڑون کر دیا کہ گھبرا دشمن نہیں گیا نہیں ہے موجود ہے۔۔۔ مگر تمنا تو کسی ہوا کیا ہے؟ لوازہ پوچھنے کا تو شمس اسے کیا بتاؤں گا۔" ریاض صاحب بیوی کو یوں سکھانے لگے کہ پوچھ رہے تھے۔ سرین بیگم نے اس سرخ لہری طرف اٹھی سے یوں اشارہ کیا جیسے وہ کسمی کے ہوتے پر نہ تو کچھ کر رہی ہوں۔

"کسمی کی البم ہے اور یہاں کس نے بھیجی ہے؟" ریاض صاحب سرعت سے بڑے اور پھر پکڑا کر ایسے کرے کہ کسمی کو ان کی پیشانی پر لگا اور ان کا خون پورے چہرے پر یوں پھیل گیا جیسے۔۔۔ اس نے ان کی شکل چھپا دی ہو۔ کیسے وہ دونوں اٹھے اور اس الہم کو لے جا کر اپنے کمرے میں پھپھایا یہ وہ خود ہی جانتے تھے۔ اب وہ ایک دوسرے کو تسلیاں بھی دے رہے تھے اور دردمندی رہے۔

"سرین! تم فکر مت کرو، میں جب لوازہ کو بتاؤں گا تو وہ میری بات کا پورا یقین کر لے گا۔ وہ ان



تصویروں کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ وہ دشن میں تلخیں پھینکا رہا ہے مگر اس مرتبہ تو اس نے حد تک کر دی ہے۔ ہماری جان ہی نکال کر رکھ دی ہے۔  
”یہ تو ابھی اسی دشن کی ایک کڑی تھا۔“ وہ بے حد مشکل سے ریاض صاحب کو جتا پائیں اور پھر وہ انہیں ہر بات بتاتی چلی گئیں اور ریاض صاحب کھڑے قدم سے پیچھے پڑے۔

☆☆☆

نہاں کا رخ سے آئی تو آتے ہی بولی۔  
”امی ہمارے گھر میں کبھی نہیں ہے اور نہ ہی انٹرنیٹ کی سہولت۔ آپ اب اسے کیسے ناں کو کوئی سستا سا پتہ پائی ہے؟“  
”ہوں۔“ نسرین تیکرے پر مشکل بولیں۔  
”آج میرے کالج کی کئی لڑکیاں کبدری تھیں کہ پوچھیں پر کسی لڑکی کی تصویریں ہیں۔ اس کی نہ صرف مجھے سے شکل ملتی ہے بلکہ اس کا نام بھی نہاں! اچھا ہے۔ ناں اسی عجیب و غریب بات وہ لڑکی میری ہم شکل ہے بلکہ کئی لڑکیاں تو میرا کاغذ اڈاتے ہوئے کبدری تھیں اگر میں جاپا نہ پھینا کرتی تو ان کو یہ یقین آ جاتا کہ وہ تصویریں میری ہی ہیں۔“ اور نسرین تیکرے کو یہ معلوم ہو گیا کہ تصاویر کا سلسلہ صرف گھر بیٹھے تک ہی نہیں بلکہ اسے انٹرنیٹ تک دے دیا گیا ہے۔

☆☆☆

پھر ایک طوفان سا آگیا۔ ہر رشتے دار کے گھر میں، ہر دوست کے گھر میں، محلے کے ہر مکان میں، قریبی قلیوں کے ہر قلیت میں حد تو یہی کہ نہاں کے کالج میں اس کی پہلی کوئیاں کی خرابیاں تصاویر بھیج کر کہا گیا تھا۔

”آپ کے کالج میں ایسی لڑکی ہر قسمی ہے اگر آپ نے اسے کالج سے نہیں نکالا تو والدین اپنی

پچیاں مگر بٹھائیں گے۔“ مطلوبہ کالج کی پرنسپل پریشان سی جب ریاض صاحب کے گھر پہنچیں تو ان کے ہاں خود ہی صاف ماتم بھی ہوئی تھی۔  
”نہاں تو بہت شریف لڑکی تھی اس کا ریکارڈ بہترین تھا مگر ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب وہاں کیا ہے۔ پلٹ کر ہم بے حد مجبور ہیں، آپ کی نہاں کو کالج میں آنے کی اجازت دے نہیں سکتے۔“ پرنسپل تپتی نظر نہیں کیے کبدری تھیں مگر نسرین تیکرے کو کچھ سنا ہی نہیں دے رہا تھا۔ انہیں تو بس اب یہ پتا تھا کہ ان کی نہاں اب مرزا کا کھانا کھا رہی ہے اور اللہ نہ کرے یہ وقت کسی بھی بیٹی پر آئے۔ مگر یہ سب ان ہی کے ساتھ ہوا تھا جنہوں نے کبھی بھی کسی کا برا نہیں جاپا تھا۔ جنہوں نے اپنی زندگی کا پہلا ایمان داری کے ساتھ بسر کیا تھا۔ حرام کی کمائی کا بھی کوئی تجربہ ہی ان کے گھر میں نہیں آیا تھا۔ جنہوں نے جیا کو اپنا شعار بنایا تھا۔ نسرین تیکرے خود بھی پردہ کرتی تھیں اور ان کی بیٹی بھی پارہ دہی اور آج گھر گھر اس کی عمریں تصویریں لوگوں کو مل رہی تھیں اور دیکھنے والے کراہیت سے دیکھنے کے بعد بھی کہہ رہے تھے۔

”اُف اس قدر پردے داری میں یہ کروت ہیں اگر کہیں ماڈ ہوئیں تو پتا نہیں کیا قیامت ڈھائیں۔“ نسرین تیکرے ریاض صاحب پر غم سہا کر بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کا دشن کون ہے جس نے انہیں آسمان سے زمین پر رخ دیا ہے۔ جس نے من سے لقمہ تو پھینچا ہی تھا مگر کپڑے بھی تار تار کر دیے تھے۔ جب ان دونوں نے دھوکہ کر کے نماز پڑھی اور روتے ہوئے بددعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔  
”یا رب العالمین جس نے ہمیں ناقہ عزت کیا ہے تو بھی اسے ایسی کڑی سزا دے کہ کبھی سب نہ کیوں۔“

(آخری قسط آئندہ ماہ پڑھیں)

## دورِ انتظار

نوشین ناز اختر



”ثروت یہ تم نے خیر کا فریم بنایا ہے یا پھر مقرر؟ اتنی سادگی سے لکھو گی تو تمہاری خبر کو کون پڑھے گا؟ یہ مری ہوئی خبر ہے۔“ ان کا عرفانی نے ثروت کوخت ست سنا ہی نہیں۔

”سہرے میں اس خبر میں کیا مسالا ڈالوں؟ عامی خبر ہے، لڑکا اپنی بے پروائی سے ایکٹیوٹ میں گر گیا۔ اب میں اس میں کیا لکھوں کہ وہ ایکٹریس میرا کا دیوانہ پروانہ تھا؟ میرا کا وہاں سے گز رہا تھا

اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس نے اپنی حیرت انگیز سوار سائیکل چلائی کہ وہ میرا کے پاس نہیں بلکہ سید اللہ کے پاس چلا گیا۔ "ثروت نے طنز پر اعجاز میں پڑھا تھا۔  
"واہ ثروت! تم تو اتنا اچھا مسالہ ڈالٹی ہو خبر میں..... تو پھر مجھے کیوں ہو کہ تم کو خبر میں عرض نہیں کرتی آئی؟" سرانی نے پورے زور سے اپنی بات پر قائم رہے ہوئے سوال کیا تھا۔

"سرانی پلیر ہے سراسر زیادتی ہے عوام کے ساتھ۔ ہم لوگوں نے خبروں میں مسالا ڈال ڈال کر اپنے ہی لوگوں کے جذبات سے کھیل کر ان کو نفسیاتی تار چڑھنے کو عادت بنالیا ہے۔ یہ میرا ہمارے پروفیشن کے ساتھ ہے ایمانی ہے۔" ثروت نے نایا نیا یہ اخبار جو ان کیا تھا اس لیے تصویر کیا کہ وہ سراسر اس سے مستحکم کرنا دھواں ہو جاتا تھا۔

"ڈیزر جرنلٹ.....! ہمارا پروفیشن تو یہی ہے کہ خبر کو کھینچ جائے تو پھر کیوں تم اتنی ہانپھ رہی ہو؟" سرانی نے سکون سے اپنی ناک سے نمی اڑائی تھی۔ دراصل انہوں نے نمی نہیں بلکہ ثروت کی بات اڑائی تھی۔ ثروت کو حوصلہ ضبط کرنے کے رتے رونا آگیا لیکن وہ سراسر اخبار کے سامنے کر دھوئیں پڑنا چاہتی تھی۔  
"سراسر ہمارا پروفیشن ہے نہیں ہے کہ خبر کو کھینچ جائے بلکہ ہمارا پروفیشن یہ ہے کہ ہم لوگوں تک کچھ خبر پہنچائیں۔" ثروت نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو ہم بھی خبریں ہی دیتے ہیں۔ ہم اور کیا کرتے ہیں۔" سرانہ کی بے نیاز سی انتہا پر تھی۔  
"سر! ایک سیدھی سادی بات کا اتنا بناؤ سنگھار کراؤ لے ہیں کہ وہ اتنے زیادہ میک اپ میں اپنا اصل مطلب بدل چکی ہوتی ہے۔ تو ایسے میں کون سی کچھ خبر؟ کسی ایماندار کی؟" ثروت نے نگاہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ شدت جذبات سے اس کی لہجہ اپنی

ہی زبان اور لفظ مونے پڑتے جا رہے تھے۔  
"میں ثروت آپ بہت جذباتی ہیں۔" سرانی نے یوں کہا جیسے کوئی ڈاکٹر کسی مریض کی نصیحت کرتا ہے۔  
"اور آپ.....؟" آپ جذبات سے کھینچنے والے کسی بھی جذبے سے عادی انسان ہیں۔" ثروت اتنا کہہ کر دہان کی نہیں بلکہ تیزی سے باہر نکل گئی۔  
جبکہ سراسر اخبار نے یوں کندھے اچکائے تھے جیسے ان کے لیے ثروت اور اس کی بات کی رفتی ہمراہیت نہ ہو۔

☆☆☆

"سرانی کتنے کنصور ہیں یا؟ تو ان لگا ہے کہ وہ کسی سے بھی پیار نہیں کر سکتے۔" مازہ نے ایک دم کمپیور سے نظریں اٹھا کر ثروت سے کہا۔  
"خیر مت آج اپنے آئیڈیل مین کے متعلق اتنی بھلو باتیں کیسے کی جا رہی ہیں؟" ثروت نے فراسر کی ہوا کر پورڈ کے ساتھ کھاتے پوچھا۔

"ہی راجا کے ساتھ رات دن رہنے کے بعد اسے لال شکل دکھا دی ہے۔"

"جب لڑکی سرخ جوڑے کا خواب بین لیتی ہے تو یہ بندہ فوراً سرخ شکل دکھا دیتا ہے۔" ثروت نے دانت بچھ کر کہا۔ "میری اس مختصری ڈیڑھ سالہ ڈاکٹر کی میں یہ کوئی چچی لڑکی ہے جس کو سرانی نے چھوڑا ہے۔ اللہ جانے یہ شخص کبھی کبھی ہے کبھی محبت کر سکتا ہے یا نہیں۔" ثروت نے سزے ہوئے بچے میں بے آواز بلیکنا۔

"اللہ تو جانتا ہے آپ بھی جان لو کہ سرانی صرف اور صرف اپنی ماں سے پیار کرتا ہے۔ اپنی دہائی میں لوگ جو شرتے بناتے ہیں وہ بہت نام پاس ہوتے ہیں۔ میرے لیے بھی سارے رشتے نام پاس ہیں آپ کو کوئی برا نام؟" سرانہ کو خبر ہو کر کہ جانے کہ دو دروازے میں آکھڑے ہوئے تھے اور ان کی ہانپھ سن رہے تھے۔ بہت سکون سے ان کے سوالوں کو

جواب دیتے ہوئے بولے۔ ایسے ہی ثروت اور مازہ ادھر ادھر جا گئے کیا تلاش کرنے کی گئی تھی۔ شاید چھپنے کے لیے کوئی جگہ۔

☆☆☆

"محترم اور مزید سبکی! اپنی بارگاہ سے آپ کھانا کھا لیا کہ میرے تو ڈیوٹی آدھی ایسے ہیں، میں رقت پر کمر نہیں آسکتا۔" اخبار نے ماں کے ماتھے پر ہوسریٹے ہوئے کہا۔

"میں تیری ماں ہوں، بیوی نہیں جو تیرے بغیر کھانا کھاؤں۔ بیویوں کو چاؤ ہوتا ہے شروع کے سالوں میں انتظار کر کے کھانا کھانے کا۔ لیکن وقت کے ساتھ یہ چاؤ کم پڑتے پڑتے ختم ہو جاتا ہے۔ جبکہ ماں کا انتظار دینے والیوں میں بھی کبھی وعدہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ انتظار کرتی ہے اپنی اولاد کا۔" امی نے ہلکوں لہجے میں کہا۔

"اوکے مان لیا سبکی، چلیں کھانا کھائیں۔"

اخبار نے ہنستے ہوئے کہا۔  
"میں نے بریانی بنا رکھی ہے پھر تو لیت تھا تو میں نے پائے بھی پڑیٹر کر میں چڑھا دیے۔ بس پانچ دس صنف کھیں گے۔" اخبار کی امی یہ کہہ کر کچن کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

ابھی ان کو کچن میں گھسے چمچ منٹ ہی ہوئے تھے لیکن سے بہت زوردار دھماکے کی آواز آئی۔ اخبار محسوس ہو کر کچن کی طرف بھاگے تھے پڑیٹر کھپٹ

پڑا تھا اور اخبار کی امی کچن میں سے ہوش پڑی تھیں۔  
"امی.....!" اخبار کی جی بے اختیار تھکی۔ وہ کمرہ کلاک کیسے بغیر ماں کو اپنا چل لے کر کمرہ گئے تھے۔

☆☆☆

"امی پلیز حوصلہ پکڑیں، اس واقعے کو چار ماہ ہونے کو آئے، آپ کو اللہ نے نئی زندگی دی ہے موت لائے آپ کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ آپ آخر کب

تک اس خوف میں بیٹھی رہیں گی۔" ارم نے ماں کا ہاتھ محکم کر کہا تھا۔ پڑیٹر گھر بیٹھے سے ان کی کمر پر کمر کھائی پڑا تھا جس سے ان کی کمری طرح چمک رہی تھی۔ مسلسل علاج کروانے سے ان کو آرام تو آگیا لیکن ان کے اندر جو خوف بس گیا تھا ابھی اس کا علاج باقی تھا۔

ارم کی نیند اسے ماں کے پاس آئی تو ان کو کچن میں جاتے ڈرتے دکھا۔ برز کو گھلاتے ہوئے ان کے ہاتھ کھینچتے تھے۔ وہ ہر وقت ایک خوف میں مبتلا رہتی تھیں۔ ارم سے یہ بات برداشت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ماں کو کھلیفہ کے زور غری کیوں تکلیف آجائے تو بیٹھ اس کی تکلیف کے زور غری کیوں گزارنے والا نامہ اور اپنی ماں کی انسان ہوتا ہے اور اپنی ماں اللہ تعالیٰ کی نہایت پابند ہے۔ ارم کی بات سے شک و گمان کے دل کو گچی کچن ان کا دل اب بھی اس دھماکے کی آواز اور کھلتے ہوئے پانی اور تکلیف میں اٹھکا تھا۔

"میں کوشش کروں گی ارم کہ میں یوں ہر وقت پریشان نہ رہوں۔" بیٹی کے بار بار کہنے پر بالآخر انہوں نے بیٹی سے وعدہ کر لیا تھا۔

"اور ہاں امی آپ نے بہت اکیلے و گردن گردی گزار لی۔ اب اپنا کوئی اسسٹنٹ ہی لے آئیں اور اخبار کی شادی کر دیں۔ آخر کب تک انتظار کریں گی کہ اخبار کو کوئی لڑکی پسند جائے۔ آپ بس اپنی مرضی کریں۔" ارم نے ماں کو دوسری بار بھی دھمکا دی تھی۔  
"ہاں کبھی تو تم ٹھیک ہو۔ اب واقعی اخبار کی شادی ہو جانی چاہیے۔" بیٹی بار بار ان کے لہجے میں اس معاملے کے بارے میں تھپتھپی آئی تھی۔

☆☆☆

اخبار کے اخبار سے مزید حیرتی یہ کہ تم کی انہوں نے ایک نیوڈ جھیل میں خرید لیا تھا۔ پرانا سارا مملہ ایک لکڑی میڈیا میں چلا گیا تھا۔ چونکہ ماگ اخبار سے



سالگرہ منبر بہت خوش تھے۔ اس لیے اس کے چیف ایڈیٹر نے نیوز جیمیل کی تقریباً پوری ڈسٹ داری دے دی تھی اور افکار بہت خوش تھے اور روز ہر قسم کی خبر کو خوب سالہ دار بنا کر پبلش کرنے کے لیے پاس کرتے تھے۔

”یاد رکھو روزے کوئی بلاست ہی نہیں ہوا؟ کب تک شعیب اور ثانیہ مرزا کی پٹی چلے گی؟ مجھ پر نہیں آ رہا۔ اپنے جیمیل کی تو ریڈ پٹی ہی سونی ہوگی۔“ افکار کہہ رہے تھے اور ثروت نہایت دکھ سے اس خوب صورت انسان کا بد صورت دل محسوس کر رہی تھی۔ روز کی پچنی اور سچ شدہ لاشوں کی لائیکورینج ہوتے دیکھنا کتنا اذیت ناک عمل تھا اور سراسر افکار چپکے لے کر باپ کا کر رہے تھے۔

”سر آپ کا کیا خیال ہے بلاست کیوں نہیں ہو رہی؟ کیا حکومت نے اپنی ڈسٹ داری کو محسوس کر لیا ہے؟“ اقبال نے افکار سے پوچھا۔

”نہیں!.....! دو ماہ کے لیے نہیں ہو رہے کہ کوئی آجیٹل سکیورٹی سسٹم رائج کر دیا گیا ہے بلکہ یہ اس لیے نہیں ہو رہے کیونکہ دہشت گرد بھی بلاست کرنے کے موذ میں نہیں ہیں۔ ابھی فوراً بلاست ان کے منصوبے میں نہیں ہے۔ اس لیے دھت کہ کب ان کا موزہ بنتا ہے اور کب ہمارے نیوز جیمیل کی رونق بنتی ہے۔“ سرائی نے حمرے سے جائے کے سب لیتے ہوئے کہا۔ جبکہ ثروت نے غصے سے سر جھکا لیا اگر اہم میٹیک نہ ہوتی تو وہ کب کی دہاں سے بھاگ چکی ہوتی۔ اسے سرائی کی بے رنگی پر بہت زیادہ غصہ آتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ان کو اپنے دل سے بہت قریب دیکھتی تھی اور جب وہ اس کے قصور سے بے شک کوئی بات کرتے تھے تو وہ بہت زیادہ دھکی ہو جاتی تھی۔

☆☆☆

”ابھی ابھی پنجاب میں دو گاڑیاں بارود سے بھری

داخل ہوئی ہیں، خبر فوراً ریڈ پٹی پر چلا اور بارود بھری نٹلی پٹی پر لے گاتا۔“ سرائی نے خبر لا کر ثروت کو دی۔ ”سر آپ کا سوس آف نیوز اتنا تیز ہے تو آپ کو بتا بھی ہوگا کہ گاڑیاں کہاں ہیں۔ آپ پولیس کو خبر کرویں تاکہ کوئی جانی نقصان نہ ہو۔“ ثروت نے بے حد دل سے مشورہ دیا۔

”اوئے جیو.....! یہ نیوز جیمیل ہے یہاں خبر بنائی جاتی ہے بگڑی جاتی ہے لیکن سلوشن نہیں نکالے جاتے اگر ہم سلوشن نکالنے لگیں گے تو پھر تو سب اچھا ہو جائے گا اور سب اچھا ہو جائے گا تو پریشان تو ہم نیوز جیمیل کیسے دیکھے گی اور نہیں دیکھے گی تو ہمارا جیمیل کیسے چلے گا پبلش نہیں چلے گا تو ہمارے گھر کا چوٹا کیسے چلے گا۔ اس لیے تم ہر دقت سوشل سروس نہ کیا کرو۔“ سرائی کہتے ہوئے کہا۔

”سر پلیز! اس طرح کی خبریں لوگوں میں خوف ہراس پھیلاتی ہیں۔ اب پنجاب میں گاڑیاں داخل ہو گئی ہیں۔ جو بھی سنے گا خوف زدہ ہو جائے گا۔“ ثروت بھی بولنے سے باز نہیں آئی۔ ”مجھے تکلیف ایک آنٹی ملیں ان کو اس نیوز سن کر ہائی بلڈ پریشر کی بیماری ہو گئی ہے۔ ایسے ہزاروں لوگ ہوں گے سر..... ہمیں انسانیت کے نامے ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔“ ثروت نے جمل سے ان کو سمجھایا۔ ”مس ثروت، آپ کا کارڈ ایسی فائلڈ ہو چکا ہے میں کام شروع کریں، آپ کا بھلا نیوز جیمیل میں کام؟“ سرائی نے میز پر پڑے غصہ دینے کو گھما لے ہوئے کہا۔

جوا نیوز روم میں مختلف کونوں سے ہنسی کے آوازیں برآمد ہو گئی ہیں۔

”مس ثروت، نیوز ہو یا پھر پھل مری جب تک اسے سالانہ لنگہ ہوا ہے کوئی نہیں پوچھتا اور ہم بیل اور لی گڈ سیکر..... ورنہ تو لیا ضرور دو بیگے۔“

افکار کہہ کر اگلے کیمین میں داخل ہو گئے تھے۔ ”کیا ہمارا سسٹم بدل سکتا ہے؟ کیا یہ غصہ بدل سکتا ہے؟“ ثروت نے بے اعتبار خود سے سوال کیسے تھے لیکن اس کے اندر سے آواز مغمم پھر کر خالی ہاتھ لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

”سر بلاسٹ ہوا ہے۔“ قائم تیزی سے کیمین میں داخل ہوا۔ ”کب! کتنے بجے؟“ سرائی نے جلدی سے نیوز روم کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی ہوا ہے سر۔“ قائم نے بے حد ڈسٹ داری سے جواب دیا۔ ”آگنے سے پہلے تم نیوز روم میں خبر کو شفٹ کر آتے تھے نا؟“ سرائی نے پوچھا۔ ”نوسر، پہلے آپ کو بتانا لازم تھا۔“ قائم نے کہا۔

”ایڈیٹ.....! تمہیں معلوم ہے کہ خبر چاہے قدرتی سیکٹر ہی کیوں نہ لیٹ ہو، کتنا برا نقصان ہے۔ اس سیکشن میں تو سب سے پہلے خبر لگنے پر ہی خبر لے رہے ہیں۔“ سرائی نے غصے سے قائم کو گورے ہوئے کہا اور پھر تیزی سے نیوز روم میں داخل ہو گئے تھے۔ باتیں کر کے وہ حد اس خبر کو لے نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ ڈانٹ کو کسی اور موزق پر شفٹ کر کے کام میں مصروف ہو چکے تھے۔

☆☆☆

”مس ثروت آپ کی انکوائری ہے، کیا آپ نے وضاحتی پیج سر کے روم میں شیج دے؟“ قائم نے آواز میں کہو چڑکایا۔ ”جو نہ جانے کہاں تھی۔“ ”قائم، سرائی راز خراب کیا کیوں کرتے ہیں؟“ ثروت نے نہایت دکھ سے کہا۔ جس شخص کو وہ ٹوٹ کر چاقا قتی اس کی کوئی ایک عادت بھی اسے پسند

نہیں تھی پھر بھی اس کا یہ دل ایسے قی شخص پر کیوں سخت تھا وہ نہیں جانتی تھی۔

”اچھا تم دل نہ چھوٹا کرو۔ میں بھی تو اس انکوائری کی زد میں ہوں۔ یہ کوئی بات بہت بڑی بات ہے۔ اس طرح کی روک ٹوک وضاحتی انکوائری تو ہر سسٹم حصہ ہوتی ہیں۔“ قائم نے اپنی طرف سے اس کی خاصی ڈھارس دینا چاہی کی جبکہ ثروت نے بے اختیار گہری ٹھنڈی سانس بھری تھی جس میں بے بسی کا عنصر بے حد نمایاں تھا۔

☆☆☆

”سر، میں نے لکھ تو دیا ہے کہ وہ ایک کرکٹر تھا۔ ہم نہیں تھا تو پھر بھی کیسے..... یہ خبر ہم دھما بنا کر چلا دی تھی۔ اس طرح لوگوں میں دہشت بکھیتی ہے سر۔“ ”تو.....؟ دہشت بکھیتی ہے تو لوگ نئی وی محول کر نیوز جیمیل دیکھتے ہیں نا اور نہ تمہیں اگر یاد ہو کہ نیوز جیمیل کے اسے اہم مقام کا قصور بھی نہیں تھا۔ لوگ ٹو بجے کی خبریں بھی لگے بندے اس انداز میں دیکھتے تھے لیکن اب دور بدل گیا کیونکہ اب خبر میں وہ ساللا ہوتا ہے۔ مٹنی ہوتی ہے جو دور کو پل کرتی ہے کہ نیوز جیمیل کو مل کر دیکھیں۔ ایسے دیکھیں جیسے وہ کوئی نفل آف قتل فلم دیکھ رہے ہوں۔ کوئی گیسر ڈراما دیکھ رہے ہوں۔ کیونکہ مسٹری پیدا کرتے ہیں اس لیے ویوزر جیمیل کو مل کر بیٹھتے ہیں۔“

”سر یہ نہیں ہے، دہشت ہے جو ہم پھیلاتے ہیں اور میں ٹیک خبریں نہیں پھیلاؤں گی۔“ ثروت نے غصے سے کہا۔

”دیری ٹی، آپ یہاں ملازم ہیں۔ آپ کا جو کام ہے آپ نہ صرف اس کو کرنے سے انکار کر رہی ہیں بلکہ باقاعدہ مغم دے رہی ہیں کہ یہ کروں گی وہ نہیں کروں گی۔ واہ.....“ سرائی نے تالی مار کر کہا۔ ”آئی لایک یور کا فیڈس لیکن میڈم اچھا ہوتا



کہ آپ کا فیڈبکس اپنے کام کے لیے استعمال کریں۔ وہ آپ نے کرنا نہیں ہے اور ہمیں اپنے جیکٹ میں صحت کرنے کی سہولت نہیں رکھنی ورنہ تو ہمارا ہیڈ آفرق ضرور ہوگا۔ سواری اچھے سے سواری کیجئے بہت تکلیف ہو رہی ہے، آپ مزید ہمارے ساتھ نہیں چل سکیں گی۔“ سرائی نے ایک اور دھماکا کیا تھا۔ ثروت نے بے حد شاک سے سرائی کو دیکھا پھر ایک دم ہمیری سانس پھر کر اپنے آسودہ کیے تھے۔

غیر کاویا دکھ ہوا خوشی وہ عام سا لگتا ہے لیکن جن لوگوں کو جانے انھارے میں ہم اپنے دل کے قریب مقام دیتے ہیں ان کی کوئی عام بات بھی عام نہیں رہتی۔ اس لیے ایسے رشتوں سے ملا دکھ کی دھڑکنوں تک کو لڑا دیتا ہے۔ خون تھکے آنسوؤں میں بدل جاتا ہے۔ ثروت کے دکھ کا مقام تو یہ بھی تھا کہ وہ عالم اپنے دوہرے ظلم سے بے خبر تھا۔

”اُدھے سرا“ ثروت بے حد مضحکہ لگاتی تھی اور دروازے کی طرف بڑھی دروازے کی تاب گھمانے سے پہلے وہ واپس مڑی سر افتخار اسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ثروت نے لب بے اختیار کاٹے تھے۔

”سر.....! جانتی ہوں جو میں کہوں گی وہ آپ کے دل تک نہیں پہنچے گا لیکن کیا کروں آپ کو جلتی بھڑکتی آگ کی طرف تیزی سے بڑھتے دیکھ کر نہیں سکتی مجبور ہوں نا.....“ ثروت کی بات پرانی نے بے اختیار سے بخور دیکھا۔ وہ کیا کہنے جارہی تھی؟ ثروت نے چہرے پر بننے والی آنسوؤں کی لکیریں سے رنج سے صاف کیں۔ جب بولی تو آواز آسودہ سے ہماری تھی۔

”بہت سال پہلے میں نے سورۃ قل کی تفسیر پڑھی تھی جس میں ایک آیت تھی کہ اگر ہم کچھ اچھا

کرتے ہیں تو اس کے سائز ایکٹھ میں کوئی اچھا کرتے ہیں تو اس کے اسٹائل کا کچھ کنٹری بیڈن ہمارے اکاؤنٹ میں ڈپازٹ ہوتا ہے اور ہم اگر کچھ ایسا برا کرتے ہیں کوئی ہم سے انہماز ہوتا ہے یا پھر ایکٹھ ہوتا ہے تو اس کا بھی کچھ حصہ ہمارے ہی اکاؤنٹ میں ہمیشہ ڈپازٹ ہوتا ہے اور یہ سلسلہ یہاں نہیں رکتا ہے جو جو ایکٹھ ہوگا سب کا حصہ جائے گا اکاؤنٹ میں۔ نہ نیاں پہلے کل میں بائیل قاتیل کی کہانی میں پہلے قاتل کے اکاؤنٹ میں سب قاتلوں کے اعمال کا حصہ اس کے حصے میں جمع ہو رہا ہے۔“ ثروت جلدی جلدی بول رہی تھی۔ آسو تھکے کر کے کاٹا نہیں لے رہے تھے۔ سر افتخار کے ماتھے پر ہل چکی واضح ہو گئے تھے۔

”آپ جانتی ہیں آپ کی یہ صحت کرنے کی عادت اور اس طرح کی صحت ہماری تھار ہی آپ کی جا ب چھنے کا سبب ہے۔“ ثروت نے بے اختیار ہمیری سانس ہمیری تھی۔

”بند دروازوں سے دستک واپس مڑ آتی ہے۔“ سر افتخار کے دل کے دروازے بھی بند تھے۔ ”کاش آپ کو میری بات سمجھ آجائی۔“ ثروت نے بے حد حد سے دل ہی دل میں کہا اور اس کی نظروں سے سر افتخار کو جاتے جاتے دیکھا کہ سر افتخار جیسے سخت دل انسان بھی سوچ میں پڑ گئے۔ ثروت چلی گئی۔

آئندہ کئی دنوں تک سر افتخار کام کی بے حد مصروفیت میں بھی وہ آنسوؤں ہمیری آنکھیں بھلا نہیں پائے تھے۔ ایسے میں وہ بے اختیار سر اور کندھے ہار بار بھجھتے تھے۔

☆☆☆

”ثروت جب سے تمہاری جا ب ختم ہوئی ہے تمہاری ٹینڈر نہیں ختم ہو رہی ہے۔“ می نے ثروت کے مندر سے رضائی پٹینی۔

”مئی سوئے دیں ناں.....“ ثروت نے دوبارہ لحاف میں منہ چھپایا۔

”بس بہت ہو گئی.....! اور کتنا ضائع کرو گی خود کو۔ تم نے جا ب کی اجازت مانگی وہ دی اب اور کیا کرنا ہے؟ بس اب شادی کرو۔“ می نے اس کے پاس بیٹھے ہوئے کہا۔

”ش..... شادی.....“ وہ اپنے لیے ہال سمیٹ کر آذرہ ہو کر بیٹھی۔ می نے بے حد جا سے اپنی اکوٹی چٹی کو دیکھا۔ وہ ان کی زندگی کی واحد خوشی تھی۔ اس کا دکھ ان سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔

”بھول جاؤ اسے.....! وہ تمہاری فیکلر فیکلر تھی ناں پھر کیا عبت کا کیا فائدہ۔“ می نے پیار سے اسے ساتھ لگایا تھا۔ وہ ان کی بہت پیاری بیٹی تھی۔ ثروت نے بھی اپنی سیلیوں ہمیشی ماں سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

”مئی! اجن لوگوں نے زندگی میں رہنا نہیں ہوتا پھر وہ ہماری زندگی میں آتے کیوں ہیں؟ اور اگر آتے ہیں تو بھولتے کیوں نہیں؟“ ثروت بے حد مدھی ہو گئی۔ می نے بے اختیار پیار سے لگایا تھا۔

”یہ سب اللہ کی جھٹکتیں ہیں، شروع شروع میں انسان ان کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے بعد میں اسے خود اندازہ ہو جاتا ہے کہ اللہ کی مرضی تھی وہ بہترین چیز تھی اس کی زندگی کی۔“

”سب جانتی ہوں اور انا جانتی بھی ہوں می! آخر آپ کی بیٹی ہو، کیسے اپنی ہم بات سے انکار کر سکتی ہوں۔“ ثروت نے ہلکے ہلکے میں کہا۔

”آپ میرے لیے دعا کیجئے گا۔ ماؤں کی دعائیں تو بہت قبول ہوتی ہیں ناں..... اللہ تعالیٰ مجھے اس عبت کے آواز سے نکال دے۔ میرا دل میری بے بسی بننے سے رک جائے۔“ ثروت نے اپنی بے بسی کی حد تک ماں کو دکھائی تھی۔

”میرا بچہ.....“ می نے اسے ایک بار پھر سینے سے لگایا۔ ”تمہاری ماں تو ہر ہل..... ہر ہر سانس تمہارے لیے دعا گو ہے میری جان! اللہ سونہا کرم کرے گا۔“

☆☆☆

”جسمیں سنی کر کہا ہے کہ شادی کرو، امی کو کوئی ساتھی چاہیے۔ ان فیکٹ ہمیں بھی ساتھی چاہیے۔“ ارم بائی فون پر کہہ رہی تھیں۔

”کیوں آپ میری آزادی کی دشمن بن رہی ہیں۔“ افتخار نے بات بھی میں اڑانے کی کوشش کی تھی۔ ”افتخار میں بہت عجیبہ ہوں، ہم کو کوئی پسند نہ تو بتاؤ ورنہ میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے۔ بس وہ فاکل کرو دیتی ہے۔“ ارم بائی نے باقاعدہ مدھی دی تھی۔

میں کوئی فرد نہ تھا۔ افتخار کہہ کر تھے تھے اسی ہل داغ کے پردے پر دو آنسوؤں میں ڈوبی آنکھیں لہرائی تھیں۔ افتخار کا قہقہہ ایک دم رک گیا تھا۔ خود افتخار کو اس احساس پر حیرت سے جھٹکا لگا تھا۔

”جہوں میں.....! اس زندگی کی بیخیز میں..... کوئی کوئی“ فرخو تھا۔

”کیا ہوا دانی.....؟“ ارم بائی پر چڑھ رہی تھیں۔ ”نک..... کچھ نہیں ہوا۔ میں بعد میں بات کرتا ہوں۔“ سر افتخار نے لمبم انداز میں فون رکھ دیا اور بے اختیار آنکھیں موند کر کرکے سے سر لگایا۔ اب ذہن کے پردے پر دو ڈوبائی آنکھوں کے ساتھ اس چہرے کے نقش بھی ابھر رہے تھے۔ وہاں ایک مکمل چہرہ اب موجود تھا جس موجود تھا۔ وہ عکس ثروت کا تھا۔

☆☆☆

”ای کیوں آپ کا پانی پی رہا ہے۔“ انی کو اسی کے روز بڑے ہوئے پی پی پریشانی ہو رہی تھی۔

”ٹھیک ہے لے جاؤں گی۔ مجھ سے ٹھیک سے جلتا تو ہے نہیں۔“ امی نے منہ بنایا تھا۔

”آپ نے کون سا کچھ کرنا ہے، بس یہ ہر اٹھن دبا کر کال منٹی ہے۔“ افی نے اپنی سادہ سی ماں کو بے حد پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ امی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”افتخار میری بہت شدید خواہش ہے کہ تم اب شادی کر لو۔“ امی نے بیٹے کا اچھا موڈ دیکھ کر بات کی تھی۔

”امی ابھی تو میں جلدی میں ہوں پھر بات کریں گے۔“ انہی نے ہمیشہ کی طرح اس موضوع سے جان چھڑائی تھی۔ اور اپنا سیل فون اور لیپ ٹاپ اٹھا کر باہر نکل گئے تھے۔

”ہمیشہ اس موضوع سے بچتا رہتا ہے۔ آخر کب تک بچے گا شادی نو کرنی ہی ہے۔ اپنی ہی پسند بتادے لیکن یوں کیوں بھاگتا ہے۔“ امی نے کچھ زچ ہو کر آواز بلند کہا تھا۔

☆☆☆  
 ”سرمون مارکیٹ میں بم بلاسٹ کی اطلاع ملی ہے۔“ نواز بھاگتا آیا تھا۔ اخباری ریکارڈنگ ٹیم کو لے کر ایک جگہ کی کورج کے لیے نکل رہے تھے۔  
 ”واٹ.....!“ سرمون اخبار کے ہاتھ سے فائل چھٹ کر نیچے جا گری تھی جو وہ نکلنے سے پہلے کمرے

کھڑے دیکھ رہے تھے۔ افتخار اپنی گاڑی کی طرف دوڑے تھے۔ کون سی کوریج..... کون سی نیوز..... افتخار کو کوئی خبر نہیں تھی۔

”ای.....!“ افتخار کی آنکھوں سے آنسو ٹپکیوں کی صورت نکل رہے تھے۔

”سر..... سر۔“ انہیں پیچھے سے بہت سارے لوگوں نے آوازیں دیں لیکن افتخار کو تو کوئی چیز نہ دکھائی دے رہی تھی نہ کسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

”ای..... ای.....“ افتخار کے ہاتھ اسٹیرنگ پر

کانپ رہے تھے۔ آنسوؤں سے بار بار منظرِ دھندلے  
ہو رہے تھے۔

”بیاری امی جان فون اٹھائیں۔“ انھارے رستے پاگوں کی طرح فون لاتے رہے لیکن امی فون نہیں اٹھا رہی تھیں۔ ٹریک نو کیپس کے پاس آ کر دو روٹک جام جمی۔ انھارنے اسٹیرنگ پر بے اختیار کار مارا تھا۔

”امی.....!“ افتخار کو لگ رہا تھا کہ ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ اپنی سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔  
”سر آپ بہت مضبوط ہیں، بہت اسٹرونگ

ہوتے ہیں جب تک کسی اپنے کی مجبوری اور دکھ نہیں آتا۔“ کوئی سرائخار کے کانوں میں سرگوشی کر رہا تھا۔

”کسی اپنے کی تھوڑی سی چوٹ کسی کا ری ضرب

سے نہیں ہوتی ہے۔“ ان کے دماغ میں کسی کی آواز  
 کو گونجی تھی۔ آج ان کو احساس ہوا تھا کہ کسی اپنے کی  
 گمشدگی ہو یا اس کی خیریت کی گمشدگی کیسے انسان کی  
 خودی سانس گشودہ کرتی۔

”ای۔ اے اللہ! میری ماں کو سلامت رکھنا“، انکار اللہ یاد آئی گیا تھا۔ دور تک ٹریفک جام کے اوسان خطا کر رہا تھا۔ سر انکار نے گاڑی وہیں چھوڑی اور یہ سوچے بنا کہ ان کی گاڑی ان لاک بھی۔

یہ وہ ہی گاڑی تھی ناں جو انہوں نے بڑے ارمانوں سے خریدی تھی لیکن اس وقت انہیں ہوش تھا ہی کہاں۔ جب وہ سخت سردی میں پسینے پسینے بھاگتے مومن

مارکیٹ تک پہنچنے تو ہر طرف جھگڑا مچی ہوئی تھی۔ وہاں بلاسٹ نہیں ہوا تھا۔ بلاسٹ کی انوائسٹی لیکن بازار میں موجود بچے اور خواتین خوف و ہراس کی وجہ سے

ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے تھے اور اس بھکڑ میں بہت سارے لوگ پاؤں تلے روندے گئے تھے، خواتین زخمی ہو گئی تھیں۔ انتظار میں باہر کھڑے

لوگ بھی اس اطلاع کو سن کر اندر بھاگے تھے۔ انھار

میرے مسافر

تم گزرتے جو میری راہ سے  
تو میں راہ کے ہر قدم پر  
اپنے آج کل کے ستارے کا نگہ دیتی  
اپنی آنکھ کے سارے ارماں راستے میں سہا رہتی  
تمہارے ہر قدم سے اپنے دل کی دھڑکن باندھ دیتی  
اپنے جنون کی ہر خوشی تمہیں دے کر  
تمہارے غم سارے دامن میں بھر لیٹا اپنے  
لیکن اس کا کیا کر کہ میرے دل میں میرے اس سفر کا  
سفر دوسرا تھا  
رہ کر دوسرا تھا  
ہم دوسرا تھا

مرسلہ: رابعہ انجم، پتوکی

ہم سب سے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ ہر خاتون کا رویا اور چیخا وجود ان کی ماں میں ڈھل رہا تھا۔

”امی.....“ ہر جگہ ماں کو تلاش کرتے کرتے  
اختیار ہانپ رہے تھے۔

”امی..... امی..... کہاں ہیں۔“ وہ امی کو فون ڈائل کر رہے تھے۔

”پلیز امی فون اٹھائیں۔ اے اللہ..... میری ماں سلامت رہیں۔“ اسی بل جب وہ ادھر ادھر دیکھ رہے تو ایک بچہ جو تقریباً پانچ چھ سال کا تھا ایک بوٹ

پہنے ان کو ردائیں نظر آیا تھا۔ وہ اپنی ماں سے ٹھٹھکیا تھا۔  
 انکار نے اسے بغور دیکھا تو انہیں لگا کہ ان کے آنسو  
 بالکل اس بچے سے مشابہت رکھتے تھے۔ دونوں کی

ماں چھڑی مٹی۔  
 ”ماما..... اما.....!“ بچہ روتے روتے چلا رہا تھا۔  
 افتخار کا پتھر دل اس کی کرب سے بھری آواز سے

ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء



اختیار بننے کی طرف بڑے اور بچنے کو  
گود میں اٹھالیا۔ دونوں کا غم مشترک تھا۔ ایک کہیں  
بچنے سے اتنا شرم پیدا تھا۔ ہمیں تین سال تک صرف کہیں  
کی آواز نے لوگوں کو اس قدر کیوں بدحواس کیا تھا۔  
آخر لوگوں نے کیوں نہ اسے نہیں کیا تھا۔

صاف جیتھی۔ ہمارے ننڈ جھیل اور اخبار لوگوں کو اتنا  
ڈرا گئے ہیں کہ ایک عام کرکٹر ہو یا ایک بم کی بھوتی  
اطلاع ہو تو بھی سب کے لیے اتنی ہی نقصان دہ ثابت  
ہوئی ہے جتنی کہ سچ میں ہو سکتی تھی۔ ہماری قوم اتنی ڈر  
جکی ہے کہ خالی شیر آبی کی اطلاع پر لوگ اپنے حواس  
کھود دیتے ہیں۔ سرائی کے ذہن کے پردوں پر ایک  
بار پھر کوئی چلا جا تھا۔

”اگر سر یہ حواس کون چھین رہا ہے؟ یہ حواس  
ہمارے خبروں کو دیے مسالے چھین رہے  
ہیں۔“ ثروت کی آواز نے ایک بار پھر ان کا پیچھا کیا  
تھا۔ اختیار بننے کو ہار لے کر آئے تھے اسے پیار کیا تھا۔  
وہ اب چپ تھا ان کی گود میں تھا۔ چاکل کوئی عورت  
ان پر بھیجی تھی۔

”میرا بچہ.....“ اختیار نے پھر اسے دے دیا۔  
ماں دیوانہ دار اسے چوم رہی تھی۔ اختیار کا سر اور نگاہ  
شرم سے جھکتی جا رہی تھی۔ جانے وہ کب سے ایسے  
مناظر کا باعث بن رہے تھے اور ان کو اس کا احساس  
نک نہیں تھا۔

”آ..... میں کیا کیے جا رہا تھا۔ واقعی میں بھول گیا  
تھا کہ تو کسلا گلا کہ بار بار جیل چلے جانے سے وہ لوگوں  
کے حواس چھین کر بہت بڑے مجرم بن چکے تھے۔

”اے اللہ..... میں زندگی میں اب بھی دوبارہ  
ایسا کام نہیں کروں گا۔ میں بھی لوگوں میں خوف و  
ہراس نہیں پیدا کروں گا، مجھ پر درست خبر کا باعث بنوں  
گا۔ میری ماں کو سلامت رکھنا۔ مجھے معاف کر دے۔  
اپریل 2012ء

نکین کیا واقعی سر بدل گئے ہیں جو معافی مانگ رہے  
ہیں۔ دل نے سوال کرتے ہی ایک خوشی سی محسوس  
کئی۔ یہ دل کے سوئے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اپنا  
پائنتھوڑی سی بھی درگاہ دکھاتا ہے تو اسے گزشتہ سو  
خون معاف کر دیتا ہے۔ ثروت پر بھی یہی کیفیت  
طاری تھی۔ اسی لیے وہ بے اختیار ہل رہی تھی۔

”اسی اوکے سر۔“ سرائی کی نظروں میں ہل  
بھری جو احساس ابھر کر ثروت کے وجود کو چکا چوند  
کر گیا تھا اس پر ثروت نے بے اختیار ہلکا ہلکا کی۔  
”میں یہاں بک شاپ سے کچھ بس لے آئی  
تھی۔“ ثروت نے پیچھے دوپہ طاری کیفیت سے لپٹے  
کو کہا تھا۔

”اس بچی کا کچھ بہت بڑا احسان ہے اس نے  
آج میری جان بچائی ہے۔“ اسی نے ثروت کو پیار  
سے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔  
”آپنی چٹنی، آپ ایسی بات کر کے شرمندہ نہ  
کریں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ کاش میرے بس میں ہوتا  
تو میں کسی کو بھی ایسی چیزیں سے نہ گزرنے دیتی۔“  
ثروت نے بہت ممتحنہ انداز میں کہا تھا۔ اختیار  
نے بے اختیار دیکھا تھا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ  
ثروت نے کس پس منظر میں یہ بات کہی تھی۔ وہ عینوں  
بھبھورے لگ آئے تھے۔

”آپ میرے جوتے پہن لیں۔“ اختیار کو اس  
کا گھٹنے پاؤں مڑ کر پرچا تکلیف دے رہا تھا۔  
”سر آپ کے بڑے جوتے پہن کر تو میں گر  
جاؤں گی۔“ ثروت نے کھرا کر کہا تھا۔ اختیار نے  
جنگ کر اسے چھوٹے اتارے چھوڑ کر اسے اتارے۔ وہ  
نیک کہ رہی تھی اس کے نرم و ہاذک چھوٹے سے  
پاؤں کہاں کہاں کی جوتوں میں آئے تھے۔  
”آپ فی الحال ان سے اپنے پیروں کو کور  
کر لیں۔“ اختیار نے سوکس اس کو دیکھ کر ثروت نے

نکین کیا واقعی سر بدل گئے ہیں جو معافی مانگ رہے  
ہیں۔ دل نے سوال کرتے ہی ایک خوشی سی محسوس  
کئی۔ یہ دل کے سوئے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اپنا  
پائنتھوڑی سی بھی درگاہ دکھاتا ہے تو اسے گزشتہ سو  
خون معاف کر دیتا ہے۔ ثروت پر بھی یہی کیفیت  
طاری تھی۔ اسی لیے وہ بے اختیار ہل رہی تھی۔

”نیک ہے آپ کچھ جا کر مجھے چٹنی کی اطلاع  
کریں۔“ سرائی نے رکشے والے کو پیچھے والے نکال  
کر پہلے ادا کر دیے تھے اور رکشے کا نمبر بھی اپنے سبیل  
میں محفوظ کر لیا تھا۔ ثروت رکشے میں بیٹھی تو سرائی  
نے تھوڑا سا جھک کر ثروت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔  
”ثروت میرے آفس میں ننڈ پر پڑ کر جگہ  
خالی ہے تم جاہو آؤ آؤں تو ہمارے دل سے معاف  
کر سکو تو اور دوسرے آپشن میں میری زندگی میں ایک  
صیحت کرنے والی لڑکی کی بے حد کمی ہے۔ اگر تم  
اجازت دو تو میں اس پوسٹ کی آفر کرنے اپنی اہلی کے  
ساتھ تمہاری امی سے ملاقات کرنے آ جاؤں گی۔“  
ثروت نے چونک کر سرائی کو دیکھا تھا۔ سرائی کی بے  
جھنجھان ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ ثروت کے  
جواب کے لیے اسی کو دیکھ رہے تھے۔

”سرا“ ثروت نے گھاٹکھا۔ ”آپ کو کوئی  
کام تو سیدھا کر لیا کریں۔ کوئی رکشے میں بھی پر پڑو  
کرتا ہے؟“

سرائی کے چہرے پر مایوسی کی لہر آئی تھی۔  
”یہ سچے سچے دوسرا آپشن منظور ہے۔“  
ثروت کی بات پر سرائی نے بے اختیار ہلکا ہلکا ہے اور  
چھپے ہٹ گئے تھے۔ رکشہ ان کی نظروں سے دور چلا  
گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلنے اپنی گاڑی تک پہنچے  
اور ای کو سٹ پر لٹا دیا۔ ٹریفک ابھی تک بلاک تھا۔  
لیکن ان کی زندگی میں ”غیر“ کار سے مکمل چکا تھا۔  
اپریل 2012ء



## حجابِ زبانِ جان

عنبرہ سید

وہ اپنے بستر کے ساتھ والی کھڑکی کے پٹ وا  
 کیے اس کے پار کا منظر دیکھ رہی تھی۔ صحن میں اماں  
 چارپائی بچھائے دھوپ سینک رہی تھیں اور ان کے  
 ساتھ بیٹھا حمزہ گنا چوس رہا تھا۔ وہ برق رفتاری سے  
 دانتوں سے گھسنے کا پھلکا اتارتا اور مزے سے اس کا

رہ چوس کر اس کی باقیات اپنے پاؤں کے قریب  
 چمکوں کے ڈھیر پر اچھال دیتا۔ ساتھ ساتھ وہ اماں  
 سے چادر لٹ خیالات میں بھی مصروف تھا۔ منٹوں میں  
 گھسنے کا آخری ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے  
 آنکھوں کے سامنے کیے نظروں سے ٹول رہا تھا شاید



اسے فیصلہ کرنا تھا کہ اسے چوسا جائے یا نہیں۔ کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے وہ گڑا ہونے چنگوں کے ڈھیر میں اچھال دیا۔ گئے گا آخری حصہ عموماً سخت اور کمزور والا ہوتا ہے۔ مائزہ کو پتا تھا مزہ یہ بکرا نہیں چوستے گا اور اس کے اسیار کرنے پر وہ سخت بیزار کی موز میں بھی بے اختیار کمر لادی۔

گھنے سے فارغ ہونے کے بعد مزہ نے اماں سے کہہ کہا اور ان کے جواب پر ہولے سے سر ہلایا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر کچن میں گئے ٹنگے کا دست چلانے لگا۔ کچن میں کچھ شفاف پانی اٹنگے کا "مزہ" ہے تھوڑے دور پر رکھ کر اسے بعد کیلے تھوڑے پانیوں میں بھیرے اور بال ستوارتے ہوئے اس کمرے کی سمت دیکھا جہاں مائزہ بیٹھی تھی۔

"اب اس کا اگلا قدم ادھر کو پڑے گا اور جو کچھ اس نے اب تک اماں سے سنا ہے اس کی روشنی میں یہ میرے سامنے ایک عدد تقریر چھانڈے گا جو انتہائی فصیح آموز اور بہت آموز ہوگی۔" مائزہ نے سوچا۔ لیکن وہ دیر بعد اسے کمرے کے باہر قدموں کی آواز آئی اور پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ مائزہ نے بازو گھٹنوں کے گرد باندھ کر گردن کھڑکی کی طرف موڑ لی۔ مزہ کمرے میں داخل ہو کر کچھ دیر اسے دیکھی سے دیکھتا رہا۔

"میں سمجھتا ہوں سو رہی ہو؟ جب ہی جواب نہیں دیا دستک کا۔" اس نے کہا۔ "تم پھر بھی اندر آگئے۔" مائزہ نے بدستور باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں" وہ ہنسا اور کمرے میں موجود واحد کرسی پر بیٹھ گیا۔ "اس لیے کہ تمہاری بے مروتی اور بے اعتنائی پر مجھے کوئی خاص خوش فہمی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں دوسری سوچ یہ تھی کہ ہو سکتا ہے تم اپنی ان دونوں خوبیوں کی وجہ سے جواب نہ دے رہی ہو۔" مزہ کے اس بیان پر مائزہ نے جبرجہ ہوتے ہوئے

کھڑکی کا ایک پٹ زور سے بند کیا۔ "رہائیاں۔" مزہ نے اس کی اس حرکت سے یقیناً حائل تھا تھا۔ "ٹوٹ بھی سکتا ہے۔" "تم سے مطلب....." اب کے مائزہ اس کی طرف دیکھ کر جیسے باقاعدہ میدان جنگ میں کودی۔ "تفکر نہ کرو، ٹوٹ گیا تو تم سے نہیں کہیں گے ٹھیک کرادو۔"

"میں تو خیر کیوں بھاؤں گا اگر کو بھی تو۔" وہ مزہ پر محفوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "میں تو چنگی جان کی پریشانی سے خیال سے کہہ رہا تھا۔" "تم اماں کی کج فہمی مت کرو، تمہیں وہ بھی نہیں کہیں گی کہ کچھ غلط جو ہمارے گھر میں ہوا ہے، اسے ٹھیک کر دو۔" مائزہ جیسں بچپن میں ہو کر بولی۔ "ادھ اچھا۔" وہ مائزہ کے بچے کو محسوس کر کے

مجیدہ ہو گیا۔ "اب وہ بھی کہہ دو جو اماں نے تمہیں کہنے کے لیے بھیجا ہے۔" مائزہ نے اسی جملے جیسے انداز میں کہا۔ "نہیں،" مائزہ نے کہا۔ "وہ اب بالکل مجیدہ ہو گیا تھا۔"

"کیوں....." مائزہ نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "کیا اماں کا پڑھایا سبق بھول گئے ہو؟"

"نہیں" بات نہیں ہے۔" وہ کرسی کی پشت سے ٹپک لگاتے ہوئے بولا۔ "مجھے تم سے اس لیے کچھ نہیں کہنا کہ تم سے کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

مائزہ زہر پڑ کر سر ہلائی، بالآخر اس نے مزہ کو کچھی زنج کر دیا تھا۔

"وہیے میں تمہارے اس رویے سے خاصا مایوس ہوا ہوں۔" مزہ نے یہ بات بھی بہت سنجیدگی سے کہی تھی۔

"اچھا ہوا تم کو جلدی پتا چل گیا کہ مجھ سے بات کرنے یا بڑے بڑے الفاظ سے بھر پور تقریر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" مائزہ اپنی انگلیں بیدھی

کرتے ہوئے دیوار سے ٹپک لگا کر نیم دروازے پر "بدماغی اور بدبینی کے خول کے اندر چھپ کر بے اعتنائی اور کستانجی کو ڈھال بنا کر اگر خارج میں کسی کیسے کوئی کا نام سر انجام دیا ہو کوئی معرکہ جیت لیا ہو تو مجھے ضرور بتانا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"اور اپنی مرضی کے خلاف خود پر مسلط کیے ہوئے کام کو اگر کسی کیسے تاریخ میں دھک سے سر انجام دے لیا ہو تو مجھے ضرور بتانا۔" مائزہ نے کہا۔ "ہاں ضرور۔" مزہ نے اس کی طرف دیکھ کر کسر ہلایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ادھ مائزہ نے اسے جاتے دیکھتے ہوئے سر جھٹکا۔ "چلتا مجھے سمجھتا تھا۔" ☆☆☆

"جو بات مجھے بھی کم قفل، ان پڑھ کی سمجھ میں آگئی، اللہ جانے اس کی کچھ کیوں نہیں آتی۔" اسی شام مٹی کے چولے پر بڑا واسکچہ چڑھا کر سالانہ بھوتے ہوئے ماسی ہار جہ نے خیال آرائی کی۔ "تمہیں کیا سمجھ آتا ماسی؟" مزہ نے چولے کی آگ سینکتے ہوئے دیکھی سے پوچھا۔

"سیدھی بات ہے۔" ماسی ہار جہ نے بھونکنی میں بھونک مارے ہوئے آگ کی لو بوجھانے کی کوشش کی اور پھر دھوئیں سے آنکھوں میں بھرتے پانی کو چادر سے خشک کرتے ہوئے کہا۔ "بہنی بیڑی کی شراب کی طرح کھائی ہی اچھی رہتی ہے، تنے کی طرح بے پلک، سیدھی کھڑی بہنی کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے۔"

"واہ ماسی۔" مزہ کے منہ سے بے اختیار الفاظ نکلے۔ "تو تو بڑی طاقتور کی قسطی ہے، تجھے تو دانشور ہونا چاہیے تھا تو کہہ کر بھی ہانپا یا ہون نہی ہے۔"

"میں کوئی نہیں ہوں۔" ماسی نے ہنستے سالن میں پانی کا چھیننا مارتے ہوئے کہا۔ "ذات کی نائن ہوں، ہانپا یاں لپکانے اور روٹیاں لگانے کا کام ہے میرا۔ میں اپنے جیسے کام کر رہی ہوں، مجھے اپنے کام کی

الف ب، ضرب، جمع، تقسیم ساری آتی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔" "لے ماسی! ابھی تو تو نے اتنا بھاری فلسفہ سنایا ہے، لڑکیوں کے بارے میں کچھ نہ چولے میں رکی سب سے بڑی لکڑی چولے کے اندر مزہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہائے ہائے گھسا لکڑی کو اندر، آگ خراب ہوتی ہے۔" ماسی نے اس کا ہاتھ روکا۔ "پھر وہ صحن کے اس کونے میں آتی چنگی جان سے مخاطب ہوئی۔ "کڑیوں چڑیوں کی کہانی کون سی تھی ہے جو میں نے اس کو سنائی۔"

کڑیاں چڑیاں بیڑی کی شراب کی طرح پلک کھائی ہی جلی گئی تھیں۔ "کیوں؟" اس نے تائید طلب نظروں سے چنگی جان کی طرف دیکھا جو پاس دھری بیڑی پر بیٹھ رہی تھیں۔

"دیکھتے دیکھتے یہ بھی خیال آتا ہے۔" پھر ماسی ہار جہ اور ادھر دیکھنے کے بعد سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

"کیا.....؟" مزہ نے دیکھا چنگی جان کے چہرے پر ابھی تک جگہ والا دکھا کھاسا چھایا ہوا تھا۔ "طاہرہ بی بی کا جن اور ہار جہ پر کسی تو قبضہ ہمانے کی کوشش نہیں کرنے لگا۔"

"کیا حماقت کی بات ہے ہار جہ۔" چنگی جان نے اسے ڈنکا۔ "کسی اور کے سامنے نہیں کر دینا یہ بات۔"

"لو میری غلط فہمی ماسی نے فوراً ختم کر دی۔" مزہ نے ہنس کر چنگی جان کی طرف دیکھا۔ "میں کچھ دیر پہلے ماسی کو اٹلی پائے کی قسطی قرار دے رہا تھا جن والی بات کر کے اس نے ثابت کر دیا کہ یہ تو واقعی ٹائن ہے، ہانپا یاں بھوننے اور روٹیاں لگانے والی ٹائن۔"

"تو میں نے اور کیا کہا ہے بچہ؟" ماسی نے ہنستے ماسی کے سامنے بولے آلو ڈالنے ہوئے کہا۔ "میں



اپنا کام جانتی ہوں، کتنے بندوں کے لیے کتنا کھانا، اس کھانے کے لیے کتنا سامن چاہیے، نمک، مرچ، ہلدی، گھی، سالن، پیاز، تخوم، اورک، نماز میری زندگی تو اس کے گرد چلتی ہے۔ میں نائن اس سے آگے کی باتیں کیا جاناؤں۔“ عزہ نے ہمدانی سے ماسی کی گفتگو سنتے ہوئے چچی جان کی نظروں کا تقاب کیا جو بار بار مارہ کر کے لڑکی سے ٹکرانی تھیں اور ہر بار جان کے ایک چہرے پر پریشانی کے آثار پہلے سے زیادہ ہوتے تھے۔

”مسائل اور پریشانی، تیار، عکوبت کی طرح میری زندگی کو جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ حکومت مستقل اور یہ کھانا کرنا چاہیے، نہ بٹانے نہ ہٹانے، دگر اسے گرتا ہے۔“ انہوں نے عزہ سے کہا۔

”بہت جانے گا تو کھینچ کر لیں۔“ عزہ نے انہیں روک دیا کہ دینے کی کوشش کی، اسے اپنی بات کا قطعی یقین نہیں تھا۔

”کاش میں ایک بیٹی ہوتی، ایسی ہر تلی کو کچ مان لیتا۔“ انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں اور سب اس پر چھوڑ دیں۔“ عزہ نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

شام کا اندیرا ابھیل رہا تھا، سورج مکمل تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ وہ جن کے ایک طرف کئی بیڑیاں چڑھ کر چھت پر آگیا۔ لوگ اپنے اپنے کاونوں سے فارغ ہو کر مخصوص راستوں پر چلتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے ایک اور دن کا اختتام ہو رہا تھا۔ ارد گرد کے گھروں کے محضوں سے چٹھوں میں جلتی آگ کی لوٹن آ رہی تھی۔ وہ بچپن سے اس موسم اور اس منظر سے مانوس تھا۔ اسے اس وقت بھی یہ منظر اگلا تھا جب وہ اپنے والدین اور بہن، بھائیوں کے ساتھ اکی کر رہتا تھا۔ اس وقت بھی جب وہ یہاں سے چلے جانے کے بعد چھٹیوں میں ملتا تھا۔

میں یہاں آتا تھا اور اب بھی جب وہ بڑھ چکا کہ اپنے کام سے لگنے کی جگہ دوں میں تھا اور اسے بھی بھاری یہاں آنے کا موقع ملتا تھا۔ وہ اس منظر کو دیکھتا اور اس میں ایک نادیہ ناسبت پاتا تھا۔ یہاں آکر اسے ہمیشہ لگتا جیسے وہ اپنے فریم سے بچھڑا دوبارہ فریم میں جڑ گیا ہو، وہ خود کو اس ماحول سے متعلق اور اس محسوس میں قید محسوس کرتا تھا۔ اس نے ایک ایک کی سانس اس مانوس فضا میں اور اس وقت اسے اسی گھر کے ایک کمرے میں موجود مسئلہ کا خیال آیا۔ اس کے دل میں ایک عجیب سے دکھ کی جھین اٹھنے لگی۔

”کیسی عجیب ضد باندھ لی ہے تم نے۔“ اس نے تصور میں آئے مارہ کے چہرے کو مخاطب کیا۔

”ایک ناول انسان بتا رہا ہے کہ بھرتی خد کے نتائج عواقب پر۔“ اسے محسوس ہوا جیسے اور بہت سی وجوہات کے علاوہ وہ مارہ کے لیے بھی یہاں آتا تھا۔ اسے چچی جان کے خرم، دھیمے، ہر سکون حراج کی چھاؤں میں پرورش پائی ہوئی ہے دھڑک، ضدی، سن سوچی، بے پروا ہر سن کی وہ لڑکی بہت عزیز تھی۔ وہ اس کے مزاج کی تیزی کے ہر مظاہرے کی دانستہ کٹ کرتا اور اس لیے بظاہر ان دونوں کی آپس میں فنی نہیں تھی مگر یہ صرف وہ جانتا تھا کہ وہ لڑکی اسے کتنی عزیز تھی اور اس بات کا یقین بھی کہ اسے کھائے جا رہا تھا کہ اس کے دل کی یہ خوش تھی کہ بظاہر وہ اس سے کتنا عزیز لڑکی اور خاتون کھاتی دل میں وہ بھی اسے اتنا ہی عزیز جانتی تھی ناک ہوئی۔

”وہ کہتی ہے کہ اس نے نادر سے سی شادی کرنی ہے، دینا اور کھری اور ہوجاے وہ اپنی بات سے نہیں بچے گی۔“ یہ خبر مل ہی چکی جان نے اسے فون پر دی تھی وہ خوش تھی کہ ذمہ نہیں سکا رہا تھا۔

”تم سی آؤ، اس کو کچھ سمجھاؤ۔“ چچی جان کہہ رہی تھیں۔ ”تم جانتے ہو اس کی ضد کی ہوئی ہے؟“ ”ہاں جی، میں جانتا ہوں۔“ وہ رسالے سے

بولاً۔ ”مضاتی کی دکان پر بھی رنگ برنگی مضاتی دیکھ کر لپکا جاتے والے بچے کی ضد۔“ وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔ ”اے بچے کو اس سے زیادہ لپکالے والی چیز دیکھا دو، وہ وہی کو بھول کر اس کے لیے پھیلے گئے گا، مارے چچی جان آپ اسے جانتے ہیں۔“ چچی بھی اسی پریشان ہو رہی ہیں۔

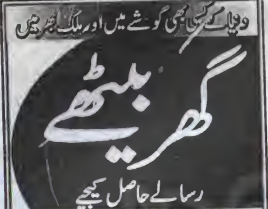
”تم سمجھ نہیں رہے ہو، اس لیے اتنا آسان لے رہے ہو۔“ چچی جان کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ ”اس کے تیز خطرناک ہیں اور اس کی یہ ضد میرے لیے ذہن دہم کرنے کا مقام ہے۔“

”اچھا آپ پریشان نہ ہوں، میں آتا ہوں۔“ عزہ کو اس وقت بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ مارہ اس خد کے پیچھے بھوک بڑتاں تک کیے بیٹھی ہو کیونکہ وہ جتنی بھی ضدی تھی، بھوک کی بہت جگہ تھی۔ چچی جان کبھی کبھار اس کی لیے جاسد سے جیڑ کر اسے کھانا دینا بند کر دیتی تھیں اور جھانڈا پر فوراً اختیار ڈال دیتی تھی مگر یہ ضد کی سخت تھی جسے منوانے کے لیے وہ پیٹ کی دوہائی تک کی بھی پروا نہیں کر رہی تھی۔ عزہ نے یہاں آکر گھر کی فضا پر چھائی سوگوری کو فوراً ہی محسوس کر لیا تھا۔ چچی جان کی آنکھیں سرخ اور بھاری ہو رہی تھیں۔ اسے صورت حال کے کچھ سمجھ نہ ہوئے گا احساس تھا کہ وہ مارہ کا کھانا خد اور باغیانہ لہجہ جب تک اس نے وہ محسوس نہیں کر لیا تھا، اسے صورت حال کی کتنی کاتھین نہیں آتا تھا۔

”سب کچھ کر رہی تھی مجھے علم ہے، تم جلدی اپنی یہ احتقان خد چھوڑ دو۔“ اس نے ایک بار پھر تصور میں مارہ کو مخاطب کیا اور سوزی کی شدت زیادہ محسوس ہونے پر بچنے لگا۔

☆☆☆

”تم نادر کے متعلق شاید کچھ بھی ٹھیک طرح سے نہیں جانتیں۔“ اگلے دن جب وہ مارہ سے ملا تو اس نے اسے احساس دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہاری غلطی ہے، میں اسے اتنا جانتی



گھر بیٹھے رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ چپس ڈائجسٹ

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ

ایک رسالے کے لیے 600 روپے

ایک رسالے کے لیے 7,000 روپے

ایک رسالے کے لیے 6,000 روپے

ایک رسالے کے لیے 6,000 روپے

ایک رسالے کے لیے 6,000 روپے

ایک رسالے کے لیے 6,000 روپے

ایک رسالے کے لیے 6,000 روپے

ایک رسالے کے لیے 6,000 روپے

ایک رسالے کے لیے 6,000 روپے

ایک رسالے کے لیے 6,000 روپے

ایک رسالے کے لیے 6,000 روپے

ایک رسالے کے لیے 6,000 روپے



ہوں، جتنا شاید خود کو بھی نہیں جانتی۔“ اس کے لہجے میں اپنی بات پر یقین بول رہا تھا۔

”اوہ..... اچھا۔“ حزمہ مسکرایا۔ ”مگر یہ بات یوں کر لیتے ہیں کہ تم شاید خود کو اتنا ٹھیک سے نہیں جانتیں اس لیے اپنے فیصلے کے نتائج پر غور نہیں کر پائی ہو۔“

”ادھر۔“ وہ مسخرانہ انداز میں بولی۔ ”میں نادر کو جتنا جانتی ہوں، اس سے بھی زیادہ جان لینا چاہتی ہوں، وہ بھی اس طرح خود کو بھول جاؤں۔“ حزمہ نے اس کی بات سن کر اور اس کے کانوں نے جو سنا اس پر یقین کرنے کے لیے دھیان کی اور طرف مبذول کرنا چاہا۔ اس کے سامنے جن میں گئے موسیٰ پھولوں کے پودے تھے جن پر اڑتی ایک قلی اپنے خوشنار پر چھلے آدھر سے آدھر حرکت کر رہی تھی۔

”نہ جہاڑی تو تم نہ جہاڑی برادری کا، ذات اس کی ان میں جانی، تم کسی حساب میں اسے اتنا جان لینا چاہتی ہو کہ خود کو بھول جاؤ۔“ چچی جان جو حق سے خاموش بیٹھی تھیں بالآخر خاموش نہ رہے ہوئے بولیں۔

”آپ کو ذات کا تو تم کا مان لے ڈوے گا۔“ مائزہ نے گستاخانہ لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ کو آج تک ان اونچی ذات والوں نے۔“ وہ کھاجانے والی نظروں سے اونچی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”نادرہ گناہ کی سزا عقیق۔“ اس کی آواز اذہرید بلند ہوئی۔ ”اس کے بجائے آپ بھی اگر نادرہ نظر ڈالیں تو کوئی نہ کوئی نہر یاں تمھیں آپ کو بھی مل جائے اس قید و کتاب سے نجات دلانے کے لیے۔“

”میرے بارے میں خیال آرائی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے نہیں۔“ چچی جان اس کی بات پر فحشے بولیں۔

”میں آپ کے قاعدے اور قانون نہیں جانتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ زندگی مجھے صرف ایک بار ملے گی۔“

”لی ہے اور اس زندگی میں مجھے وہی کرنا چاہیے جو میرا دل چاہتا ہے۔“

”لیکن میں تمھیں اس من مانی کی اجازت نہیں دے سکتی۔“ چچی جان نے اب کے ذرا مضبوط اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”تمھاری یہ حرکت میری برسوں کی ریاضت کو خاک میں ملا دے گی، میں نے جس طرح کانٹوں پر چل کر کمزرتی کی چادر سر پر تائی ہے اس تم کو مجھ سے ہر اس کا تصور رکھنی ہو مگر میں اس کا احترام کسی تم سے نہیں مانگتی اگر مجھے یہیہ دتا کہ تم اپنے لیے جو فیصلہ کر رہی ہو وہ تمھارے حق میں بہتر ہے۔“

”آپ کو کیا پتا کہ میرے حق میں کیا اچھا ہے اور کیا برا۔“ مائزہ درشت لہجے میں بولی۔ ”آپ یہ فیصلہ کیسے کر سکتی ہیں جبکہ آپ کو عمر بھر یہ نہیں چلا کہ خود آپ کے حق میں کیا اچھا ہے۔“

حزمہ نے حیرت سے مائزہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں شعلہ دار تھیں۔ ”مجھے زندگی نہ وہ بھی سکھا دی جو کیسے کی خواہش میں نہ بھی نہیں کی تھی۔ میں بھی یہ نہیں چاہوں گی کہ تم بھی حالات کی مار کھا کر وہ دب سیکو جو کیسے کی خواہش میں نہیں ہے۔“ چچی جان نے اب کے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ کی کسی بات سے بھی میں متاثر نہیں ہوتی۔“ مائزہ بدستور اسی لہجے میں بات کر رہی تھی۔ ”آپ کے لفظ، آپ کا لہجہ، آپ کی باتیں میری پرائی ہو چکیں بار بار میری جانے والی اور یہ ساری باتیں اگر ہماری زندگی بدلنے یا بہتر کرنے کے لیے بدکار ہوئیں تو بھی ان کو سنا جاسکتا تھا، دھیان دیا جاسکتا تھا مگر یہ محض باتیں ہیں، بے حس لفظ، بے تاثر جملے، ناقابل عمل باتیں جو تک نہیں لگتے والے اپنی کتابوں میں بس لکھ دیے ہیں۔ اس کی نظر پر نظر آنے والے بس بول دیتے ہیں، ان سے کنوئی کی زندگیاں بہتر ہوتی ہیں، کون کتاب پر سکون رہتا ہے ان پر کل کر کے بھی نظر

نہیں آیا۔“ وہ تھیک اڑانے کے سے انداز میں بول رہی تھی۔

حزمہ نے اس کے تھکے لاس، بکھرے بالوں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کو دیکھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے صوف پر کب تک مزید لی رہ سکتی ہے۔

”تم جو بھی کہو، ملو، ملو، جتنے تیر بربسا نا چاہتی ہو برسوں، میں تمھاری شادی نادر سے ہرگز نہیں کروں گی۔“ چچی جان نے اسے انداز میں کہا۔ ”تو آپ نہ کریں، میں خود کروں گی۔“ مائزہ پر اس بات کا ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

”میں تمھیں یہاں سے باہر نکلے دوں گی تو کر دوں گی، چچی جان شاید اس کی یہ دیکھی پہلے ہی سن چکی تھیں۔

”میں یہاں سے بھاگ جاؤں گی، وہ کچھ لیجے گا۔“ وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی گی۔ ”آپ کی کیڈز بمبکیاں میرا رستہ نہیں روک سکتیں۔“

مائزہ کی اس بات نے حزمہ کو بالکل ہی ششدر کر دیا تھا۔ وہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”اس شخص کے لیے یہ کمرے بھی بھاگ سکتی ہے۔“ اس نے سوچا۔ ”جو اتنے ترسو پر اتنے اثر کیا اسے دوکا جاسکتا ہے۔“ اس کا دل ایک دھڑکن چھوڑ گیا۔

”یہ خاندانی عزت اور وقار، یہ اعلیٰ اخلاقیات اور روایات کے ڈھونگ، یہ ذات برادری، حسب نسب، میرے اور نادر کے درمیان جو بھی چیز ہے اس میں اس برھوک دوں گی، کان کھول کر سن میں، آپ مجھے ایسا کرنے سے اب کسی طور نہیں روک سکتیں۔“ حزمہ کو لگا اپنی درشت باتیں کان میں پڑنے پر جیسے اس کی آنکھوں میں نمی سی آئی تھی اس نے نظر اٹھا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا جو اپنی تمام تر خاموشی کے باوجود اسے بے حد عزیز تھی۔ اس کا چہرہ حزمہ کی آنکھوں کی نمی کے سامنے جھلما رہا تھا۔

”لو آج میں تم سے دست بردار ہوں۔“ اس نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا۔ ”پتا نہیں کب اور کیوں تمھیں دل میں بسا بیٹھا تھا۔ شاید اس غلط فہمی میں کہ تم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں یا پھر شاید اس لیے کہ زندگی کا ہر چیز سے تعلق ہم اپنے نظریات پر کھلے دل سے جا دلایا کر لیا کرتے تھے اور اس وقت آپس میں لینے کے بعد غور کرنے پر پتا چلا تھا کہ ہمارے نظریات تو خالص ملے جلتے ہیں۔ ہم کس ساستاندن کے بارے میں کیا سوچتی ہو، کس ادیب کی کون سی کہانی، کس گلوکار کون سا گانا، کون سی خوشبو، کون سا پھول، کون سی فلم، کون سا شاعر، کون سا لفظ، کون سی تصویر..... ذمہ ساری بحث کے بعد ہم اپنے اپنے تئیں پوائنٹ اسکور کر کے خود کو فراع قرار دیتے تھے اور بعد میں پتا چلتا تھا کہ نظریات تو ایک سے ہیں۔ اسی ذاتی ہم آہنگی نے تو میرے دل کو خوش فہم بنا کر رکھا کہ تم کسی میرے بارے میں یو پی سوچتی ہو۔“ اس نے نظراٹھا کر ایک بار پھر مائزہ کو دیکھا۔ ”وہ مجھی نادر میاں۔“ پھر اس نے کسی اور کو دل میں مخاطب کیا۔ ”نہ جانے تم کون ہو اور کیسے ہو مگر جو بھی ہو خوش قسمت ہو کہ اس لڑکی کے دل میں بے نیصے ہو۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ بحث ختم کی جائے۔“ اس نے چچی جان کو بل دینے کے مع کر کہا۔ ”تم جیسا چاہتی ہو، ویسا ہی ہو، پھر اس نے مائزہ کی طرف دیکھا۔ اس کی بات سے ڈوئل میں مائزہ کا چہرہ ایک دردن سا ہو گیا، اس کے ہونٹ کچھ کھینکے کھینکے گھبرائے بغیر بند ہو گئے۔

چچی جان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، جس کو انھوں نے اپنا دیکھ لیا تھا اس نے ساری بحث سمیٹ دی تھی۔ اس کے پاس ولائیل ختم ہو گئے تھے یا اس نے بغیر جرح کے ہی بار مان لی تھی۔

”تم اس سے کہو، وہ آکر کچی جان سے مل لے۔“ حزمہ نے مائزہ سے کہا۔ ”تمھارا کچھ چچی جان

ہی کریں گی، جہیں کہیں بھاگ کر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ اس کی آواز ان کے کانوں میں پڑی تھی اور ان کا ذہن ماؤف ہوا جاتا تھا۔

☆☆☆

”میرا دل نہیں چاہ رہا کہ جس عزت و ناموس کی خاطر آپ نے اسنے سال کی تقریب کو ترک کر دیا ہے وہ بچے کے گلے میں خاک ہو جاتے۔“ اسی رات مزہزہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ”جو کام ایک بڑا نقصان ہونے کے بعد بھی ہونا ہی ہے، اسے اس بڑے نقصان کے بغیر کیوں نہ ہونے دیا جائے۔“

”میرا خیال تھا کہ تمہیں اس عرش گھوڑے کو لگام دینا آتی ہوگی۔“ وہ دکھ سے ہنسنے لگی اور آواز میں بولی تھیں۔ ”تم تو اس کے مزاج سے آشنا ہو تم سے میں نے بہت امید داشت کر رکھی تھی۔“

”یہ مزاج آشنا کیا ہی تو نتیجہ ہے۔“ وہ تنبیہ کی سولے۔ ”وہ صرف کہہ ہی نہیں رہی تھی، اس بار اس نے کر دکھانا تھا، وہ اپنے کچھ اور عزم و محسوس نہیں کیا شاید۔“ کچھ جڑوں سے گزرنے بغیر شاید ہی کے نتائج و عواقب کا اندازہ نہ ٹھیک سے نہیں ہو جاتا لفظ سمجھانے کے لیے کافی ہوتے ہیں اور کڑی تنبیہ کے ساتھ نہ نظر نہیں آتا۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”وہ پرفٹین سے کراس لے اپنے لیے بہترین انتخاب کیا ہے اور اس جیسے لوگ جب پرفٹین ہوں تو پھر انہیں سمجھنا فضول ثابت ہوتا ہے۔“

”مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ وہ بے چین ہو کر بولی تھیں۔ ”میں کوئی سن مرض کا کھانا ملاں، مضمون، کاغذ، اسکول کا معاملہ نہیں ہے، جو اس کی ضد پر اس کی مان لی جائے۔ وہ ذات اور تو کم کے سچ، ان کا پس منظر سرے سے غیر موجود خیرات کھانے والے لوگ۔“ انہوں نے رک کر مزہزہ کی طرف دیکھا ان کی آنکھیں حورم ہو رہی تھیں۔

”میں کوئی بڑا بول نہیں ہوں رہی۔“ مزہزہ کے

چہرے پر متذبذب کے آثار دیکھتے ہوئے وہ بولیں۔ ”مگر یہ چیزیں ممتی رکھتی ہیں۔“ انہوں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر یہ کسی محبت ہے کہ جن کے ساتھ ایک عمر گزاری، جنہوں نے نوالہ توڑنے، انہی چکر پاؤں پاؤں چلانے، ایک ایک حرف سے لے کر لفظوں تک بڑھنا سکھانے کی مشقت سہی، جو کتنی ترش، پریشانی، معصیت کی سامناں بنے رہے، جنہوں نے گوئی کر دی اور محبت کی زری سے آشنا کیا، ان کی محبت پر ایک دم انہیں شخص کی محبت حادی ہوگی۔ بے غرض، بے ریا، مرنجان سرخ، چھوٹے بڑے کی محبت میں جان لٹا دینے والے وفا پرست باپ کی بیٹی اتنی بے مروت، خود غرض اور سرکش۔“ وہ سانس لینے کو روکیں۔ ”مجھے علم ہوتا تو اس کے پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ کر مار دویتی۔“ انہوں نے مزہزہ کی طرف دیکھا جواب نہ دیتے بات نہ رہا تھا۔

”میرا کہنا اب بھی یہی ہے کہ ان سب باتوں کا کچھ فائدہ نہیں، وہ مگر سے بھاگ جائے یا اپنی جان لے لے، دونوں صورتوں میں ہی ایک بڑا نقصان ہمارا ہوگا۔ اس بڑے نقصان سے بچنے کی ایک ہی تدبیر ہے کہ اسے مانی کر لینے دیں۔“

”کیسے بھاگ جائے گی۔“ وہ ڈپٹ کر بولیں۔ ”تاہم کٹ دوں گی اس کی، مجھ ہی ملاؤ قاضی کو، میں اس کا نکاح اتنے تم سے کروانی ہوں۔“ پھر کیسے بھاگے گی۔

”تمہیں۔“ مزہزہ نے تیزی سے کہا۔ ”میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔“

”تم۔۔۔۔۔۔“ وہ ششدر رہ گئیں۔ ”جب کہ میرا خیال تھا۔۔۔۔۔۔“ وہ بے چینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”خیال کا کیا ہے، غلط بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ ان سے آنکھیں سچ کر بولا۔ ”اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہوں تو یقیناً جائیداد وہی ہے

کہ ماؤزہ کا نکاح اس لڑکے سے کر کے خود اپنے انہوں اس کو رخصت کر دیا جائے۔“

”کیا ایسا کرنے سے ہمارے خاندان کی عزت بچ جائے گی، برادری اور خاندان والے ہمیں بخش دیں گے، کیا کیا باتیں نہ بتائی جائیں گی، میری تربیت کو غلط اور میری ذات کو نشانہ بنانے والی کوئی زبان ہوگی جو خاموش رہے گی؟“

”اس کی آپ فکر نہ کریں، میں سنیا لوں گا۔“ مزہزہ کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اسے اپنی اس بات کا یقین تھا یا وہ محض چچی جان کی لکڑی کی بات کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

چچی جان اس گفتگو کے بعد بالکل خاموش ہوئی تھیں۔ ماؤزہ نے اپنی اپنی مریم کے دریلے نادر کو چانچا منجھوا دیا تھا کہ وہ آکر کھرہ والوں سے ملے۔ چچی جان نے نادر سے ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مزہزہ سے یہ فیصلہ کیا ہے اور اس سلسلے میں اب کچھ وہی کرے گا۔ ان کے اسی سخت رویے کا نتیجہ تھا کہ جس سپر ہارڈ اس ملاقات کو دھڑا آیا اس روز صبح سے کھرہ میں صفائی ہوئی نہ آنے والے کے لیے کسی چائے پانی کا اجتماع نہ کیا گیا، چچی جان سارا دن منہ پر چادر ڈالے محکم میں چچی چلی پانی پریش ہیں۔ ان کا مزاج ایسا ہو رہا تھا کہ کسی کو ان کے ساتھ بات کرنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔ مزہزہ کو جھپٹا رہا تھا کہ وہ اس غیر متوقع صورت حال اور ذمے داری سے کیسے نکلے گا۔

نادر کے آنے کی اطلاع ملنے پر جب وہ بیٹھک کی طرف آتا ماؤزہ کے کمرے کے آگے سے گزرا تو بلو کہ اس کے کوشن اور انوکھ ان پیرس کی جلی جلی خوشبو اس کے منتقون سے ٹکرائی تھی۔ وہ اس کے کمرے کے ادھر کھلے دروازے کے آگے ذرا کی ذرا رکا، اندر سے پڑوسی کی ٹھکنے بات کی آواز کے ساتھ ساتھ ماؤزہ کے ٹھکنے کی بھی آواز آ رہی تھی۔

”آکھیں کیے جھروکوں سے میں نے دیکھا جو

سامنے۔۔۔۔۔۔“ وہ کھنگھار رہی تھی۔ اس کمرے کے سارے ماحول سے جیسے خوشی کی لہر اٹھ رہی کی۔ مزہزہ مزید رکے بغیر لمبے ڈنگ بھرتا آگے نکل گیا۔ اسے لگا اس کا ذہن ٹھیک سے کام نہیں کر رہا تھا۔ ایسا مؤاف ذہن سے اس نے ٹھیک کا باہر نکلنے والا دروازہ کھولا۔ اس کے سامنے چھتیس، ستائیس سالہ دروازہ قد شخص کھڑا تھا۔

”اجھا تو تم ہو، رقیبہ رو سیاہ۔“ اسے اندر بٹھانے کے بعد اس کے سامنے بیٹھے ہوئے اس ماؤف ذہن میں جو بات آئی اس پر مزہزہ کا دل بٹھاتا یا اس میں عجیبی جچیں محسوس ہوئی یہ اسے اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔

”میں پکڑا ایک سپورٹ کرتا ہوں۔“ رقیبہ رو سیاہ نے ہاتھ پٹا تھا۔ ”میں ساتھ کے گاؤں کے رہنے والے ہیں، میرے والد شریف الدین صاحب چوہدری جمید کے ڈیرے پر کام کرتے تھے، اب نہیں کرتے کیونکہ اب ہم بھائی اچھا کارہے ہیں۔“

نادر بتا رہا تھا۔

”میرے کپڑے کی بڑی مولوں والوں کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں، میں اسٹاک میں بھی خاصا مال رکھتا ہوں، میزن ان پر ابھی خاص پابندی ہو جاتی ہے۔“ مزہزہ کاؤف ذہن میں بن رہا تھا۔

”میری چھوٹی بہن عاصمہ ماؤزہ کی کلاس فیلو ہے، میں عاصمہ کو کالج چھوڑنے اور لینے جاتا ہوں، ماؤزہ سے وہیں ملاقات ہوئی۔“ مزہزہ کو نہ جانے کیوں لگا جیسے یہ بات سنانے سے ہونے نادر کے چہرے پر ایک استہزائی سی مسکراہٹ تھی۔

”اس کو میری ہائیت اور میری مسکراہٹ نے بہت متاثر کیا۔“ اب کے وہ کل کر سکر رہا تھا۔

”اور تمہیں ماؤزہ کی کس چیز نے متاثر کیا؟“

مزہزہ نے پوچھنا چاہا مگر اس کا کوئی بھی بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

”ماؤزہ کی پسند یہی کہ جب مجھے بچا ہوا تو میں گڑ

ماہنامہ نیا نیا کتب — اپریل 2012ء — 243



بڑا کر رہ گیا۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ کبہر ہوا تھا۔  
”کیوں.....؟“ غزوہ کو یہ سوال کرتی اپنی آواز بھی کسی پاپاں سے آتی محسوس ہوتی تھی۔

”اس خاندان کا علاقے میں بڑا نام ہے جی اس لیے۔“ اب کے نادر کا لہجہ عجیب سکین سا ہو گیا۔ ”مٹی بی بی جی کے اسکول کے آگے سے گزرتے ہوئے دم مارنے کی مجال نہیں ہوتی تھی مگر ان پر جب تک چوہدری وارث صاحب حیات تھے ہم ان کے مکانوں کو نظر اٹھا کر کچھ کی نہیں سکتے تھے۔“ غزوہ نے اپنا سر جھکا لیا۔

”میں نے مازہ کو یہ بتایا تو وہ ہنس دی۔“ وہ کچھ یاد کرتے ہوئے تیار ہوا تھا۔ ”میں نے کہا مائیکو بی بی..... میں شریف و نثار کا بیٹا ہوں جی آپ کو میرے بارے میں غلط فہمی ہوتی ہے شاید وہ جس کو بولی۔“ ”اس میں غلط فہمی کی کیا بات ہے، دل تو کسی پر بھی آسکتا ہے۔“ غزوہ کا دل ڈوبنے لگا۔

”دوبنے بھی پرانی شان و شوکت کے تو تذکرے ہی باقی ہیں نا..... اب دور اور آگیا ہے، چوہدری وارث صاحب کی زینیں ہمیں تو میرے چاچے نے قیمت لگا لی تھی سب سے پہلے اور جو خریدیں ان کے دام کمرے دیے تھے نیست۔ اور اب تو یہ اونچے مکان ڈھا ڈھائی بھیری ہونے کو ہیں۔“ پراہر ہمارا کا دودرا بڑا پھیل گیا ہے، ہم نے اپنی کوئی شروع کرانی ہوئی ہے، اور جو ملے ہیں سے پار جو ملے جلد کی ہماری ہی ہے، میں بڑے کے کا دیز لے رہا ہوں، جلد ہی ہمارا کاروبار انٹر نیٹ پر چل جائے گا۔“ غزوہ خاموش بیٹھا

ترتی اور غزنی کے پڑاؤ میں رہا تھا۔  
”مجھے تو فخر تھا اور یہ یقینی بھی، پر مازہ کا حوصلہ بلند تھا۔ یہی تھی تم میں کیا کسی ہے نادر، بڑے لکھتے تھے، اپنا کارنامے ہو، خوب کما تے ہو اور سب سے بڑھ کر اسنے دیکھ ہو کہ میرا دل خود بخود تمہاری طرف مچتا ہے۔“ غزوہ نے پچھلی کے عالم میں ہلکا

”تم یہ بتاؤ کہ کیا تم ہمارے نکاح کے لیے تیار ہو؟“ اس نے یہ مشکل اپنی آواز میں اٹھنے والے دل کے اہال پر قابو پاتے ہوئے مضبوط لہجے میں سوال کیا۔  
”بالکل.....“ اس کے مخاطب نے شانے اچکاتے ہوئے یوں جواب دیا جیسے یہ انتہائی معمولی کام تھا جسے اس کا بالیاں ہاتھ بھی سرانجام دے سکتا تھا۔  
”اس کا کیا قصور ہے، جب تم خود اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کام نہیں مٹی ہو؟“ اس نے نادر کے اس انداز پر دل میں اٹھنے ہوئے تو دل کو دباتے ہوئے سوچا۔

”کیا یہ کام تم ایک دو دن میں ہی کر سکتے ہو؟“ اس نے دوسرا سوال نادر سے کیا۔  
”ہاں، چاہیں تو آج ہی۔“ بائیں ہاتھ کا کام دنیا کا سب سے آسان کام تھا۔  
”تم ایسا کرو برسوں، رات آٹھ بجے گواہوں کے ساتھ یہاں آ جانا، نکاح ہو جائے گا۔“ غزوہ نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کرنے کے بعد کہا۔ وہ نے فحشی کے عالم میں پہلو ہلایا۔  
”مازہ یہاں سے ایک جوڑے میں رخصت ہوگی، تم یہاں کسی سامان، روپے یا جائیداد کے کسی کاغذی امیر کے بغیر آنا۔“ غزوہ نے اپنی اس بات کا رد عمل جاننے کے لیے نادر کی طرف دیکھا۔ وہ ایک لمبے کو ساکت ہوا تھا مگر اگلے ہی لمحے اس نے نارمل انداز میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے مگر اس طرح ایک بار یہاں سے رخصت ہونے کے بعد مازہ دوبارہ پھر یہاں قدم نہیں رکھے گی۔“ اس نے اپنے تئیں اپنی شرط پیش کی تھی۔  
”میں یہ بات پہلے ہی تم سے کہنے والا تھا۔“ غزوہ نے ابستہ ہی نارمل انداز میں اسے جواب دیا

”تم.....!“ نادر نے اپنی اٹھا کر غزوہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم کوئی ہو یہ سب طے کرنے والے... لڑائی کہاں ہیں؟“

”تم سوچ سکتے ہو کہ وہ تم سے ملیں گی یا کوئی بات کر دیں گی؟“ غزوہ نے اپنی بوکل آنکھیں اٹھا کر اس سے سوال کیا۔ ”تم اور مازہ جو چاہتے ہو وہ ہونے جا رہے ہیں، ہم دونوں کی کوئی خواہش اس کے سوا نہیں ہے۔“ اس نے اپنی بات کی تائید حاصل کرنے والی نظروں سے اسے دیکھا، جواب میں نادر خاموش رہا تھا۔ ”تو جو تم دونوں چاہتے ہو وہ بغیر کسی تردد کے آسانی سے ہونے جا رہے ہیں کیا یہ کافی نہیں؟“

”اوہ.....!“ وہ ہنسا۔ ”بڑی کم کمر بازی ہے تمہاری۔“ اس نے اپنا ہاتھ ماتھے کے لیے جاکر سلام کرنے کے سے اعزاز میں رکھا۔ ”دیے یہ کام تم نہ کرتے تو بھی ہو جانا تھا۔“

”زحمت سے بچ گئے تم شکر کرو۔“ غزوہ کا لہجہ پہلی بار درشت ہوا۔ کسی بھی دوسری صورت میں پولیس، قحانے، مقدموں، اور خوداری کا سامنا کرتے مگر زور جانی، شادی کا مڑہ جھگڑے رہتے ایک عمرے تک۔

”مازہ ناٹالغ اور فاتر افضل نہیں ہے، جو عدالت اسے اور مجھے کسی لیے مقدمے میں پیش نہی کرے۔“ نادر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اور تمہارے خاندان کے بانی مردوں میں اب وہ دو دم کہاں رہا ہے کہ ہندوئی اٹھائی، چلا تو دور کی بات ہے، اس لیے مجھ پر احسان لا دینے کی کوئی تمنا نہیں۔“ باہر نکلنے سے پہلے وہ کا اور مڑہ غزوہ سے ایک بار پھر مخاطب ہوا۔ ”ہاں یہ ضرور ہے کہ تمہاری بڑم خروادی میں شان کے چناڑے کی ہے مٹی کا گراف ڈرا کم ہو جائے گا۔“ غزوہ نے نادر کے پیچھے بند ہوتے دروازے کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

دراز تند اور ظاہری وجاہت، دو چیزیں سب سے اہم تھیں۔

”تم.....!“ نادر نے اپنی اٹھا کر غزوہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم کوئی ہو یہ سب طے کرنے والے... لڑائی کہاں ہیں؟“

”تم سوچ سکتے ہو کہ وہ تم سے ملیں گی یا کوئی بات کر دیں گی؟“ غزوہ نے اپنی بوکل آنکھیں اٹھا کر اس سے سوال کیا۔

پکھو کا ڈر لگا دینے کا باعث بنی تھیں۔ اسے لگا اس کمرے کے دروازے پر اس کے خاندان کی بزرگ عورتوں کی روسیوں چٹ کر رہی تھیں۔

”ہار پھول، عربی گلاب اور مشک کا کافور منگو الیہا۔“ گچھی جان نے اس سے اس گفتگو کی تفصیل سننے کے بعد جو اس کے اور نادر کے درمیان ہوئی تھی کہا۔ وہ رک کر ان کے چہرے کو دیکھنے لگا، وہ اسے کسی طرح بھی نارمل نہیں آ رہی تھیں۔

”پھل آپ آرام کریں، ہم پھر بات کریں گے۔“ اس نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔  
”پھر تو ناٹالغ نہیں آتے؟“ وہ بڑبڑاتی تھیں اور پھر ان پر وہی خاموشی چھا جی جی جی سے چھائی ہوئی تھی۔

”آپ لیٹ جا لیں، میں مامی ہاجرہ کو آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔“ وہ گھبرا کر اٹھا۔ انہوں نے کسی معمول کی طرح اس کی بات کی تنقید کی اور چہرے پر چادر اڑال کر لیٹ گئیں۔ مامی ہاجرہ کو ان کے پاس بھیج کر محسن میں کمرے اس کی نظر مازہ کے کمرے کی کھڑکی پر پڑی جس سے روشنی چمن کر باہر آ رہی تھی۔

وہ ڈرا آگے بڑھا اور کمرے کے اندر کی صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے میں کیسٹ پیلیئر ان تھا اور بیچوں دی کی اٹھانچ کی آوازوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اہم کام سرانجام دیا جا رہا ہو، وہ دیکھا دیکھ دیے پہلی بار اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا مازہ کے کمرے کا سامان گھرا پڑا تھا اور اس کے بند پر تین فریول بیگز رکھے تھے۔ وہ بھری بیچوں کو ترخیب دے کر بیگز میں رکھنے میں مصروف تھی۔ اس کا کیسٹ پیلیئر آہستہ آواز میں کیٹ بجا رہا تھا۔

پائل میں گیت میں چم چم چم کے ٹولا کھیلنے لگی کوری ٹم ٹم کے مازہ خود بھی زیر لب یہ گیت گنگنا رہی تھی اس نے ایک شوخ رنگ لباس پہن رکھا تھا اور اس کے

پائل میں گیت میں چم چم چم کے ٹولا کھیلنے لگی کوری ٹم ٹم کے مازہ خود بھی زیر لب یہ گیت گنگنا رہی تھی اس نے ایک شوخ رنگ لباس پہن رکھا تھا اور اس کے

اپریل 2012ء





مجھے لاکر تھی۔ ویسے بھی۔۔۔ اس نے شانے اچکاۓ۔ ”یہ یہاں کسی کے کیا کام آئی گی۔“

”تمہیں ہاں ہے بازہ کہ کچی جان کی حالت کیسی ہے اس وقت؟“ مزہ کو اس کے اس خود غرضانہ اور بے حس رویے پر اب شدید غصہ آنے لگا تھا۔ ”وہ اپنی اس حالت کی خود ڈنٹے دار ہیں۔“ اس نے اسی بے نیازی سے جواب دیا۔ ”ہم دوسروں سے ان کی استطاعت سے بڑی توقعات کیوں لگائیں؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے مزہ کو دیکھا۔ ”مجھے دیکھو، مجھے پتا تھا کہ اسی میری بات بھی نہیں مانیں گی اسی لیے میں نے ان سے ایسی کوئی توقع نہیں لگائی۔“

”بابا! بازہ، تم ہم سب کی توقعات سے زیادہ غلط ثابت ہوئیں۔“ مزہ کی برداشت ختم ہونے لگی اور وہ ایک جگہ سے اٹھ گیا۔ ”واقعی میں دوسروں سے ان کے قدر سے بڑی توقعات نہیں لگانی چاہئیں۔“ وہ تیز قدموں سے چٹنا کرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے ہاتھ نظر ہی کرے سے دوبارہ کیسٹ پیٹری کی آواز آنے لگی۔

☆☆☆

وہ دھوپ چڑھے سے لے کر اس وقت دوپہر تک چھت پچھی کھری چار پانی پر لیٹا تھا۔ فضا میں عجیب سا مسکوت تھا، آسمان صاف اور چھریلے رنگ کا ہو رہا تھا۔ اس نے دیر تک اونچے افق پر تقاریر دیکھ کر سڑکرتے پرندوں کا نظارہ کیا اور پھر آنکھیں تھک جانے پر یونٹھ لی گئیں۔ اس کا ذہن خالی تھا اور دل میں بے چینی تھی۔ اسے اپنے وطن میں کاٹنے چھینے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید اس کا جسم بخار میں جپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اسی لیے اسے انہیں بند کرنا پڑا اور نہ وہ آنکھیں بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آنکھیں بند کرنے پر کئی دن سے اس کے سامنے ایک ہی منظر فلم کی طرح چلنے لگتا تھا۔ قحاح

خواب، گواہ، نکاح، بول، نکاح ہائے پردہ لہا کے کالم میں نادر کا نام اور دلہن کے دستکھوں میں بازہ کے ہاتھ سے لکھا وہ ناموس انیم۔ پھر دلہن کے وکیل کی حیثیت سے کیے گئے اس کے اپنے مختلطہ تاریخی رنگ کے کپڑوں میں ملیبوس وہ ان بھی دلہن، اس کا اعتماد جس کے ساتھ وہ بغیر کسی دعا کے بولے نادر کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی۔ اس نے طلسمی سے بھی ایک نگاہ اس گھر کے آگاہ نہیں ڈالی تھی جس میں کھینچے کوٹے اس گھر بچپن گزارا، اٹھتے بیٹھتے لڑکپن اور جوانی کے سال جتے تھے۔ اس نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی تھی کہ اس کی ماں اس کے رخصت ہوتے وقت منہ پر پڑا ڈاڑھے خاموش پڑی تھی۔ انہوں نے اس کے چلے جانے تک ایک لفظ بھی اس سے نہیں بولا تھا۔

”کیا ہے جی اسے اور خود غرضی کی ایک اسٹیج یہ بھی ہوتی ہے؟“ چھٹی سے کروٹ بدل کر مزہ نے سوچا پھر اس نے آنکھیں کھول کر سورج کی شعاعوں کو براہ راست دیکھنے کی کوشش کی۔ ”کیا میں بزدل ہوں یا مصلحت پسند جو اس کو روک نہ سکا؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ ”بہندوق کے زور پر یا دلائل دے کر کیا اس کو روکا جا سکتا تھا؟“ اسے لگا اس کے پاس اس کے اسے کسی سوال کا جواب نہیں تھا یا شاید وہ ایسے کسی سوال کا جواب دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔

”جو بتا تھا وہ تو گیا، اب ایک دوپہ سے منہ چھپانے کا کیا فائدہ۔“ اسے اس کی سوچوں نے ماسی ہا جہز نے چوکنا ہاتھا۔ ”منہ سے نکلی بات واپس نہیں آسکتی دوسرا کمانوں کا تھیرا۔“ وہ مزہ والی چار پانی کی ادوائی پر بیٹھ کر بولی۔ ”میری رانی کو خیال نہیں نہ کیا کہ پیچھے رہ جانے والے کون سے حال جیوس کے تو کسی بھی اس کی گھر دلی سے نکال دیو۔“ وہ اپنے تئیں مزہ کو دلاسا دے رہی تھی۔

مزہ کو اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنی چپلوں میں پاؤں ڈالنے لگا۔

”پورا پنڈ ادھانوں میں اگھیاں دے کر بیٹھا ہے۔“ ماسی باہر نے خبر سنائی۔ ”چوہدری سلطان کے مکانوں میں پہلے بھی ایسی برات آئی نہ ایسا تماشا ہوا۔“ مزہ نے سر جھکا لیا۔

”پر اگھیاں کب تک ادھانوں میں رہیں گی، ایک آدھ دن میں سب اپنے کام میں لگ جائیں گے، بھول جائیں گے تو پھر تم دونوں کیوں ایک دوپہ سے پیچھے بھرے ہو؟“ میرا جم بخار سے ٹوٹ رہا تھا، میں اس لیے ادھر آ کر لیٹ گیا۔ ”مزہ نہ کہا۔“ ”اس بخار کو اب پنڈے سے ہاں لٹکتے۔“ ماسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”مجھے پتا ہے یہ پوکھ کے چڑنے والا بخار ہے، پنڈالوں جلتا ہے، پر جب یہ باہر نکل جاتا ہے تو یاد نہیں رہتا کہ کبھی چڑھا بھی تھا۔“ ماسی اپنا فلسفہ سنار ہی تھی۔ ”پچی جان کی کیا کرسی؟“ مزہ نے ماسی کی گفتگو کا موضوع بدلنا چاہا۔ ”میری ٹھنڈی چٹنی آپ کے دل کو بھی خند کے بغاصہوں سے لوس دیا ہے وہ تو پچی کی چپ سی ہوگئی۔“ ماسی نے کہا۔

”ماسی مجھے خنتے پیاس لگ رہی ہے۔“ مزہ نے حلق تھکھوک سے زکرتے ہوئے کہا۔ ”بیچے چاہا، کوئی روٹی پانی کرکوسی لوگ، مرنے والے کے ساتھ بھی بھلا کوئی سرتا ہے۔“ ماسی نے تیزی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں آج شام کی گاڑی سے واپس چلا جاؤں گا، ماسی تم چچی جان کا بہت خیال رکھنا۔“ باورچی خانے کی چڑیسی پر بیٹھ کر ایک بک پانی پینے کے بعد اس نے کہا تھا۔ ”اس کو اس حال میں اکیلا چھوڑ جائے گا۔“ ماسی نے اس کی بات پر اپنا بڑیل نکال کر مازعہ شروع کیا جو خاصا طویل تھا وہ بے درجائی سے ستارہ۔ اسے اس جگہ میں وہ چلنے پھرنے، کھانا کھاتے ہوئے، لڑتے،

جھگڑتے، فراق کرتے نظر آ رہی تھی، اس نے سر کو جھک کر اپنی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے والے منظر کو دیکھ کر سے جھٹکا چار پورا چار پائی بے بسی پر سر جھکا لیا۔

☆☆☆

فرین کی کڑکی سے باہر منظر بھاگ رہے تھے۔ وہ ان پر دانستہ نظریں لگائے بیٹھا تھا۔ یہ وہی منظر تھے جن کو ادھر کے اور ادھیں کے سفر کے دوران وہ کئی سالوں سے دیکھ رہا تھا، اس سے پہلے یہاں آتے ہوئے اس پر سرخوشی کا عالم ہوتا تھا اور ادھیں پر چھوٹی چھوٹی کسی مسکرائی یادوں کا ایک خزانہ ساتھ ہوتا تھا۔

”سنو، یہ فون اکھڑ ڈیڑھ جتا ہے، تم سے بات یا تو نہیں سنی یا بولی ہے تو کب جاتی ہے، اس بار تو شیراز سے ٹیک لے کر تار اور ہاں میں کی کوئی کتاب بھی..... ارے گھاسا تم سائنس کی بورنگ کتابیں پڑھنے والوں کو کیا پڑھیں کر پڑھنے میں کیا مزہ آتا ہے، کتابوں کی دکان پر جا کر فیض احمد فیض کی کتاب ماننا، پھیلنے باری طرح فیض احمد کی کتابیں نہ پڑھنے بیٹھ جانا۔“ کچھ عرصے پہلے کی ایک فون کال پر کی باتیں اسے یاد آئیں۔

”تم صحیح بھائی کے ساتھ جا کر فاروق والوں کے پرنٹ لانا میرے لیے لان کے، ستارہ کی لان اس دفعہ اچھی نہیں آئی..... ہاں، ہاں، مہنگی ہے۔“ مجھے پتا ہے ہر گھرت کرو پورے پیسے دلوں کی نہیں مفت میں نہیں تھی۔“ ایک اور فراموش بھری گفتگو۔ ”تاہم میں تم کیسے پڑھنے ہو فونز..... اتنا بورنگ سبکٹ اور پھر اس کو پڑھ کر تم زیادہ سے زیادہ کرو گے کیا، لکچر شپ، اس کے علاوہ اس کا کیا اسکو ہے۔ زندگی کو گزارو م..... زندگی میں گزارنے جارہی ہے گزردا ہو گیا۔“ وہ لفظوں کی برداشت ستارے سامنے نظریں لگائے بیٹھا تھا۔ سر کے ایک منگر یہ پڑی ہے اچھل کر اس کی آنکھ سے اٹھ گیا







فہم تہ کرے کی قواؤں سے چھیڑ  
طبع جس اذیت سے ٹھہرائے کی  
مگر یہ کھڑی بھی گزر جائے گی  
بڑا ہے سے ہو گا بڑا اختلاب  
نہ ہو گی دیر کی نہ ہو گا شب  
نہ ہو گی کل اعضا خراب  
یہاں تک کہ جیتا بھی ہو گا عذاب  
اجل چلی ہی سر پہ منزلہ کی  
مگر یہ کھڑی بھی گزر جائے گی  
مرض موت کا جب اٹھائے گا سر  
دو کہ ہر دے کی کل جاہد کر  
گزر جائے گا کھیل سب سر  
بن آئے کی بنا کر جان چاں  
بڑی کی تیرو مٹا ہے کی  
مگر یہ کھڑی بھی گزر جائے گی  
سر نہ ہو گا نہ پیدا ہوا، تا دیکھ کر

کمرے میں موجود ہر چیز پر دوا داروں سے  
ہجری قلمی کے ذرات بکھرے تھے اور ان کی بو تھی۔  
اس نے سوچنے پر غصے کے ٹیوب لائٹ بھی ملا دی۔ ہر  
چیز جو ان کی نواں رہی تھی۔ کرسی اور میز جس پر بیٹھ کر وہ  
دستی لکھی تھی۔ سنگھار میز جس کے آئینے کے  
طرف اس کے پرانے اس طرح کی تھیں، سنگھار  
پر ہوا بلور اس اور انوکھ ان کی خالی جھیلیاں  
میں تھیں، کتابوں کی حلیف جس میں موجود کافی  
کتابیں شاید ہ ساتھ لے لی تھی، کچھ کتابیں تریب  
سے تھیں بھی۔ حذرہ کچھ دیگر سات کھڑا ان باتوں  
جو دل کو دیکھنا ہر اس نے آگے بڑھ کر کھڑک پر مڑی  
درازا کھولی، ٹوٹی چوڑیوں کے کاغذ، پاپ اسکلن کے  
خالی پتے، چند رومال، ہر کمال کی پرانی ڈیوا اور کیریم کی  
خالی بیسی کے درمیان تھیں جن پر اسکی میز پر بیسی  
تھیں وہ ہزار سال سے رہ گئی تھی۔ وہ ان باتوں کو  
دیکھنے کے ساتھ کھول جانے لگی تھی؟ حذرہ حیران ہوا۔

”سات پٹھ مطلب ہے کہ دلاور اوسر کے لوگ۔“ وہ وسالت کرتی تو وہ س دیتا۔ یہاں آنے کے ایک دو یا بعد اس نے لاہوری طور پر گروش کر شروں گردی حتیٰ کہ وہ اس گھریں میں ہر سامان کرے گا جو چنگی کھانے کی زندگی کی طرف واپس لائے۔ اس نے اپنے چنگی خواہ پر گھر کی چند چروسیں کر دیاں اور اس کے بعد رنگ روغن بنا کر دیا۔ مریضوں کے ڈوے اور بچوں کے جگرے لاکر رکھے، جن کی کیا ریاں سن موی پھولوں اور پھولوں کے بننے والوں نے۔ گھر میں روغن کی آمد ہوئی تھی۔ گاؤں کے لوگوں نے اس کی سیل ملاقات ہوئی تو دروازے پر گھر بھی گئے۔ گھر پر تھوڑا

”دیکھ لیتا یہ بچے سائنس میں رزلٹ نہیں دیں گے، تم ان کو مست رکھتے ہو۔“ وہ کہتے۔

اس نے دراز میں سے ان تینوں کو اٹھا لیا۔ شفاف پلاسٹک کے ڈبے میں رکھا سرخ مزاری کا چھوٹا سا زول، پارکر کے ڈبے میں بیک چنر اور بال پوائنٹ اور ایک چھوٹے سے تار میں جڑا ہوا کلاک جو ابھی تک اپنی اصلی پینٹنگ میں بند تھا۔ یہ تین چیزیں اس نے اپنے مرحوم ماموں سے فرمائش کر کے منگوائی تھیں اور اسے بے حد عزیز تھیں۔

”دجلہ نہ وہ انہیں یہاں کیوں چھوڑ گئی؟“ حمزہ نے بلا ارادہ ان تینوں کی پینٹنگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا۔ ”ایا پھر شاید وہ انہیں بھول گئی؟“ اسے خیال آیا۔

”وہ ان چیزوں سے کہیں زیادہ جتنی انسانوں کو رادھری بھول گئی تو یہ تو بے جان چیزیں ہیں۔“ اس کے دل میں کہا۔

”ان تین خریول بیگز میں عزیز نہیں ضروری چیزیں ہوں گی۔“ اس نے سوچا اور سگار میز کی دراز بند کر کے اس کے تالے میں لٹکی چابی نکال کر اسے بند کرنے کے بعد وہ چابی اپنی جیب میں ڈال لی۔

وہ کراس نے بہت خیال سے ٹھیک کرنے کے بعد دوبارہ بند کر دیا تھا۔ چچی جان اس کی یہ ساری مصروفیت خاموشی سے دیکھ رہی تھیں کہ انہوں نے اسے کیا نیا نہ خوشی کا اظہار۔

☆☆☆

اسے گاؤں آئے اور چچی جان کے ساتھ رہتے سات مہینے گزر گئے، وہ گاؤں کے ماحول میں رچ بس گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ استاد ہونے کی وجہ سے اس کی عزت کرتے تھے اور اس کے یہاں رہنے کی وجہ سے ماہر کے سلسلے میں ہونے والی پیگمیاں بھی بند ہو گئیں۔ اس نے اٹھن مزار سے چچی جان کی کچا رہنے والی زمین کا ٹکڑا لے کر دیا تھا، مگر وہ چچی جان کے گزراؤ کے لیے آمدنی کا بندوبست ہو گیا تھا۔ باقی اخراجات خود اس نے اٹھا رکھے تھے۔ شام کو

گاؤں کے کچھ دوستوں کے اصرار پر میزگر کے لڑکوں کو ٹیوشن بھی پڑھا دیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے دل کی خلش شے کی کسی اور ذہن سکون پذیر ہونے لگا تھا۔

مگر وہ ایک مختلف دن تھا جب چچی جان کے نہ سمجھ میں آئے وہ اشاروں کی زبان کی مترجم ماسی باجرہ نے اس سے کہا تھا کہ چچی جان چاہتی تھیں وہ شادی کر لے۔

”نہیں ماسی، شادی کا ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے میرا۔“ اس نے دلوک جواب دیا تھا۔

”یہ میری خواہش ہے۔“ جواب میں چچی جان نے اشارہ کیا تھا۔ ان کے اشارے میں ایسا اعتقاد تھا جیسے انہیں یقین ہو کہ وہ ان کی بات ٹال نہیں سکتا۔ ”تمہاری بات میں جی سے بات ہوئی کسی بیشی آپا کی میرے ذریعے نہیں گئی پر۔“ ماسی باجرہ نے بتایا۔ ”وہ ابھی نہیں ہم اللہ کر دیاں جا رہا ہے بات بچی کرو۔“

”مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ بدکا تھا۔

”کیوں، اس میں کون سی غلط بات ہے؟“ ماسی باجرہ نے پوچھا۔

”میرا ذہن، میرا دل نہیں مانتا۔“ وہ اختیار پر لفظ اس کے منہ سے نکلے۔ اس نے گھبرا کر چچی جان کی طرف دیکھا جو اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ”میرا مطلب ہے میں نے اس کے بارے میں ابھی سوچا بھی نہیں۔“ وہ بھلا یا۔

”میں جانتی ہوں کیوں نہیں سوچا۔“ چچی جان کی آنکھیں اسے ابھی بھولی محسوس ہوئیں۔ ”مگر اس طرح زندگی کیسے نہیں گزرتی۔“ ان کے اشارے کو ماسی باجرہ نے ترجمہ کیا۔ وہ گھبرا کر وہاں سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

”مجھے نہیں لگتا کہ میں بھی شادی کر سکتا ہوں۔“ چند دن بعد ماں کے فون پر ان کے ابھی اسی اصرار کے

جواب میں اس نے کہا تھا۔

”اللہ کے فرمان کی نافرمانی ہے یہ تو۔“ انہوں نے ایک اور کٹر سوچا دیا۔ ”کیلی ذات صرف اللہ پاک کی ہے، بندوں کے اس نے جوڑے پیدا کیے ہیں۔۔۔۔۔ اکیلا بندہ نہیں چچا۔“ وہ بولیں۔

”ٹھیک ہے۔ مگر میرا ذہن ابھی اس طرف سوچنے کو مائل نہیں ہوتا۔“ اس نے لا جواب ہو کر کہا۔ ”ذہن کو اس طرف لا، بیشی آپا کے گھر میں روتی ہو جائے گی، وہ روتی تو کس سے، اس کے دل کانگنے کا سامان کر۔“ ماں دھمکے لہجے میں اس پر جذباتی وار کر رہی تھیں۔

”کس سے کروں شادی؟“ اس نے پوچھا۔

”بتائیں کوئی بے آپ کی نظر میں۔“ ”انسان نیت کر لے تو جب ہزارین جاتے ہیں، تو نیت تو کر۔“ انہوں نے رساں سے جواب دیا، وہ خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

”بیشی آپا نے چوہدری ذوالفقار کی لڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا آج۔“ اس کے چند ہی دن بعد ماسی باجرہ نے خوشی سے لڑکھائی آواز میں اسے بتایا۔

”وہ کون ہے چوہدری ذوالفقار؟“ حمزہ نے نظر اٹھا کر ماسی کی طرف دیکھا۔

”وہ نی نوں پنڈ والا چوہدری، کلثوم کا ماما۔“

اسی نے جو تعارف کر دیا وہ حمزہ کے لیے ابھی تھا۔ ”اسی کی بیٹی ہے آمنہ، بڑی سوتی اور بڑی عقلمند والی۔“ ماسی نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد کہا۔

”اچھا سمجھا۔؟“ اس نے پوچھا۔

”سوئے اور عقلمند والے لوگوں کو اپنے جیسے ساتھ ہی جتے ہیں، ابھی ماسی تو یہ دونوں ہی بنیاں نہیں ہیں۔“ حمزہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کیا کیا ہے باؤ، وہ تو ہم اللہ کر کے رشتہ دین کے۔“ ماسی نے جھٹ بٹا دیا۔ ”جب دینداروں کے لڑکے کے ساتھ چوہدریوں کی لڑکی بس سکتی ہے تو سب رانی خوش رہ سکتے ہیں۔“ ماسی نے اپنا فلسفہ پیش کیا۔

”بس بھی کی، وہ تو بھی گئی۔“ حمزہ دل چاہا کہے۔ ”یہی کہ پلٹ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔“ اس کے دل میں عجیب سا بوجھ لگا رہا تھا۔

”ماسی تو چچی جان سے کہہ دیتا، میں ہمیشہ کی طرح ان کی خوشی کے آگے سر نہ کرنا ہوں۔“ حمزہ نے کس احساس سے غلوب ہو کر بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”کیا کرتا ہوں؟“ ماسی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”مطلب میں ان کی خوشی میں راضی ہوں۔“ اس نے وضاحت کی اور ماسی چشم زدن میں وہاں سے بھٹ ہوئی، ماسی کے دل کی خوشی کا عالم وہ اس کے چہرے پر دیکھ کر سمجھتا تھا۔ اس نے نظریں گلاب کی اس ماہرہ رنگ لٹکس جو صحن کی بیرونی دیوار کے ساتھ لکڑی ہوئی تھی۔

”کیا تم بھی کیا یاد لگی کہ تمہارے چلے جانے کے احساس نے میری زندگی اور میرے دل میں کیا کیا دروازہ کھلیں، لکھا کیا مہاجر بدلا ہے میرے مزاج کا؟“ اس نے ماہرہ کے کمرے کی صحن میں گلے والی کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

”میں نے ہمیشہ کھڑکی کی کچھ ایسا کرنا جو تمہارے لیے ہے مگر اس کا پتہ میرے مگر تمہارے چہرے پر پھر بھی سکرا نہیں دیکھتا میرے قیاس میں نہ تھا، یہ کسی اور کا مقصود تھا مگر یہ جواب میں کر رہا ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے۔“ پھر اس نے



☆☆☆

پھر وہ آہانی مکان رنگ رنگ برنگ برتی نقوشوں سے  
منور ہوا، ہار پھول خوشبوؤں سے بھی سجھا، گلابی بیانی  
برات لے کر وہ چوہدری ذوالفقار کی بیٹی رخصت  
کروانے پہنچا اور آہانی مکان میں اس کے کمرے  
میں خوشبوؤں سے مہکتی، رنگوں میں کمی و کثرت کا اضافہ  
ہو گیا۔ ایک طغیانی جیسی انسان سے عمر بھر کا تعلق بن  
گیا۔ اس رات اس کے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے  
اسے لگا جیسے اس کے قدم اُڑھ کر ہوتے ہیں۔ وہوں۔  
”یہ کیسی خیاوت والی بات ہے، کدلم میں کوئی  
اور بسا ہوا در جسم کی اور سے تعلق باندھ لے۔“ وہ  
اپنے کمرے سے باہر برآمدے کے ستون سے لگا کتلی  
ہی بریک پیوچا تھا۔ اس کے سامنے دو دیواریں  
لیٹے برتی تھیں، روشنیاں بکسیر رہے تھے۔ برتی بوڈر  
نئی چرخ کا تھی عورت پر چڑے نئے نئے تھے، قفل بھیج  
رہے تھے۔ بل میں دھن، وہ ہوتی، بل میں غائب، وہ  
غائب دماغ کی بیانیوں میں اس روشنی کی بڑھیا کو یکسا  
رہا۔ آسمان پر کپوت کی اوٹ میں چھپا چاند پیارا،  
کمزور اور مفلک نظر آ رہا تھا۔ فضا میں دھند کے پھوٹے  
ادھر سے ادھر اڑتے پھرے تھے۔

”یہ شادمانی کی رات ہے مگر میرا دل کیوں اتنا  
ویران ہے، خالی اور بے احساس“ اس نے سوچا اور  
پھر ہستوں کا سہارا چھوڑ کر اس نے دور بٹھا۔ گھر کے  
کیمینوں پر نیند غلبہ کی مٹی جی گمردہ ایک جی جو آنکھوں  
میں خواب برساتے اس کا منتظر تھا۔ اسے خیال آیا کہ وہ  
وہیل بدل اور مگر مجھ رہے تھے دھنوں کے ساتھ اپنے  
کسرے کی طرف چلا۔ اور پھولوں اور زعفرانی  
خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔

☆☆☆

256 ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء

آمنہ، چچی جان اور اس کی آئیڈل بی بی ہو گئی تھی۔ وہ کم کم، لمبے لمبے رے والی، نظریں چمکاتے اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔ وہ اپنی کم کم کوششیں کر کے بھی وہ لکٹی طویل جملہ بولتی تو حمزہ کو اس کی آواز یاد آتی تھی۔ اس نے ان کے امتحان دیا یعنی تھاکہ اس کی شادی ہو گئی۔ حمزہ کو نواز دینا تھا کہ وہ اس کی ذہنی سطح کو بھی نہیں پاسکے گی۔ وہ اس سے بے ضرورت کے تحت بی بی بات کرتا تھا مگر آمنہ بنا اس کے کہ اس کا ہر کام وقت پر انجام دیتی۔ وہ شاید کم عمر سے بی بی حمزہ کی پسند پا پند کو جان لیتی تھی۔ حمزہ کو پانا ہر وقت پر ہوا مل جاتا تھا۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ ماں اور سر پرین اور جاتے ہوئے وہ آمنہ کے لیے کمر بڑھ رہی تھیں۔ اس کے بعد چچی جان کو اس نے جب تک غور سے دیکھا۔ اسے لگا ان میں زندگی کی حرارت اور خوش ہنسی کی صلاحیت بڑھنے لگی تھی۔

”میں خود اپنے لیے نہ سہی چلو کسی کے لیے تو کچھ کرنے کے قابل رہا۔ زندگی یوں ہی ضائع نہ گئی۔“ وہ کبھی کبھار سوچتا۔ چچی جان کے سارے کام آمنہ کرتی تھی۔

شادی کے بہت عرصے بعد جڑوہا پہنچا کر وہ حافظہ قرآن بھی نہ تھی۔ چچی جان انھیں بندے کے بیٹے رہیں اور آہستہ چچی آواز میں ان کے قریب بیٹھی تلاوت کر رہی ہوئی۔ پھر اس نے دیکھا چچی جان کے علاوہ بھی گاؤں کی کچھ خواتین اِدھر آنے لگی تھیں۔ وہ سب آہستہ تلاوت سننے آئی تھیں۔ جڑوہا یہ سب کمر میں ہوتا دیکھا اور نے ناظرانے کی کوشش کر۔

☆☆☆

دن گزرتے گئے، نزم، گرم، آسان، کٹھن دن۔  
 کئی جاڑے دھخت ہوئے اور بہاریں آئیں،  
 گرمیاں آکر بہاروں کو دھخت کرنی رہیں اور پھر  
 خزاں ڈیرا ڈال لیتیں۔ زندگی اپنے ڈھب پر گزرتی  
 جا رہی تھی۔ وقت کے ساتھ مزہ پہلے کی نسبت کم اور  
 مزہ بنجیدہ ہو گیا۔ آمنہ کو بھی اندازہ نہیں ہوا کہ اس

کے شوہر کے مزاج میں کوئی تبدیلی آئی تھی۔ وہ پہلے  
کیسا تھا، یہ اس نے نہیں دیکھا تھا۔ جو اس نے دیکھا  
تھا وہ ایسا تھا، بیخود، بے نیاز، کم، سوچوں میں  
..... وہ بھی اس کو بہت غور سے دیکھنے کی کوشش  
نہیں کرتی تھی۔ بہت پہلے ایک بار اس نے اسے غور  
سے دیکھا تھا، وہ درمیانے قد اور تھپسب جسم کا مالک  
تھا۔ گندی رکت، اور ایسا ہی بال جو بڑے بال اس کی  
شخصیت کو اچھا خاصا جامہ نظر دیتے تھے۔ وہ اسے  
غور سے دیکھنے پر بہت خوش ہوئی تھی مگر کچھ اس کی نظر  
اس کی گہری جمودی آنکھوں میں گردش کرتی اور اسی  
پر تھی، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اداسی غیر  
معمولی تھی اور جیسے مستقل ڈراؤ لے ہوئے تھی۔ اس  
نے اس کے بعد دوبارہ اسے غور سے دیکھنے کی ہمت  
نہیں کی تھی نہ ہی کسی دوسرے بہت کچھ اس کے  
اداسی کا سبب پوچھے، وہ انتہائی ڈانٹیں کر کے اپنے  
دروازے اس منگوا لے، یہ بند کر لیتا تھا کہ درونک  
دینے والے ہاتھ تک جائیں دروازہ کھل کر نہیں دیتا  
تھا۔ آہستہ بہ آہستہ اس بات کو بھانپ گئی تھی اس نے  
بھی اس بند دروازے پر دستک نہیں دی تھی۔

شادی کے ایک سال کے بعد اسے اندازہ ہوا  
تھا کہ وہ اس کم گو، تنہا، لیے دیے ہوئے والے شوہر  
کو محبت میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اس کے شوہر کے بارے  
میں لوگ کہتے تھے کہ بڑا لائق فاقہ تھا۔ اس کے  
خاکو کا قبل ازدین تھے اور اپنے اس کو اپنا وند  
قرار دیتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں میں اس کی  
ایک نامی تھی، وہ اپنی بیوی کے خاطر شہر کی کامیاب  
زندگی ٹھکرا کر ادھر موجود زندگی گزارنے کو آمیا تھا۔  
اس کی ذات سے متعلق سارے نکات مثبت تھے، اس  
سب پر تیرا بنیاد اپنی زندگی پر صابرانہ خوشی خوشی  
زندگی گزار رہی تھی۔ اس کو صرف ایک بات کا قلق ہر  
وقت ہوتا تھا۔ چار سال گزرنے کے بعد بھی وہ اولاد کی  
نقص سے محروم تھی۔ اس کا بے نیاز شوہر اسے بخوبی  
سمجھتا تھا۔ اس نے اس مسئلے میں اسے

## کتاب ریاضی بنی

خواہش کرتے یا عمر کو کاٹکھو کر تے نہیں سنا تھا۔  
 ”میرا ہی کچھ قصور ہوگا،“ اس نے یہ کہی بھی  
 اپنے کھاتے میں ڈال لی تھی اور اس کے زیر اثر وہ پہلے  
 سے زیادہ تندی سے اس کی اور چچی کی خدمت میں  
 مشغول ہو جاتی۔ ماسی باہر ہو چکے چکپکے اس قسم کے  
 ٹوٹے ٹوٹے زمانے کی ترکیبیں بتاتی اور وہ چکے چکے  
 ان پر عمل کرتی رہتی۔

”تیرے سینے میں تو قرآن محفوظ ہے بی بی،  
تجھے اللہ کبھی تاہم اراد نہیں رہنے دے گا۔“ ماسی ہاجرہ  
اسے یقین دلانی۔ وہ سر جھکا دیتی۔

☆☆☆

دن لہجی خاموشی سے گزر رہے تھے۔ وہ سب اپنی روٹین کے عادی ہو چکے تھے مردہ ایک مختلف دن تھا جب آئینہ میں تین شین لگنے کے لئے دھو رہی تھی اور ماسی باہر چڑھ پوانے سے پہلے سو می چروں کی ڈیڑیاں توڑ رہی تھی۔ چنانچہ اپنی کمرے میں بیٹھ گھبرا کر داخلی دروازہ بنا دیکھ کر دے رہا تھا۔ اس کے کواڑ پر اس کے دروازے کے قریب رنگے رنگ برنگ برنگوں کے بنجرے میں بند بندے ہر طرح پھل پھڑکا کر بنجرے کی جالیوں سے جاگنے لگے تھے پھر تیریاں اچھل کر باہر اُڑھ جا کر گئیں۔ آئینہ نے گھبرا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آنے والی ہے حد اعتدال کے ساتھ جن کے پتوں سچ کھڑی آئینہ نے استغاب بھری نظروں سے ماسی باہر کی طرف دیکھا جس کے چروں سے توڑتے اچھاتی ایک جگہ سے پھرتے تھے۔

”کیسی ہو ماسی؟“ آنے والی نے خود ہی ماسی کو مخاطب کیا تھا۔  
”تو..... کیسے آگئی؟“ لفظ ماسی کے منہ سے

”کیا نہ آتی؟“ اُدھر سے جواب میں سوال آیا۔  
 ماسی کے پاس شاید اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔  
 اس نے سر جھکا کر جلدی جلدی مرچیں سینٹنا شروع کر



دیں۔ آئے والی مالکانہ استحقاق کے ساتھ قدم بڑھانی اندر کوچی گئی۔  
 ”ماثر ہے۔“ اس کے اندر جانے کے بعد ماسی نے آمنہ کی طرف دیکھا۔ آمنہ نے دیکھا ماسی کے دوپٹے کا نوٹا اس کے دانتوں تلے تھا۔

چچی جان کی وہ بیٹی جو پنداروں کے لڑکے کے ساتھ نکاح کر کے چلی گئی تھی واپس آگئی تھی۔ آمنہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی شاید۔

☆☆☆

ماسی باجرہ حیران تھی کہ مائرہ کے آنے پر جس ہنگامے کی وہ توقع کر رہی تھی۔ وہ نہیں ہوا تھا۔ مٹی آیا مائرہ کی آمد کی جس کرکچھی کی ڈھیل ظاہر کیے بغیر سالوں بعد ادیک بار پھر نہ پر لڑاؤں آیا تھا مائرہ وہ اس شام گھر لوٹنے پر جب بڑی آدک پڑا تھا تو وہ بھی ماسی کو اتنا نارل لگا تھا جیسے کوئی متوجہ نہ ہو۔ مائرہ نے آکر کسی سے بات کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی، ماسی سے صرف اپنے کمرے کی چابی مانگی۔ چابی مائرہ کے پاس تھی اسی لیے مائرہ کی آنکھ وہ پچھلے برآمدے میں سمجھتے تھے۔ پر یوں مٹی رہی تھی جیسے یہاں سے بھی کسی گئی نہ ہو۔ مائرہ کی آمد پر ماسی کے ذریعے چابی لے کر وہ اپنے کمرے میں جا گئی۔ ماسی کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیا اسے ماسی کے کمرے کی صفائی کرنی چاہیے یا نہیں۔ مالکوں سے پوچھتے بغیر وہ یہ کام کیسے سرانجام دے سکتی تھی۔  
 ”مگر مالک کون ہے بھلا؟“ یہ سوال پہلی بار اس کے ذہن میں آیا تھا۔

”برہنچے سے ریا زار مٹی آیا، جزہ یا آمنہ؟“ ماسی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس بات پر غور مٹوئی کر دیا اور اپنے معمول کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔ جب باقی سبے اتارل تھے تو اسے کیا ضرورت تھی سوچ سوچ کر بلکان ہونے کی۔  
 ”وہ اس گھر کی بیٹی ہے، جو عمر سے کے بعد بیٹے آئی ہے اس کی مدد رات میں کوئی نہ کرنا۔“ اس

شام آمنہ کے گھر، منجیدہ مزاج شوہر نے اسے ہدایت کی تھی۔ اس نے سر جھکا کر اس فرمان کو قبول کیا اور مگر کے اور پوری خانے سے پلاؤ اور دو مہرہ پکتنے کی مہک اٹھنے لگی تھی۔

☆☆☆

ماثرہ کسی سے زیادہ بات کے بغیر اپنی مرضی سے دن، رات گزار رہی تھی۔ نہ اس سے کسی نے اس طرح آمد کی وجہ پوچھی نہ اس نے خود کچھ بتایا۔ وہ اپنی مرضی سے آگئی اور مرضی سے سوتی۔ جاگتے پر اسے آسنہ کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا، سو جانے پر اس کی نیند میں کوئی خلل نہیں ڈالتا تھا۔ ماسی باجرہ یہ سب دیکھتی اور سوچتی تھی یہ پڑھے لکھے لوگوں کے روئے ہیں، ہم جاگتا کیا جاگتے مصحلت اندیش، خاموش طبی اور سکون پذیر کی کوہ، تو اس طرح کی صورت حال میں آنے والی لڑکی کو بغیر اس کی بات سے، طے کوئے دے کر رہی اس کا سینہ چھتی کر دیں، اور پھر دھکے دے کر گھر سے نکال دیں۔ ہونا تو ایسا ہی چاہیے، دل کی جلن اور برسوں کی دکھ کو نکل جانے کا موقع تو ملنا چاہیے۔ وہ اپنے کام میں مسلسل اسی صورت حال پر غور کرتی سوچتی رہتی۔

”وہ جس دھنائی سے مٹی اسی دھنائی سے واپس آگئی اور جزہ یہ ہے کہ کسی سے بات تک نہیں کرتی اور پورا حق بھی جتا ہی ہے، درختے منہ“ ماسی کی سوچوں پر جو فیصلے وہ دیتی وہ بھی دل ہی میں رہتے۔

☆☆☆

”تم نے مجھ سے پوچھا نہیں میں کیوں آگئی جبکہ مجھے یہاں دوبارہ آنے سے سختی سے منع کیا گیا تھا؟“ پھر ایک شام مائرہ کی چوٹی لپٹی اور اس نے جزہ سے پوچھا۔  
 ”وقت گزرنے کے بعد ایسے کی اسٹنٹ منٹ لہو کی گرد تے چپ جاتے ہیں، کون ان کو جھار پونچھ کے باہر نکالے۔“ وہ مسکرا کر بولا تھا۔

”گاہ تو میری لوگوں نے دل سے وہ بات نکال دی۔“ مائرہ نے سواہ نظر دے اسے دیکھا۔  
 ”لوگوں کی بات تو میں نہیں کہہ سکتی میں اپنی بات کر رہا ہوں۔“ اس نے تنبیہ کی کہ۔ ”وہ بے رحمی میں سے شاید اس وقت بھی اس بات کو دل میں نہیں بٹھا یا تھا۔“

”اچھا۔“ وہ چھپے بری طرح چوکی تھی۔ ”خیر۔“ پھر اس نے سر کو جھکا تھا۔ ”میں ای کی بات کر رہی ہوں۔“

”ان کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ جزہ نے نرمی سے کہا۔  
 ”تم سمجھتے ہو ان کے فرماندے ہو، تم کوئی نہیں پتا ہوتا ان کے بارے میں۔“ وہ طنز پر انداز میں بولی۔

”اور مجھے تو تمہارے رنگ ڈھنگ پر بھی حیرت ہو رہی ہے۔“ پھر جزہ کا جواب نے بغیر ہی اس نے کہا۔ ”جتنے تم جنس تھے، میرا خیال تھا کہ کی دن میں تمہارا نام فرس کے کوئل پر رازنہ کے طور پر سنو کی مگر تم تو بن گئے اسکوٹ مائرہ وہ بھی گورنمنٹ ہائی اسکول کے۔“ اس نے مسخرانہ انداز میں جزہ کی طرف دیکھا۔ ”لوگوں کو ڈھپے دارنے اور مرنے بنانے والے ماسٹر صاحب، چچی پھلوں کوکان میں پھیر کر کان کی صفائی کرنے والے ماسٹری، اسکول کے لڑکوں سے کندھے اور ٹانگیں دیوانے والے سر می۔“ وہ ہنسی اور اس کی ہنسی میں چٹکنا مسخر کی کبھی محسوس نہ سکتا تھا۔

”یا پھر شاید تمہیں تفریح اور چٹھی کے وقت اسکول گیٹ کے باہر کینے والی چاٹ، سوے، مان حلیم، پنے چاٹ، مروئے، گول کے اور کراری وال کی ٹیٹسی نے ڈھلکا پھینکا ہا۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔  
 ”مجھے یقین نہیں آتا جزہ، یہ تم ہو، یہ تمہاری زندگی ہے۔“ اس نے جزہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”مسلسل شلواریں پہننے والے پاؤں میں کھنڈیاں

جہیں کر پھرنے والے، مرغیوں، بٹھوں، پرندوں کے دانے دنگے کا حساب کتاب رکھنے والے، بھینسوں، گائیکوں اور گریلوں کی لنگ آٹھری کرنے والے، کس کا جھال گھر ماسی کو منہ نہ کر کی پیاری لگ مٹی پھلوں پر امریکن اور گلیا سندی سے بجائے کے اس پرے کے کراوے والے، پانی کی باری کے اختراع میں راتیں جاگتے والے۔ اور تم نے شادی بھی کی تو کس سے.....“ اس نے باہر مٹی کی طرف اشارہ کیا۔

”اتنا جھگڑتی، کھوٹوں اور صحنوں کی لپٹا لیاں کرتی، کسروں میں جھانڈو پڑھا کرتی، سختی دار پلاؤ پکاتی اور کڑواے چاول کھانے کی ماہر یوں صورت لڑی۔“ اس نے کچھ پتا نہیں گھر کے باہر، اس گاؤں سے باہر، ملک سے باہر یا میں کیا ہوا ہے۔ جو بس اس نے بھی نہیں سوارائی ماس اور شوہر کی خدمت میں نکلن اس نگر میں جتا رہتی ہے کہ کبھی اس سے کوئی ناخوش نہ ہو جائے۔“ اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا تھا۔

”وہ جزہ۔“ تو تمہاری زندگی کا ڈھب یہ ہوتا تھا۔“ اس نے سوارائی نظروں سے جزہ کی طرف دیکھا۔ جواب میں جزہ نے نظریں جھکا لی تھیں۔  
 ”تمہیں یہاں کوئی بے آرا می تو محسوس نہیں ہوتا؟“ اس کا جواب بالکل ہی اور نوعیت کا تھا۔ ”کوئی چیز چاہیے ہو تو بتاؤ؟“ مائرہ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کبدری ہو مجھے پتا تھا تمہارے پاس میری کسی بات کا جواب نہیں ہوگا۔

☆☆☆

پھر مائرہ نے بات بے بات آمنہ پر مسکرا چلا نا اور اس کا سٹرواٹا مائرہ کو دیا۔ ماسی باجرہ کو آمنہ سے اس کا یہ پتہ چھتا تھا اور اس بات کو وہ مٹی آپا کے پاس بیٹھ کر ان کی ٹانگیں دباتے ہوئے ہلکی آواز میں جتا رہی تھی، جواب میں اگر بھی وہ ہرے سے کپڑا ہٹائیں تو گلن آن کی آنکھوں کے گوشے ہنسنے ہوئے ہیں، ان کے چہرے کی واپس آتی شادابی زردیوں

میں بدلنے لگی تھی۔ وہ کمزور اور دھمکی نظر آتی تھیں۔ ان دنوں میں تو وہ اشاروں سے کچھ کہتا بھی چھوڑ گیا تھا۔ وقت کے وقت آمنہ ان کے سامنے ناشا، کھانا لاکر رکھ دیتی تو وہ تو فوراً بہت کھا لیتیں، نماز کے وقت بھی باہر اور بھی آمنہ انہیں دھمکاتیں تو وہ بھی بیٹھ کر اور بھی لیٹے لیٹے اشاروں سے نماز پڑھ لیتیں۔

”ایسا ہے حس، پتھر دل بھی کوئی نہ ہوگا۔“ ماسی سوچتی۔ ”مہینہ ہونے کو آیا ہے آئے ہوئے، ماں کی شکل دیکھی نہ دیکھنے کی آرزو کی ہے کسی۔ سانپ پھلی بدلتا ہے، فطرت نہیں۔“ پھر وہ ہیش کی طرح خود ہی فیصلہ صادر کرتی۔ ”اور لوگوں کی زبان میں شاپے پھر سے ٹھکنے لگی ہیں، آمنہ سے قرآن پاک کی تلاوت سننے کے لیے آنے والی عورتوں نے ادھر آنا چھوڑ دیا ہے۔ کوئی اپنا بچہ نہیں بھیجتا اب ادھر رہنے کیلئے کے لیے، برائے دل واپس کب جاتا ہے۔“ وہ سوچتی۔ ”اللہ جانے وہ کدھر ہے حس اس کا جس کی خاطر سب کو چھوڑ گیا تھا۔ ہم نے تو لیٹوں پارے جگر انوں والا راستہ ہی بدل لیا، لے رہے راستے سے ہو کر شہر جانے کی عادت ڈال لی، ڈاکوؤں، چوروں کے پنڈے راستہ کون دیکھے۔“ وہ اپنے ہی دھیان میں باتیں کرتی اور جواب دہ دیتی۔

”تم نے مجھ سے پوچھا نہیں، میں کس حال میں جیتی ہوں؟ پھر ایک روز جب مزہ تو اوار کی چمچی پر گھر میں تھا نماز نہ اس سے کہا۔“

”یقیناً اچھے حال میں جیتی ہوگی، اس لیے نہیں پوچھا۔“ وہ رساں سے بولا۔ ”راصل میں سدا کا خوش گمان ہوں۔“

”تمہیں تجس نہیں ہوتا کہ میں نے جو سرکشی کی، اس کا نتیجہ میرے حق میں لٹکا یا میرے خلاف؟“ اس نے مزہ کی بات ان کی کئی کرتے ہوئے کہا۔

اس کی زبان ان کی کئی کرتے ہوئے کہا۔

اتنا ست اور جوہوں کو تجس کرنا بھی مجھے ایک طرح

کی اسکر سائزنگ کی ہے۔“

”تم واقعی اسنے بے نیاز ہو یا بس نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے؟“ وہ چڑ کر بولی۔

”میں نے بتایا تا کہ میں اتنا کامل ہوں کہ کچھ نظر آنے کی کوشش کرنا بھی میرے بس کی بات نہیں۔“ وہ ہلکا سا سر کیا۔

”بھل دو۔“ مازہ نے غصے سے پاؤں مار کر سامنے رکھی تپائی کھسکا لی۔ ”تم سب مینٹل ہو چکے ہو، ایک دم پاگل۔“

”ہاں۔ compliment بالکل ٹھیک ہے۔ کم از کم میرے لیے۔“

”تم جیسے دیوانوں کی طرح میری ہر بات سے متفق رہتے تھے، میرا خیال تھا آج بھی ویسے ہی ہو گئے۔“ اس نے دانت چیس کر کہا۔

”میں تین سال بعد انگلینڈ سے واپس آئی ہوں۔“ اس نے چولی بار اپنے بارے میں بات کی۔ ”اور میں اس گھر کا رخ بھی نہ کرتی اگر میں یہ سستی کر ساق تم اس گھر سے کرتا دھرتا ہو..... تم جانتے ہو کہ میں یہاں صرف تمہارے لیے آئی ہوں۔“ اس نے انکشاف کیا۔ ”مگر تم۔“ وہ سر جھٹک کر بولی۔ ”تم فائر انشل ہو چکے ہو، میری سمجھ سے بالکل باہر۔“

”اوہ آئی ایم سوری۔“ مزہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”پھر تو مجھے نہیں بالکل اور طرح سے فریڈ کرنا چاہیے تم جاتی ہو کہ مجھے کبھی سمجھ نہیں آیا مجھے کب، کیسا رویہ اپنانا چاہیے۔“

”تمہیں سب پتا ہے کہ کیا صحیح ہے، کیا نہیں، کیا ہونا چاہیے، کیا نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ غصے سے بولی۔ ”صرف تم ہی حس ہو گئے ہو اور بے نیاز نظر آنے کی

ایکینک کرتے ہو، اور ایسا۔“ اس نے باورچی خانے کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہاری اس کم عقل، بے شعور، ان پڑہ بیوی کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے اپنی ذاتی زندگی میں اپلوں سے، اسی لیے تم نے خود کو ذات کی سرد خانے میں چھپا کر بے نیازی کی چادر اوڑھ لی

ہے۔ اور یہی وہ چیز جس سے بچاؤ کی خواہش نے مجھے ناکار کا انتخاب کرنے کا موقع دیا۔“

”پ۔“ مزہ نے صبح سے چھائے داولوں سے برسنے والے پہلے قطرے پر نظر جمالی۔

”میں وہ نہ کرتی تو آج تمہاری طرح کسی جاہل، پینڈو، بے شعور چوہر دی کے پلے بندگی کو کمزور کے تیل اور کوئین کے مینڈک جیسی زندگی گزار رہی ہوتی۔“

”پ۔ پ۔ پ۔ پ۔“ مولیٰ مولیٰ بوندیں قطار باندھے برسنے لگی تھیں اور فضا میں خشک مٹی پر پڑنے والے پانی کے بعد اٹھنے والی خوشبو پھیل گئی۔

”مجھے کوئی regret نہیں ہے اس لیے اس فیصلے پر۔“ کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے بتانے والے انداز میں پڑ کر اٹھا، ”نہ تم لوگوں کے عاقبت جانے میں میری زندگی پر کوئی اثر ڈالا، نہ چوہر دیوں کی بیٹی کے دینداروں کے بیٹے سے نکاح کرنے نے۔“

”اللہ کا شکر ہے۔“ مزہ نے مسلسل برقی بارش کی بوندوں پر نظر جمائے ہوئے کہا۔

”مگر شاید میری زندگی میں کچھ کم ہے۔“ مزہ کے انہماک کو مازہ کے اس جملے سے توڑ دیا تھا۔ اس نے گردن پیچ کر مازہ کی طرف دیکھا۔

”میں سنے سالوں کے بعد بھی مجھ لگتا ہے کہ میں نادر کو بہت سارا جان لینے کے بعد بھی اس کے بارے میں بہت کچھ نہیں جانتی۔“ مزہ نے نظریں جھٹکا کر مازہ کی بات پر غور کرنے کی کوشش کی۔

”جیسے ایک ظلم ہے۔“ مازہ نے اپنے بازو پھیلا کر کہا۔ ”ایک void نظر آنے والا۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”وہ خلا اتنا تاریک ہے کہ اس میں انسان جنس ٹاک ٹوئیاں ہی بار بار دھکا جاتا ہے

اس کے پائینس جاکس۔ اس کو بوندیں کر سکتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو پتا ہے اس نے مزہ کی طرف دیکھا۔

”اے کیا پسند ہے، مجھے کیا پسند ہے۔ وہ کیا

اودھنا پہننا پسند کرتا ہے، میں کیسے کھانا چنا جاتی ہوں۔ زندگی میں کیا چیز اہم ہے کیا غیر اہم، کبھی ترجیح کیا ہے، دوسری کیا، آخری کیا ہے۔ سب کچھ اس خلا کے مہیب ستاروں اور اندھیروں میں گم نہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ کسی چیز کا کوئی سرا ہی نہیں ملتا۔“ اس نے ایک بار پھر مزہ کی طرف دیکھا جو ہونٹ بھیچے بیٹھا اس کی بات سن رہا تھا۔

”ایسا ہی void تمہاری اور آمنہ کی زندگیوں میں بھی ہے نا؟“ آچاک مازہ نے ایک غیر متوقع سوال کیا۔

”تم اپنی بات سناؤ۔“ مزہ نے کہا۔ ”ہاں۔“ وہ واپس اپنے ٹریک پر آگئی۔ ”اور اس مہیب اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارے مارے اب ایسا لگتا ہے جیسے ہم ہر بات میں اختلاف کرنے لگ جاتے ہیں..... میں اسی صورت حال سے بریک لینے یہاں آئی ہوں۔“ وہ اپنے ہاتھوں کے تانوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہارے بچے بھی تو ہوں گے؟“ مزہ نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے اپنے ہاتھ سپٹ کر گود میں رکھ لیے۔ ”ایک بیٹی ہے مگر وہ پیدائشی طور پر گولی اور بہری ہے۔“

بادل ایک دم زور سے گرجا تھا اور بجلی کا ایک کوندا سا چمک کر صحن کے منظر کو روشن کر گیا تھا۔ باورچی خانے سے آمنہ منظر کی تبدیلی پر آدے سے آگے دالان میں محسوس ہوئی۔ اسے چچی جان کوان کے کمرے سے لا کر دالان میں لانا تھا۔ عصر کا وقت ہوا جا رہا تھا۔ اس وقت نماز کے بعد وہ انہیں مختلف

سورتنیں اور ان کا ترجمہ سناتی تھی۔ ”میں ایک معذور بچی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔“ مازہ نے یوں کہا جیسے اس کی اور کی بیٹی کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہو۔ ”میں اس کو معذور بچوں کے ادارے میں چھوڑ آئی، اس بات پر نادر کو مجھ سے



شدید اختلاف ہے۔ وہ مجھے خود فرض کہتا ہے اور پتھر دل بھی۔ ”مزرہ نے سامنے دیکھا، دالان میں کس پر قہر رو ہو کر بیٹھی چلی جان کو کھنکھو دیکھ مصروف تھیں۔  
”اس نے مجھے کہا کہ اگر گھر میں وہ بیٹی نہیں رہے گی تو میں بھی نہیں رہوں گی۔“ مازہ بتا رہی تھی۔  
”اس نے ہمیں کھر بدر کر دیا؟“ مزرہ نے یوں کہا جیسے اس کہانی کے منطقی انجام کا آخری جملہ سنا رہا ہو۔

”نہیں۔“ اس نے سخت لہجے میں تردید کی۔  
”تمہیں شاید پتہ نہیں کہ دیندار اپنی بات کے بہت کچے ہوتے ہیں، چوہدروں کی طرح وقت کے ساتھ اپنی بات سے پھرنے والے نہیں ہوتے۔“  
”اوہ گریٹ۔“ مزرہ نے شکر اکر کہا۔  
”میں شاید زندگی پوچھی گزار رہی ہوں، اگر یہ بیٹی و بیو معاملہ نہ ہوتا۔“ مازہ نے مزرہ کے نظر کو نظر انداز کر دیا۔

”وہ پیدائشی معذور ہوئے کے ساتھ ساتھ عجیب سی حرکتیں بھی کرتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں سے عجیب سے شرارے نکلنے لگتی دیتے ہیں۔ اول تو وہ ہنستی ہی نہیں، ہنسنے تو اس کی شکل اتنی بیباک ہو جاتی ہے کہ دیکھنے والے برداشت نہیں کر سکتے۔ تین سال کی ہوئے کوئی ہے مگر چلتی نہیں۔ وہ crawl بھی نہیں کرتی کرتی فرش پر جت لپٹ کر بیٹھ، ناگوں اور بازوؤں کے بل پر آگے سرکتی ہے جیسے سانپ چل رہا ہو۔“

”استغفار..... تو بہ استغفار! مزرہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”کیا تمہیں ان کی خبر نہ آئی جنہوں نے تم سے پہلے سرکشی کی۔“ دالان سے آمد کی حلاوت و ترجمہ آواز ابھر رہی تھی۔

”اوہ، ایک نافق الفطرت مخلوق ہے۔“

”اور اپنے کام کا وبال پیکھا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ مازہ بتا رہی تھی۔  
”اسے دیکھ کر مجھے اتنی اذیت ہوتی ہے کہ میرا دل چاہتا ہے جہاں وہ موجود ہو، وہاں سے کھنکھ دور چلی جاؤں۔“ مازہ کی آنکھ سے آنسو کا پہلا قطرہ پھسلا۔  
”تم نے مرنے کا دل دکھانے کا جو گناہ کیا، اس کو گناہ سمجھا بھی تم نے۔“ مزرہ کا دل چاہا کہ۔

”یہ اس لیے کہ ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لاتے تو بولنے کیا آدمی ہمیں راہ بتائیں گے۔“ مازہ بے خود خوش الحان تھی، مزرہ نے اس روز پہلی بار دھیان سے اس کی آواز سنی تھی۔

”میں سمجھتی ہوں یہ سب تعجب ہوتا ہے۔ اس طرح کہ بچے بھی تعجب ہوں گے، مگر وہ بیٹی جیسے بلاصورت، بے مزین نیک سائنس اس کے ساتھ میں اپنی تو جہات پیش کرتی ہے، مگر میں سوچتی ہوں کہ ایسا میرے ساتھ ہی کیوں ہوا۔“

”تو کافر ہوئے اور پھر گئے اور اللہ نے بے نیازی کو کام فرمایا، اور اللہ بے نیاز سے، سب خوبیوں سر اہا! آمدنی آواز آئی۔“ مزرہ نے دیکھا جتنی جان کی آنکھوں سے ہجرت کی صورت آنسو رواں تھے۔

”مجھے اللہ اور اس کے رسول کا واسطہ۔“ بڑوس پہلے جتنی جان کا جڑ سے اٹھوں کے ساتھ مازہ سے فریاد کرنے کا منظر اس کی نظروں کے سامنے آ گیا۔

”اللہ اور اس کے رسول نے اپنی جائز خواہشوں کو پاؤں تلے روندنے کا کوئی حکم نہیں دیا۔“ مازہ کی دعوت ہجرتی آواز اس کے کانوں سے غمرانی تھی۔

”اس باپ کے حقوق، ماں کا درجہ، اس کا احترام۔“ جتنی جان اسے بتا رہی تھیں۔

”افسوس۔“ اس نے خاترات سے منہ پھیر لیا تھا۔  
”کافروں نے کہا کہ وہ ہرگز نہ اٹھائے جائیں گے، تم فرماؤ کیوں نہیں میرے رب کی قسم تم ضرور

اٹھائے جاؤ گے، پھر تمہارے کو تک نہیں جتانے جائیں گے، اور یہ اللہ کو آسان ہے۔“ آمدنی کی آواز آئی۔

”میں اس بچی کی موجودگی میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔“ اب مازہ کے آنسو بھی قطار باندھ گئے تھے۔ مزرہ نے اپنا پورا دھیان دالان سے آئی آواز کی طرف مبذول کر لیا۔

”کوئی مصیبت نہیں پہنچی، مگر اللہ کے حکم سے۔“

”اے ایمان والو تمہاری کچھ بی بیایں اور بچے تمہارے دُشمن ہیں تو ان سے احتیاط رکھو۔“ مزرہ نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

”اور اگر معاف کر دو اور درگزر کر دو بخش دو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ تمہارے مال اور تمہارے بچے جا بقی ہیں، اور اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔“

مزرہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے جتنی جان کی طرف دیکھا، وہ دونوں ہاتھ جوڑے اوپر دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

”یہی اذیت ہے یہ میرے لیے بڑی اذیت ہے۔“ مازہ اپنے آنسوؤں کے قابو پانے کی کوشش کرتے بدقت بول رہی تھی۔ مزرہ نے برآمدے سے باہر دیکھا، مچھن میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا۔ نئی بوندیں گرنے پر کھڑے پانی میں بھونکنے اور ختم ہو جاتے۔ ٹیگٹ اس نے اٹھ کر مازہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لیے دالان میں چلا آیا۔

”جس دل کو توڑے، اذیت دینے، بے آواز رلاتے رہے، جن ہونٹوں پر قفل ڈال دینے کے گناہ کی مرتکب ہوئی ہو، اس دل سے جب تک مافی نہیں مانگ لو گی تب تک تمہاری اذیت ختم نہیں ہوگی۔“ اس نے مازہ کو کچھ جان کے رو برو کھڑے کرتے ہوئے کہا۔

جتنی جان نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔



آخری صفحات پر کی محبوب کلمہ **نجمہ مودی** ایک خوبصورت شاہکار لیے حاضر ہیں۔ دل رکنی کے عالم میں ویران راہوں پر ایک تہا سافر اور نامکمل خواہش کا قفس..... دلفریب منظر اور تلامذہ پر پکارتے جذبات کی بحرانی تیزی۔

**مسافر**  
سلطنتِ مملکت پر ناصر ملک کا چنگا کاٹنے والے اطویل سلسلہ گل نگار سے ماہر شاعر کا لکھنا ہے لوگوں کی ہوا دیتا

**گھر کے چراغ سے**  
”جو کوارے قتل کرتا ہے وہ کوارے ہی قتل ہوتا ہے۔“  
جلال الدین خلجی کے بارے میں ایک درویش کی پیش گوئی جو اس انداز سے پوری ہوئی کہ وہ مکالمات میں بھی نہ تھا۔ **ڈاکٹر سجاد امجدی** حرق ریزی۔

**حضرت داؤد علیہ السلام**  
برندوں کی زبان سمجھنے والے اور پھر دلی کی نگرانی والے نبی کی سوانح..... انہیں نبوت اور بادشاہت یک دلی تھی

**نکاح**  
سکھوں، مغل شعروں، آپ کے خط مرید، کاشفِ ذہن، مسخات آزاد، مرید کے خان، تنویر خواجہ

**سیرت**  
اور سلیم انور کی ہجرت، بابائیاں



اپنے دھیان میں تلاوت و تہجد کرتی  
آمنہ کی تحویت ٹوٹی اور وہ چونک گئی۔

مازہ سارکت کھڑی تھی۔

”وہ گناہ نہیں تھا، ایک جائز خواہش۔“

”بھواس بند کرو۔“ مزہ کے ہاتھ نے مازہ

کے گال پر شان چھوڑ دیا۔

مازہ ہاتھ گال پر کے سٹشدر اسے دیکھتی رہ

گئی۔

”کاش یہ تھپڑ میں نہ تھیں اس وقت مارا

ہوتا۔“ مزہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ”ایک نہیں کئی

تھپڑ۔“ اس نے جتنی سے کیا۔ ”کاش میں نے چچی

جان کے کہنے پر تمہاری ٹانگیں کاٹ کر پھینک دی

ہوتیں یا تمہارے اس حائق نادار کے غیرت دلانے

پر واقعی بند قذافی اٹھائی ہوتی۔“ اس کی آواز اشتعال کی

وجہ سے کانپنے لگی تھی۔

”مگر اس وقت میرا نادان دل تمہاری محبت کا

مغلوب تھا۔ تمہاری ہر خواہش کا احترام کرتے ہوئے

تمہارے چہرے پر ہنسی مسکراہٹ دیکھنے کا جتنی۔

میرا خیال تمام بڑا ٹھوکانے، بات منوانے اور اس کے

لیے ہر حد سے گزر جانے کا حق رکھتی ہو، میں ہراس

زخمی سے دست بردار ہو گیا جو تمہاری اس خواہش

کے جواب میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے تجھے بد دلی

گئی۔ میں تمہاری اس خواہش اور ہند کے راستے میں

آنے والی ہر رکاوٹ کے سامنے سینہ تان کھڑا ہو گیا

اور انہونی کو کوئی میں بدلنے کا وسیلہ بن گیا صرف اس

لیے کہ میں نادان یہ سمجھتا تھا تمہارے دل کو دکھ دینا

گناہ ہے۔“ مازہ نے ٹھٹھک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں میں اتنا ہی احمق تھا۔“ مزہ نے اس کے

اس طرح دیکھنے پر کہا۔ ”اتنا احمق کہ تمہارے جانے

کے بعد بھی پوچھا رہا۔ تمہاری محبت سے مغلوب

میں نے ایک گنہگار شاعر کو کبیر کو لا تاردار کر دیا

آجیوار کیا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں بہت خوش

گمان ہوں، یہاں آکر رہتا بھی میری خوش گمانی کا

نتیجہ تھا، چچی جان کی خدمت کر کے، ان کے لیے اپنی

زندگی کے اچھے دن قربان کر کے میں یہ گمان کرتا رہا

کہ کبھی جب تم کو اپنی ماں کا خیال آئے گا اور تم ان

کے پاس لوگو کی ہونٹیں خوش ہوگی کہ میں نے تمہاری

عدم موجودگی میں تمہاری ماں کا کس قدر خیال رکھا۔

میرے جیسا بھی کوئی احمق الذی ہوگا۔“ سانس لینے کو

تھمرنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

”میں نے یہ نہیں سوچا کہ جو اپنی ماں کی پرسوں

کی ریاضت کا ناقدری کرتے ہوئے ایک ایسی ہی

خاطر سے ٹھکر سکتی ہے، وہ میری محبت یا میرے دل

کے جذلوں کی کیا قدر کرے گی۔ جس کی آنکھ دل اور

زبان پر شکر کا پردہ پڑ گیا، جس نے اپنی غرض میں اس

دل کو پاؤں سے ترو ڈھونڈ لیا اس میں رب بستا ہے، جو

ناشکری کی انتہا پر پہنچ کر کبھی رہی نہ میری ماں اب آن

پان کا دھول بھٹی رہے گی عمر بھر۔“ وہ میری ٹھکر کر دیا

ہوئی۔ مگر میں نے بتایا نا کہ میں نے ایک عمر خوش

گمانی میں گزار دی۔“ وہ ایسے چنسا چنسا اپنا مسخراؤ مارا

ہو۔

”میں ابھی بھی خوش گمان تھا۔“ پھر اس نے

انکشاف کیا۔ ”تمہاری دواہی پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں

کیا، تمہارا مان بوجھانے کو تمہاری خاطر دل دوستوں

میں مصروف ہو گیا، مجھ کو تو اپنی محبت سے مغلوب ہو کر

استے پر گزر جانے کے بعد بھی تمہارا خیال میرے

دل میں سینزل پوزیشن سنہلایا۔“ بیٹھا تھا۔ ”کہتے کہتے

اس کی نظر آمنت پر پڑی جس کا سریہ بات سن کر مزید

جنگ کیا تھا۔

”اب بھی میں تمہارے چہرے پر مسکراہٹ

دیکھنے کا جتنی تھا، اسی لیے میں نے تم سے کوئی

سوال جواب کیا۔ تمہارے کسی سوال کا جواب دیا مگر

افسوس ہے کہ وہ آج تم سے آج کی ٹھٹھکو کے دوران

میرے عمر بھر کے التماس ملی بھری میں ملیا بیٹ کر دیے۔

میں نے تم سے سوال کیا کہ تمہارے لیے بھی تو ہوں

گئے، اس سوال کے پیچھے یہ توقع تھی کہ جب تم خود ماں

بنی ہوگی تو تمہیں اپنی ماں کی بھی قدر آتی ہوگی۔ ماما

کی فطرت کو صرف ایک ماں ہی سمجھ سکتی ہے۔ مگر تم

.....“ اس نے مازہ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

”تم گمراہی کی اس شاہراہ پر جا چکی ہو جہاں

تمہیں اپنے بطن سے جتنی جتنی کے لیے بھی ماما کا

احساس نہیں ہوتا تم اس سے بھی پیچھے ہرانے کی فکر

میں ہو..... نہیں۔“ مزہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کوئی

خاندانی روایات، لا شعور میں بے نقضات نہیں جن

سے ایک قدم غلط اٹھا کر چھٹا چھڑایا جا سکے.....

خود غرضی کی جتنی بھی دیر چنی آنکھوں پر باندھ کر تم اس

افوق الفطرت بنی کے نظارے سے بچتا جا ہوگی اتنا

یہی تمہارے دل کی اذیت بڑھتی جائے گی۔ سرگمی اور

بے باوت کا یہ وہ پڑاؤ ہے جہاں سے تم کو نہ چھوٹے

والی اذیت کا مسخر شو ہو جاتا ہے۔ تم کو گھرو گھومنے

کا اندازہ ہو کہ تمہاری بنی کی شکل میں اللہ کی بے نازی

کے رنگ تمہارے سامنے آنے لگے ہیں، یہ تمہارے

کونک ہیں جو تمہیں اس شکل میں جتانے جارہے ہیں۔

تمہاری ماں جس نے تمہاری خاطر ملی ہوئی میں

کاٹ دی اور تم کی جا دوسرے پر تانے رکھنے کی خاطر

جو آبلہ پا ہوئی، اس کی کمی نصحت پر تم نے کان دھرے

نہ اس کی منت ساجت تمہارے سامنے کوئی حیثیت

پا سکی۔“ وہ ایک بار پھر سانس لے کر کھڑا

”ابے اور نادار کے درمیان جس خلا کا تم نے

ذکر کیا جس میں ایک مہرب سنا اور گھپ اندھا جھپا

ہوا ہے، جہاں تم دونوں ٹانگ ٹوٹیاں مارے ایک

دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہو، یاد رہے وہی

خاندانی فرق ہے، تربیت و ماحول کا فرق جس کو چچی

جان تمہارے کوئی گزر اگر کر کے تمہیں کسی بڑی مصیبت

سے بچانا چاہتی تھیں، وہ تجر بہ کار تھیں، باقی جتنی

ذات، مروتات خاندان سے، جو کھڑی آگیاں تھیں، تم نے

ماحول و مروتات کا فرق ضرور ادا کیا۔“ اس نے تم نے

کہا تمہاری پسند، ناپسند، ترجیحات، طرز زندگی سب

اس خلا میں گڈ ہو جاتا ہے، یہ وہ تجر ہے تھا جس

## وہ دسمبر کی شام

یاوے تم کو

دوسرے دسمبر کی شام

میرے جتن بست باخوں میں اپنی زندگی

سے بھر پور کسمور ہے تھے

ہم ہم بد ہو شیوں میں

کسبیں دور پتوں میں محو رہے تھے

دھند میں سر، کمر، اودھونے جب

یکارہ تھیں۔

مکھی آنکھ تو پٹنے سراب، سراب تھے

دسمبر کے دھند آئیز لمحے عذاب ہی

عذاب تھے

چاروں جانب سوائیل نظر میں تھیں

خالی، خالی جواب تھے

کر چٹا تھیں

ٹوٹے بکھرے خواب تھے

ملن کے سارے موسموں کے لمحے

سراب ہی سراب تھے

فیصلہ آصف خان، ملتان

سے تھیں بچانا جاتی تھیں، مگر تم کو اس تجربے سے  
گزرنے کی بے خبری تھی..... شاید یہ تجربہ نہ ہوتا  
جو تم ان کی دعا لے کر اس میں سے گزرنے کو  
جاتیں..... مگر تمہاری بد قسمتی تمہارا شعور عقل فہم اور  
بینائی سب سرگمی اور زندگی آگ میں جھسم ہوئی.....  
اور اس سے بھی بڑی بد قسمتی تمہاری ہے کہ تمہیں اب  
بھی سمجھ نہیں آتی کہ تمہارا دل اذیت میں مبتلا کیوں  
ہے۔“ اس نے دم بھڑک مازہ کی طرف دیکھا جو ستا چہرہ  
لیے چچی جان کو کیے جارہی تھی۔

”میں سمجھتا رہا کہ یہ تمہارے خمیر کی غلطی ہے جو تمہیں اب تک ان کا سامنا کرنے نہیں دے رہی۔“ وہ ہنسا۔ ”مگر اب مجھ میں آیا کہ سرکشی کی یہ وہ اسٹیج ہے جہاں ابھی تک تم کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں۔“ مازہ نے آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

”اور میں.....“ وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ”مجھے دیکھو ایک خود غرض کی محبت میں اعتراض مند ہوا کہ سب رشتوں کا احترام بھول گیا۔ تمہیں یاد ہے تم مجھے ایک نظم کا نیا کرنا تھیں فیض احمد فیض کی جسے میں ہمیشہ فیض جگر کہتا تھا۔“ اس نے مازہ کی طرف دیکھا۔

”مجھے آج اپنا اور تمہارا تجزیہ کرتے ہوئے ہے اعتبار اس کے کچھ الفاظ یاد آگئے۔ شاید تمہیں بھی یاد آجائے۔“

چلو آج کچھ حساب زبیاں جاں کر لیں  
الم شمار کریں درد آشکار کریں  
حساب زبیاں جاں“

اس نے ڈیرایا۔ ”تمہاری محبت میں مغلوب میں سوچتا رہا کہ تمہارے علاوہ کسی اور کو سوچنا بے وفائی ہے اور اس اعتقاد سے سوچ کے زیر اثر میں اس فرشتوں جیسی لوکی سے یوں غافل رہا جیسے اس کا وجود میرے ارد گرد ہے ہی نہیں۔“ اس نے آئینہ کی طرف اشارہ کیا۔

”میں نے کبھی اسے ڈھکیے سے مخاطب ہی نہیں کیا۔ میں نے بھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اس میں کون کون سی خوبیاں ہیں۔ لیکن آج تمہاری خود غرضانہ اینٹیں تمہیں نے مجھ پر نہ آشکار کیا کہ بے غرضی جیسی ہوتی ہے، اس لوکی جیسی جو میری بیوی ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا اور کرسی جیسے آئینہ کے وجود کے نیچے ڈنگا لی گئی۔

تمہارے بستر، تمہاری چیزوں سے تمہارے لمس کو محسوس کرتے دل پہلے سے زبردی رہیں، مگر اس نے سب جانتے ہوئے بھی کبھی نہ مجھے نہ کسی چچا جان کو بھینچو آکر گھر میرے دل پر کسی اور کا قبضہ ہے تو وہ کس جرم کی پاداش میں یہاں لائی گئی ہے، یہ چچی جان کی سگی بہن نہیں مگر چچی جان کی یوں خدمت کرتی ہے جیسی سگی بہن بھی نہ کر سکے..... کیوں؟“ اس نے مازہ کی طرف دیکھ کر جیسے اس سے سوال کیا۔

”یہ زیادہ پہلی گھسی گھسی مکر ڈر گیاں اس کے سامنے بچ جی۔ اس لیے کہ اس کو اللہ نے مضبوط ایمان کی دولت سے لالا مال کر رکھا ہے، اس کے سینے میں قرآن محفوظ ہے، اس کے دل میں سکون بے اکرنا ہے۔ یہ امید ہوتی ہے نہ نامرادی کی خشش میں مبتلا، یہ ہماری تمہاری طرح اللہ سے گلہ نہیں کرتی اور ہر حال میں شکر گزاری کا فریضہ جاتی ہے۔ اس کی حقیقت اور تمہاری خود غرضی سے آشکار ہونے کے بعد آج مجھ پر انکشاف ہوا کہ زبیاں جاں اس قدر کیوں ہے۔ میرا دل اس قدر دیران کیوں ہے۔ اس لیے مازہ.....“

اس نے مازہ کو دیکھا۔ ”کہ ہماری، تمہاری نیٹوں میں قور ہے۔ تم اپنے دل کو اور میں تم کو خوش رکھنے کے پیکر میں دوسروں کی نیٹوں سے بے نیاز رہے۔ میں آئینے میں چچی جان کی جو خدمت کرتا رہا اس میں کبھی تم کو خوش رکھنے کی غرض شامل تھی۔ جب ہی تو اللہ نے ہماری نیٹوں کا وہاں چکھایا۔ تمہیں مافوق الفطرت اولاد عطا کر کے، مجھے اولاد سے محروم کر کے۔ بے شک کوئی مصیبت نہیں پہنچی مگر اللہ کے حکم سے۔“ مازہ کی آواز پکپکاتی نہ لگی۔

”اب سبکی موقع ہے مازہ..... چلو آج حساب بائنٹ جاں کر لیں۔ جن لوگوں کے دل دکھانے کا باعث نہیں رہے۔ ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لیں۔“ اس نے تم آنکھوں سے آئینہ کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے مازہ چچی جان کے قدموں میں گھٹکھٹوں سے بل گئی ہو گئی تھی۔

”ای مجھے معاف کریں۔“ وہ چلا رہی تھی۔ ”اور اگر معاف کرو، اور روز کر کرو اور بخش دو تو بے شک اللہ بخشے والا مہربان ہے۔“ مازہ نے کچھ دیر پہلے سے ہوئے الفاظ کو دہرائے تھے۔ چچی جان نے کانوں کا ہاتھ لگاتے ہوئے مازہ کو دیکھا تھا اور پھر اسے سینے سے لگایا۔

”ممتا خود غرض نہیں ہوتی، مجھ سے نہیں اس سوچ کے شر سے پناہ مانگ جو تجھے اپنی جی سے دور جانے پر اکساتی ہے۔“ بڑسوں بعد چچی جان کی آواز مگر کھری فضا میں ابھری تھی۔ ان سب نے چوک کر انہیں دیکھا تھا۔

”تیرے جانے کے بعد میں نے خاموشی کی چادر اس لیے اوڑھ لی کہ کبھی غم و غصے میں میری زبان سے کوئی بدعاتیرے لیے نہ نکل جائے، میں اپنے دل میں تیرے لیے شکر سے تہاہ کی درخواست کرتی رہی۔“ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”اللہ نے تجھے شر سے توبہ کا موعن دیا ہے۔ بندے سے بغاوت اللہ سے بغاوت کی طرف لے جاتی ہے۔ میں پہلے تو نے نہ جانا کہ ماں اولاد کی دشمن نہیں ہو سکتی۔ میں نے بھی سمجھا تھا کہ تیرے لیے وہ فیصلہ بہتر ہوتا تو میں کس چیز کو اڑے نہ دیتے۔“

”تو نے میری بات نہیں سنی اور تو نے دیکھا میں غلط نہیں کہتی گی، خاندانوں کا رکن نہیں برسوں کے عمل سے گزر کر بنتا ہے۔ ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں جا کر گزربزرگنا آسان نہیں ہوتا، وہ بھی یوں کہ پیچھے دعائیں اور باتوں کا سایہ نہ ہو مگر تو نے بھی، اپنے من کی ہر ادائیگی کے لیے سب کے دلوں کو کل گئی۔“

وہ روئے پہلی جا رہی تھیں۔ ”ماں کا دل جس میں اب رہتا ہے۔“ ”پر اب تجھے اللہ نے شر سے موعن دیا ہے۔ اللہ بے نیاز ہے، وہ دنیا میں بھی انسان کو اس کے کوٹک جلاتا ہے، اسے معافی مانگنے اور توبہ کرنے کا پتھر دی ہے نہ ممدی کی طرف لوٹنے کا موعن دیتا ہے، وہ مہربان بھی ہے اور غور الٰہی بھی۔“ انہوں نے مازہ کے ہاتھ پکڑ کر

اسے جھنجھوڑا۔ ”وہ اللہ کی بخشی مخلوق ہے، تیرے پیسہ کی جتنی ہے، ماں سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کر دیکھی تو نے، ممتا سے فرار حاصل نہ کر، اسے اپنے سینے سے لگا، اللہ تیری باقی سختیاں بھی معاف کر دے گا۔“ اس کے اور اس کے باپ کی طرف لوٹ جا، جا میں نے تجھے دل سے معاف کیا، جا اس بار تجھے میں اپنی رضا سے رخصت کروں گی..... اللہ بھی تجھے آسانیاں عطا فرمائے۔“ وہ کہہ رہی تھیں اور مازہ روئے ہوئے زور زور سے اشات میں سر ہلار رہی تھی۔ چچی جان نے ایک بار پھر اسے سینے سے لگایا تھا۔

مازہ نے ان آنکھوں سے آئینہ کی طرف دیکھا، جو دوگم کھڑی ہے مسترد کیہ رہی تھی۔ مازہ نے اپنے ہاتھ آئینہ کے سامنے جوڑ دیے۔ ایمان کی دولت سے مالا مال اور شکر گزاری کے وصف سے سرشار آئینہ نم آنکھیں پو پھٹتے ہوئے سرکاری تھی۔ اس کا خاموش طبع، سر دمرزاں اور لیے دیے رہنے والا شوہر اس روز خوب یوں تھا اور اس نے اس کے اوصاف کا صاف الفاظ میں اعتراف بھی کیا تھا۔ لا حاصل، حاصل ہو گیا تھا۔

تمہارا میرا تعلق بس ایک لفظ کا ہے  
لغت کے انت میں سنا ہوا  
لفظ ایک لفظ.....  
اس ایک لفظ میں سچائی ہے زمانوں کی  
چلو کہ جس کی لفظ اختیار کریں  
اس ایک لفظ کا رامن نہ داغدار کریں

برسوں بعد مازہ کا دل مازہ کی محبت کے گمان سے نکل کر ایک ناقابل تردید حقیقت کی آنکھوں میں آئینے ڈال کر اعتراف کر رہا تھا اور آئینہ کے دل کا غبار جیسے باہر چھاجوں برقی بارش کے ساتھ بہہ کر صحت رہا تھا۔



## ڈاکٹری کے انتخاب

جسمانی صحت اور اس کی مناسب دیکھ بھال کے لیے پاکیزہ ہمیشہ اکثر فکر مند رہتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر بازاری خنوں اور میک اپ کے ساز و سامان کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں تاکہ شخصیت کی کاغذی تصویر برقرار رہے لیکن عام طور پر ایسے تجربات کا نتیجہ دور دراز سے کے زیاں کے ساتھ اور فکری کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جسم کی فائبرے کے بجائے بگاڑ دھکی ہو جاتا ہے۔

پچھلے دنوں کچھ کا فائدہ کی تلاش میں ایک پرانی ڈاکٹری میرے سامنے تھی جس میں، میں نے 1985ء سے بہت سے کھیلنے والے اور نوٹ کے ہوتے تھے۔ میری سہیلیاں اور لڑنے چلنے والیاں اکثر مجھ سے پوچھتی رہتی ہیں کہ میں خود کو Maintain کرنے کے لیے کیا کرتی ہوں۔ میرے لیے فرد افزا دینا مشکل رہا ہے۔ اب میں نے سوچا کہ سالگرہ نمبر کے ان صفحات کے ذریعے اپنے تجربات پاکیزہ بہنوں تک پہنچا دوں۔ سب سے میرے آؤدود ہیں۔ ایک جوان اور کھردرے کی ماں ہونے کے باوجود میں میک اپ طبعی نہیں کرتی۔ ان ہی آؤدود ترکیبوں پر گامے کے عمل کرتی رہتی ہوں۔ جیسی اور جو کچھ ہوں، سب پاکیزہ بہنوں کے سامنے ہوں۔ ان سب کے فائدے کے لیے میں اپنی ڈاکٹری کے کچھ چیدہ چیدہ نسخے پیش کر رہی ہوں۔

### عذرا رسول

اگر سر میں خشکی ہو تو ہفتے میں دو بار لیوں کا عرق پانی میں ملا کر سر دھوئیں خشکی صاف ہو جائے گی۔

جھل جھل میں لیوں کا رس ڈال کر بالوں میں لگانے سے بال چمک اٹھیں گے۔

جھل لیوں کا عرق کھال کراس کا چھلکا دھیرے دھیرے دھوئیں، کالا پن دور ہو جائے گا ہمیشہ کے بھی نہیں۔

جھل بالوں میں گاجر کا رس تیل کی طرح لگائیں بال جھڑپا بند ہو جائیں گے۔ گاجر کا رس پیٹے سے خوب صورتی میں بھی اضافہ ہوگا۔

جھل ایک کچھ لٹا کر اس اور چند قطرے لیوں کا عرق اچھی طرح ملا لیں۔ اس کو دھیرے دھیرے لیں، چہرہ دھوئیں اور پکنا ہو جائے گا۔ تازہ پانی سے منہ دھو لیں۔

جھل پودے کی پتیوں کو باریک پتوں میں کرس نکال لیں، رات کو سونے سے پہلے عرق کو چہرے پر لگائیں پھر تازہ پانی سے منہ دھو لیں، چہرہ دھوئیں اور پرکش ہو جائے گا۔

جھل چہرے کی جھانک دور کرنے کے لیے سیم کی تازہ پتیوں کو پتوں میں کرس لگائیں۔ مالے کے رس کو مسلسل لگانے سے بھی چہرے کی جھانک دور ہو جاتی ہیں۔

جھل لوکی کے چھلکے میں کو دھیرے دھیرے چہرے پر لیں، چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھے گا۔

جھل ہر اوڑھنا میں کر جلد کے دانوں پر لیں دوانے کاغذ ہو جائیں گے۔

جھل کھیرے کا رس دودھ میں ملا کر چہرے پر لگائے۔ یہ نگ صاف ہو جائے گا۔

جھل چھل انسان کے چہرے پر دودھ رتی کھار پیدا کرتے ہیں جو کوئی میک اپ پیدا نہیں کر سکتا۔ روز مرہ خوراک میں گوشت، پھل اور سبز یا ضرور لیں۔

جھل شہد عرق گلاب اور oatmeal کو ملا کر ماسک تیار کریں اور 15 منٹ کے لیے چہرے پر پھیلا لیں پھر خوب صفائی سے منہ دھو لیں۔ ہفتے میں ایک بار کافی ہے۔

جھل کھیرے کو کدو کی کڑے چہرے پر پھیلا لیں اور 10 منٹ بعد منہ دھو لیں، جھن دور ہو جائے گی۔

جھل بادام کا تیل ہلکا گرم اس طرح کریں کہ بوسلی گرم پانی میں رکھ کر گرم کر لیں، پھلے پھلے چہرے پر مساج کر لیں جب ہو جائے گا۔ ہفتے میں ایک بار بھی کافی ہے۔

جھل خشک بالوں کے لیے اگر ہمندی لگائیں تو اس میں تیل اور اٹھ کے کی زردی ضرور ڈالیں۔ 20 منٹ بعد دھو لیں کڑھک ہو جائے گی۔

جھل خشک جلد کے لیے لیوں کا ماسک اچھا ہے۔ کیوں کہ میٹھ کر کے 15 منٹ لگائیں کہ اس کا تیل جلد میں اچھی طرح جذب ہو جائے۔ ماسک اتار کر سوچا کر نکالیں۔ اس کے علاوہ کپے ہوئے ٹماٹر کے کراس کے ٹکڑے چہرے پر لگائیں۔ 15 منٹ بعد پھلے پھلے کر کر تار لیں ایک کھانے کا بیج گرم شہد ایک بیج لیوں پاناس کا رس چہرے پر پھیلا لیں اور 10 منٹ بعد صاف کر لیں۔ خشک جلد کو ماسک مینے میں ایک بار پتی جلد کو ہفتے میں ایک بار۔ ملی جلی جلد کو دودھ ہفتے میں لگانا چاہیے۔

جھل ہونٹ پھلے اور خوب صورت بنانے کے لیے گلاب کا عرق، پھٹکری، لیوں کا عرق ملا کر رات کو سوتے وقت لگائیں۔

جھل نمک اور سوڈا پانی کا ریوٹ برابر مقدار میں لے کر دانتوں کو برش کریں تو دانت سفید اور چمکدار ہو جائیں گے۔

جھل اگر دانت پہلے ہو جائیں اور دانتوں کی چمک ختم ہو جائے تو لیوں کے پھلے پر کھانے کا سوڈا معمولی سا لگا کر دانتوں پر لیں۔ دانت سفید اور چمکدار ہو جائیں گے۔

جھل آنکھوں کے پھلے دور کرنے کے لیے آؤ باریک پتوں میں لیں اور اس کے پانی کو آنکھوں کے حلقوں پر دن میں پانچ چھ دفعہ لگائیں۔

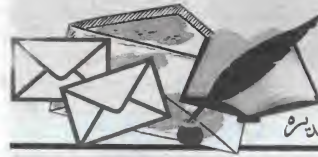
جھل چہرے کے دانوں کو ختم کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ پھٹکری باریک پتوں میں لیں اور فریج میں رکھ دیں۔ دن میں سات دفعہ لگائیں دوانے ایک ہفتے میں ختم ہو جائیں گے۔

جھل دھوپ میں تھوڑا سا میٹھا تیل ڈال کر دھوپ سے آؤ کھٹے پہلے چھ لیں اور نیم گرم پانی سے سر دھو لیں، خشکی ختم ہو جائے گی۔

جھل جلد کی تروتازگی اور برقرار رکھنے کے لیے تو بہت سے طریقے ہیں مگر ماہرین کہتی ہیں کہ ہم انسو اٹھے اور شہد کا ماسک ہے۔ ایک اٹھ کے کی زردی میں ایک بیج شہد شہد اسادودھ اور عرق گلاب ملا کر لیجان کر لیں اور شیش میں بند کر کے رکھ دیں۔ روزانہ ایک بار اس کو جلد پر لگائیں 15 منٹ بعد نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ ماسک کو گورگور نہ اتاریں۔ یہ ماسک جلد کو تروتازہ دھوپ کی اضافہ کرتا ہے اور جلد کے ٹھنڈا اور لچک میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ ماسک لگاتے ہوئے آنکھوں کے پھلے اور پتوں سے بچائیں۔

جھل لیوں کا رس 5 گھنٹہ گرم پانی میں ڈال کر سرد ہونے سے بال گرنا بند ہو جائے ہیں اور ملائم بھی ہو جائے گی۔



[illegible]

## بہنوں کی محفل

دکتر

[illegible]





☆ میرے بہنوئی شاید عالم، کراچی کا کزشتہ دنوں دل کا آپریشن ہوا ہے۔ بھصلِ خدا ان کا آپریشن کامیاب رہا۔ ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار امینہ عندلیب، سلاواہی ان دنوں پھر بیمار ہیں ان کی کلی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شگفتہ ملک، علی پور کے بیٹے مصطفیٰ کمال نے اپنی کلاس میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ (مبارک باد)

## انتقالِ میر ملا

☆ ہماری نامور مصنفہ عطیہ عمر کی ساس انتقال فرمائیں۔

☆ معروف فنکارہ طاہرہ واسطی چل بسیں۔

☆ اکنیزہ کی مستقل قاری منبر نشاط تنسیم صدیقی، انجولی سوسائٹی کراچی انتقال فرمائیں۔

نوٹ: مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کریں اور تین بار سورہٴ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

[illegible][illegible][illegible]

باکیزہ سے پاکیزہ کا رشتہ

فقط لفظ ”رشتہ“ ہی اپنے اندر معانی کا پورا سمندر رکھتا ہے۔ لفظ رشتہ زبان پر آنے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ بندھی لاکھ درد و دُوریں دو رنگ کسی نہ کسی نے بڑے پیار سے تھامی ہوئی ہوتی ہیں۔

اب "رشتہ" کی تشریح کرنے بیٹھ جاؤں تو صفحہات پر صفحہات ختم ہوتے چلے جائیں گے۔ یہاں مجھے خصوصیت سے دوستی کے رشتے کے حوالے سے بات کرنی ہے اور پاکیزہ ڈائجسٹ سے بڑھ کر کوئی دوست ہوگا۔

یہ وہی پاکیزہ ہے جس سے میں نے اپنا رشتہ شعور کی سیر جھوں پر پہلا تھا مگر کبھی ہی جوڑا تھا مگر اس دور میں جبکہ رسالے نو عمروں کے لیے نچر مٹوا رکھے جاتے تھے۔ صرف بڑی بہنوں کے ذریعہ رسالے کو کچا بننے کے باوجود ابھرتے نہ لگاتے تو والدین

کی اجازت تو دور کی بات..... بہنوں سے ملے یہ ہوا کہ صرف چھٹی والے دن ٹھوڑی دیر رسالہ دیکھ لیا کرو وہ بھی صرف پاکیزہ..... یوں پاکیزہ سے پاکیزہ ہی دوستی کا آغاز ہوا اور وہ دوستی مہینوں سے سالوں پر چلی گئی۔ انسان صدیاں نہیں جیتا ورنہ

بہر حال اس سالگرہ پر تحریر لکھنے کی وجہ دو ماہ پہلے آنے والی وہ فون کال بنی جو میری سہیلی نے بعد تک ددو کے بعد میرا

فون نمبر حاصل کر کے مجھے پچیس سال بعد کی۔ ہوا اس طرح کہ میری پہلی نغیبہ جو شتر میں ساں سے پڑاے ای میں قیام پذیر ہے اسے ہماری ایک شتر کو دوست کو خر خریدنے لاکہ district کے سے فون کر کے بتا کر کہ میں نے نہت رضوی جواب

نزہت اصغر ہے، اس کی تصویریں پاکیزہ رسالے میں دیکھی جائیں، اس کا بھرپور مفہوم گروہ "نوفیس" نے اس کا مرتبہ خوشی کی خاطر

رباطہ نے نور کا۔ حال ہی میں دیشان رسول کے حج و عمرہ کی دعوت کی تقریب کا احوال پاکیزہ میں چھپا اس طرح پھر یہ تحریک

شرع ہوئی۔ میرے سیکے کے کمرز تو تبدیل ہو گئے تھے موصوفہ نے دس سالے درجہ کمرز پر رابطہ کر کے ایسے دعوے نکالا اور عزیز قارئین یقین کریں کہ..... گرامر، ہنر کی اس جادوی ایجاد کے باعث ایسا محسوس ہوا کہ پچیس سال کہیں ہوا ہو گئے۔ ایسا

محسوس ہوا کہ ہم آج بھی اسی کالج کے کورڈیٹور میں پھر رہے ہیں اور لفرنگی ٹریس کے پروگرام ہمارے ہیں۔ اور یہ صرف پائیزہ سے رشتے کی بدولت ہی ممکن ہوا۔

چاہا۔

پانچواں مسئلہ اس بارے کے لیے بحث سے کمالات نہ ہوا۔ خوب باتیں ہوئیں۔ بس ناکامی دیکر اس اور بہت سے قارئین کے نیک جذبات اور دعائیں گش کے دوبارہ اجراء کے لیے طے۔ کیونکہ میں مقیم ہماری دوست کوٹ خورشید نے

تے۔ کوثر کا شوہر خود شیعہ محدود ہاں معروف اہل حق اہل سنت ہے۔ اسی طرح یو۔ اے۔ ای کی ایسی فیسیہ نے بتایا کہ خرفیقان

یہ تو ایک دوستانہ ہیں اسی طرح سے جاگیر سے دوستی کا سفر نہ جانے کتنے مسافر ہر ماہ طے کرتے ہیں اور ہزار قوتوں کے انداز جاننے پر، تھیں کو نہ جھنکے کے لیے کھڑے ہیں۔

اس سالگرہ پر پاکیزہ نئے تجدد و دوستی کا بہت خوب صورت تحفہ خود دیا ہے اور میں بھی پاکیزہ کو اپنی تحریر کا یہ مختصر سا تحفہ

ان دعاؤں اور نیک خواہشات سے سنا کر وہ کہہ رہی ہوں کہ یہ رب اسرار، اے اللہ! اس دعا کے ساتھ کہ میں اس طرح کرتی ہوں

صحت کلی عطا ہو، خدا رسول صاحبہ کو تندرستی عطا ہو، اور وہ ہمیں عطا ہوں کہ دوستی کے یہ رشتے سدا قائم رہیں اور جذبہ

حالاہ و ملائکہ نو و شاد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم قدر تہم رہے۔ ہا کہیزہ کے ملائکہ لاکھوں قربان اس غلوں کی ڈھوری میں

مضبوطی سے بندھے رہیں۔

[illegible]













لبے بالوں والیاں اپنی چوٹیاں کاٹ بیٹھیں گی۔ تب بہت ساری خواتین سکون کی سانس لیں گی)

یہ رفیعہ ابدالی، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے ادارے میں آپ کی پُر بہار باتیں پڑھیں واقعی زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ دین کی باتیں پڑھ کر دینی علم میں اضافہ ہوا۔ سلسلے دار ناول سب ہی اچھے ہیں لیکن زندگی سب پر بازی لے گیا۔ راحت و فاقے ناول کی آخری قسط پسند آئی۔ ناولٹ میں کالج سی لڑکی پڑھ کر دل دھک دھک کرنے لگا، یہ قسط بہت ہی خوفناک تھی اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ سیکرٹ فرخ کا ناولٹ دوام زندگی پڑھ کر مزہ آ گیا ان کی فصاحت آموز تحریر بہت خوب صورت تھی۔ سیما یاسین بھٹی کی بو جھ میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ پھولوں کے سوداگر بہت زبردست تحریر تھی۔ اس ماہ کی یہ سب سے بہترین تحریر ہے۔ سراغ زندگی میں زندگی کے سراغ سے آگاہ ہوئے۔ زاہد پروین کا تحفہ ہمارے لیے ایک حسین تحفہ ہے۔ بشری گوندل نے اپنے افسانے بے وطن مسافر میں افغانی مہاجرین کا درست نقشہ کھینچا ہے، اسے پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں۔ کرن احمد نے بھی اچھا لکھا۔ عائشہ خان کے افسانے ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں تاخیر کی وجہ سے اچھی لڑکی باہر کی قسمت سے نکل گئی۔ کفارہ میں شہلا حیات نے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر دیا۔ بہت ہی اچھی اور سبق آموز تحریر تھی۔ بھرم میں نہت جیس فیاض نے نور جہاں کا بھرم خوب رکھا۔ زبردست تحریر تھی۔ بہنوں کی مغل بہت شاندار تھی۔ جس میں ہمیں اپنے دکھ سکھ بیان کر رہی تھیں۔ جلت رنگ پڑھ کر بے حد محظوظ ہوئے، خوش ڈانٹے میں مزے مزے کی کی ڈنڈر تھیں آپنی میں نے گوشت کے حلوے کی ترکیب ارسال کی تھی مگر وہ اب تک شائع نہیں ہوئی کیا آپ کا پسند نہیں آئی ویسے یہ حلوہ بہت لذیذ بنتا ہے۔“ (گڑیا گوشت کے حلوے کی ترکیب شائع کر دیتی تو شاید کچھ لوگ حلوہ بنانا تو کیا کھانا بھی چھوڑ دیتے۔ آج مجھے کر لیے کی برنی کی ترکیب بھی موصول ہوئی۔ ابھی تو ہماری بہت سی بہنوں کو سوچی کا حلوہ بھیج طرح سے بنانا نہیں آتا ایسا کچا سا بناتی ہیں کہ سوچی بھونٹی تک نہیں ہیں۔ سوچی کا ٹکڑیوں کا جھا ہوا حلوہ بنانے کی ترکیب آپ بھیج دیں کہ یہ مجھے سے بھی ہر دفعہ بھیج نہیں بناتا۔ بعض دفعہ فریڈر میں رکھ کر بھایا کرتی ہوں)

یہ سیدہ ہاشمہ، ہارون آباد سے۔ ”پاکیزہ کی سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ اس ماہنامے نے خواتین کی جس طرح نمائندگی کی ہے یہ بات قابلِ داد ہے مجھوں سے گندھا ہوا ہر لفظ کس الف ت ہے۔ آپنی جی میرا پہلا شعری مجموعہ مارچ میں آ رہا ہے آپ کی قیمتی رائے کے لیے آپ کو بھیجوں گی۔“ (بہت بہت مبارک ہو)

یہ سیما ممتاز عباسی، لاڑکانہ سے۔ ”پاکیزہ، پاکیزہ بہنوں کے لیے ایک مکمل تقریبی کتاب ہے جس میں تمام بہنوں کی پسند کا تمام مواد شامل ہوتا ہے لیکن پھر میری میری شکایت ان پر واجب رہتی ہے کہ میں ہر ماہ یا ہندی سے متفرق صفحوں کے لیے کوئی نہ کوئی فریش سی تحریریں بھیجتی ہوں مگر آپ اتنی یا ہندی سے شامل نہیں کرتیں۔ عیرہ احمد جس میں پھر سے محبت کو کشید کر رہی ہیں اور ان کی ہر تحریر میں محبت کا ایک نیازا وہ ہوتا ہے محبت پھر محبت بھی دل سے نہیں جاتی محبت کے ہزاروں رنگ ہیں اس کے جب سے ڈھنگ ہیں محبت کبھی سحر، کبھی دریا، کبھی جلتو کبھی آنسو اور محبت کبھی دعا بنتی ہے یہی عیرہ احمد کا اپنی لازوال تحریروں میں پیغام ہوتا ہے۔ سلسلے دار ناول اپنی روایت کے مطابق سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ خاص کر۔۔۔ ماہید سلطانہ اختر کا زندگی تنگ راتوں میں پڑھنے میں مزہ دیتا ہے۔ ایک نئی دنیاں سا نیو اسٹوری نہیں تھی بلکہ بالکل نئی روایتی انداز میں لکھی تھی۔ شیشوں کا سیخا کوئی نہیں بھی قابلِ ذکر ہے۔ ناولٹ میں کالج سی لڑکی ناولٹ کے فارمیٹ پر لکھی گئی ہے۔ افسانے مجھے بہت پسند آئے جو کہ صفحوں پر اپنا خوشوار دی اینڈ دے جاتے ہیں۔ ان افسانوں میں کفارہ، سراغ زندگی، بو جھ اور بے وطن مسافر بہت پسند آئے۔ ادارے کے ساتھ ساتھ مستقل صفحات پڑھنے کے قابل ہیں جن میں زندگی ہوتی ہے۔“ (پسندیدگی کا شکریہ۔ بعض اچھے مراسلات بھی تاخیر سے ملنے کے سبب شائع ہو جانے سے رہ جاتے ہیں۔ بہار نمبر کے لیے ہمیں بہترین تحریریں بہار نمبر شائع ہونے کے بعد ملیں۔ ڈاک کا نظام خاصا خراب ہے اور اس نظام کی وجہ سے بہنوں کے دل میں ہمارے لیے بدگمانیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں)

یہ غزالد اکرم، پانول، حیدر آباد سے۔ ”میں آپ کی ایک خاموش قاری ہوں لیکن قلم اٹھانے کی جرأت پہلی دفعہ کر رہی ہوں۔ لکھنے لکھنے کا شوق بھی تھا اور لکھا بھی لیکن اس بات کو بھی بہت عرصہ گزر گیا۔ کچھ مجبور یوں اور مصروفیتوں کی بدولت یہ سلسلہ متقطع رہا۔ اب پھر قلم اٹھایا ہے۔ رہی بات پاکیزہ کی تو یقیناً کریں پاکیزہ اپنے نام کی طرح پاکیزہ ہی ہے کہ

اس کا جو معیار پہلے سے چلا رہا ہے آپ نے اس میں اضافہ تو کیا ہے لیکن کہیں سے کسی جگہ کی کچھ اور ترمیم کیا جو صرف ادب میں نہیں یہاں پر سے لگ رہا ہے اس کے لیے آپ لائقِ ستین ہیں اور غدار رسول صدیق کو ڈھروں دعا میں اور پیار کر اللہ ان کے چون ساسی کو صحت کاملہ عافیت دے اور بیٹے کی خوشحال دکھائے، آمین۔" (پندرہ کی کا شکر یہ)

بہرِ فقیر آصف خان، ملتان سے۔ "اربیچ کا یکڑہ اچھا لگا۔ زندگی کے دکھوں پر مسکرا کر مقابلہ کرنا ہی زندگی ہے۔ آپ کی چڑا رہا میں گہوڑی لیے ہوئے تھیں۔ پھر گس کی دھڑکیوں میں اچھے گئے۔ شہر دل کا کردار بھر پور محسوس لیے ہوئے ہے۔ چڑا رہا تان کی جدوجہد کا سلی سلی ہے۔ یو جھنے آئیں کھول دلائیں۔ کاش تھی کچھ جائے۔ زندگی میں شہم کے عمل سے دکھ اور صدمہ ہوا حجاب کا لگنا ہے آزمائشوں سے واسطہ پڑے گا۔ بھلوں کے سوداگر سبق آموز تخریر لگی۔ تھوڑی داری کا درس دے گی، کاچی لڑکی دیکھی سے بھر پور کردار لگتی کا شکر ہے آپ کا یہ انداز اور بعض جتنے جتنور اور کھنکھن ہیں۔ بشری کنول کی ہے وہن مسافر جیادیں اور کھانسی کے مدافقہ رہی۔ ایک کی نیاں تحریف و تہذیب وراثت کی اہمیت کا پتہ ہوئی۔ محبت وطن سے ہو تو ہمارا مان ہو تم کی نیاں محبت پاتی ہیں۔ یکیندہ فرخ کی دوام زندگی اپنی صحت و برداشت سے بڑھ کر روا سے خود کو سمیٹا۔ شادی تو ہے ہی برداشت و بھجوتے کا نام۔ ایک دوسرے کی عبادت کو برداشت کرنا نہ چاہتے ہوئے بھی۔ یکیندہ فرخ کے سمجھانے کا انداز و گوشہ باز آج کل کی نازک امداد رکھیں کے لیے کی، اہمیت سے کم نہیں جو راز داری بات پر مدد پہلائی ہیں۔ عاشق خان نے افسردہ کر دیا۔ کفارہ و بندہ ہی سے خوب لکھا اور دیکھی کوئی محسوس کرتا ہے۔ سیدھا راستہ دکھا کر فریال پر خود کو۔ محرم نہ بہت نہیں نے زبردست لکھا بھی ہوئی انہم اچھے سے بچ گئی۔ بہت مبارک ہو آپ کا اور دیکھا احمد کا بچہ لگا گیا۔ بھوں کی محفل میں محترم عظمیٰ خورشیدی کی آمد بہت پسند کی جا رہی ہے۔ ناغہ نہ کیجئے گا ورنہ جہان لگا دیں گے ہم اللہ پاک آپ کو بہت سارا سکون دے، آمین۔ یہی بھوں نے اچھے شعرے جیسی کیے۔" (شکر یہ)

بھہ جیلین ہاشمی، بمبیرہ سے۔ "مرسالے میں روز افزوں ترقی اور تحفہ غدار رسول اور انعام انصاری وجہ سے ہے۔ اس میں ہر فرد کی طبیعت، حیران اور دیکھی پستی دل، افسانے اور تخریر ہوتی ہے۔ میں نے اس ڈائجسٹ کے ذریعے بہت کچھ سیکھا ہے کہتے ہیں کہ ان پر کوئی کی نہ کسی بھگتہ نہ سیکھتا ہے اور یہ بالکل سچ ہے میں نے آپ انعام سے بہت باتیں سناں ہیں جو میں نہیں جانتی تھی۔ خاص کر جلیقہ داس دل کو خوشگوار موزوں میں بدل دیتا ہے۔ ویل ڈن ایک فرمائش سے میری دل سے جتنی نہیں اس محفل میں شامل ہوتی ہیں تب سے کہ ساتھ ان کی تصویر بھی لگی چاہے اور میں پہلے ابتدا کر رہی ہوں۔ چلو آزاد زندگی ظلو تو کچھ کہتے ہیں میں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ محفل میں جیسے ہیں اور نظر بھی نہ آئیں۔ ایک اور بات یہ ہے کہ صرف جو راز دیکھیں اسی پر تیرہ نہ کریں بلکہ اس محفل میں ہر دوست جو خیالات کا اظہار کرتی ہیں ان کے پوائنٹ کو ٹھٹھ کر کے ان پر بھی تنقید یا تبصرہ کریں، کیا خیال ہے؟" (بھڑو افسانوں کی جگہ میں رہے گی)

بھہ تمیر ہاشمی، بمبیرہ سے۔ "آپ نے میں کا یکڑہ ڈائری اور اپنے آپ کا یکڑہ دل میں جگہ دی۔ ماہدولہ میر ہاشمی کو پورے پاکستان سے تحفہ فرمایا۔ ہمارے دل میں آپ کی عزت اور ہماری رگوں میں اتنی محنت افزائی سے پونے دو کلو خون بڑھ گیا۔ آپ کی اس حوصلہ افزائی پر بہت زیادہ محبت کے ساتھ خواتین کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔" (بالکل نہیں) انجم آلی کا یکڑہ کی جتنی تحریف کریں کم ہیں کیونکہ اس جیسا کوئی ڈائجسٹ نہیں ہے ایک ایسا چراغ ہے جو ہر طرف اپنی روشنی پھیلاتا رہا ہے اور بھلوں کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس کی خوشبوداریاں کے ہر کوئے تک پہنچ چکی ہے۔ اے رب العزت ہمارے دل کا یکڑہ سے وابستہ رہنے کے کلمات رکھنا، آمین۔" (آپ کی دعاؤں کے لیے احسان مند ہوں)

بھہ بھوں کی محفل کا کاشنام ہوا اس لیے اب اجازت دے ادا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایمان کی سلامتی کے ساتھ ہمیشہ خوش و خرم، صحت مند، کامیاب و کامران رکھے اور محفلوں اور حاسدوں کے شر سے محفوظ رکھے، آمین تم آمین۔

دعا کر

آپ کی باہمی

انعام انصاری



انجم انصاری، رفاقت جاوید، غدار رسول، شائستہ نیاز



## شادی پھر شہزادے کی

عظمیٰ آفاق سعید

چھوٹا قاتو کوئی، سے انگریز کہتا قاتو کی پختان۔ سرخ و سفید رنگت، بکری براؤن آنکھوں والا عمیر عاتقوں کا بھی بہت پیارا ہے۔ جو بھی اس سے مل لے اس کا کردیدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ لیجے گا دھیانین عاجزی، تیز اور خوش خلقی اس کی شخصیت کا خاصہ

ایک بہن ہونے کے ناتے مجھے اس پر فخر ہے اور یہ میری تربیت ہادی امی اور آپ کی باہمی اہتمام انصاری مہربان منت ہے۔ یہ ان کی تربیت کا ہی اثر ہے کہ آج ہم چاروں بہن بھائی زندگی میں نہ صرف کامیاب ہیں بلکہ بفضل خدا مطمئن بھی ہیں (ماشا اللہ)

جیسا کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میری شادی آسٹریلیا میں ہوئی تھی جس کی روداد ہادی سعدی ماما نے کیا ہے میں نے شادی میں چونکہ ہم گھر والے شریک نہیں ہو پائے تھے اس لیے ہم نے شادی کے ایک چھٹی سی تھی کر اپنے لاڈلے بھائی کی شادی کے ارمان ہم کمال نہیں کئے تھے مگر ان کا شرا اور احسان کہ وہ وقت بھی آگیا میری سبھی شادی کے نوراً بعد پاکستان آنے کے لیے اپنی اور شہینہ کی بیٹ بک کردی تھیں میں نے اور انی کے لیے کی تیاریاں شروع کر دیں بڑے پیار کر دیئے سے ایک دن پہلے ڈھولکی ہوئی اور دوسرے دن ولیمہ کیونکہ ہمارے ابو مہندی بایوں کی تقریبات کے سخت خلاف ہیں کیونکہ یہ سب خرافات ہیں تو ہم نے ڈھولکی ہی غیبت جانی۔ جن کے بچے بیرون ملک سے گھر آتے ہیں ان گھروں میں یقیناً جشن کا ساہاں ہوتا ہوگا۔ ایسا ہی ہمارے گھر میں ہو رہا تھا۔ گھر میں رنگ روغن کراکری، چادریں، پردے حتی کہ میرا اور شہینہ کے آنے کی خوشی میں امی نے پورے گھر کا فخریچہ منیج کر دیا تھا۔ میرا اپنی پوری حمیہ، ساس (مسر) مشایخ (مسز شیار) کے ساتھ ش فروری کو کراچی پہنچا تو ہمارے گھر میں عید کا ساہاں تھا۔ میرے بڑا بھائی ضیا الرب جو چھ ماہ ساڈن لی گیا تھا اس کو بھی بطور خاص بلوایا گیا تھا۔ وہ میرے آنے سے چار دن پہلے آگیا تھا اور انتظامی سرگرمیوں کا سربراہ تھا۔ انر پورٹ پر میرے دوستوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی، شہینہ

عسیر، تہار باجی، شہناج بھائی کو سب نے استے ہوئے دے دیے جو ان سے سنبھالے نہیں جا رہے تھے اور جب گھر آئے تو امی نے پھولوں کی پتیوں سے روش بونائی تھی جس پر دہن پر گھمتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ اس کا کمر پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ اسے اس استقبال پر سب ہی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

14 فروری کو ڈھولکی کی تقریب بڑے بڑے گھر کی چھت پر اور شی کی کچی کچی کہیں ابھرا راض نہ ہوا جس پر۔ عسیر اور شہینہ بار بار پوچھ رہے تھے کہ کوئی کام ہو تو ہمیں بتائیں۔

میں نے کہا ”بھیا کوئی کام بھی نہیں ہے۔ سارا کام ایونٹ آرگنائزر کر رہی ہیں۔“

اس پر عسیر بولا۔ ”آئی ہم نے اپنی شادی میں سارے کام خود کیے حتی کہ ہول کے جس ہال میں شادی ہوئی تھی وہ دھپ کو جاکر میں اور شہینہ کو ڈیکورینٹ کر کے آئے تھے۔ خوب صورت لاش کی جھالیں تک ہم نے خود لگی تھیں۔“

اس پر میں نے فخر سے لہجہ میں کہا۔ ”کیا ہمارا پاکستان کتنا اچھا ہے۔ جو چاہے وہ حاضر ہو جاتا ہے۔“ تب عسیر کے ساتھ ساتھ شہینہ نے بھی تائید کی۔ رات تو بچے کے بعد سے مہمان آنے شروع ہو گئے جو... صرف عسیر کے دوست تھے۔ محلے کی بچیاں یا گھر میں ٹھہرے ہوئے مہمان۔ ٹیلی سے کوئی اوائٹ نہیں تھا اس کے باوجود 75 کے قریب مہمان موجود تھے۔ ندیم ماموں اور کبیل ماموں اسلام آباد سے آئے تھے۔ دہن شہینہ کی غیر ملکی سبلی ”چی“ کیڈا تو آئے تھی۔ آئی شیخ حسین، ان کی بیٹی نازہ سے حسین کیڈا سے آئی تھیں۔ میری پیاری دوست شازیہ جمال جو ابی کی بیٹی بھی تھی ہوئی ہے اپنی پوری سبلی کے ساتھ موجود تھی۔ پوری چھت پہلے اور گرن شامیانے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ انچ پر خوب صورت لکڑی کا بھولا

تھا جو گیندے اور گلاب سے سجایا گیا تھا۔ دہن نے گرین شرارہ اور چلی شراٹ اور تانی ایڈ ڈائی کا سبز اور پتلا صفیون کے گونے کے کام والا دوپٹا اوڑھا تھا۔ آج دہن کا پورا زور پھولوں کا تھا۔ عسیر بھی گرین کرتے، سفید شلوار میں بہت چچ رہا تھا۔ پہلے میں اور بڑی بھائی ڈاکٹر آرزو و عظیم بھائی کر خوب گانے گاتے رہے۔ بھائی کی آواز بہت اچھی ہے مگر ان کے ساتھ ہادی آواز بھی بہت اچھی طرح نکلتی ہے۔ دہن، دہن دونوں کو ایک ساتھ لایا گیا۔ کرن، راتین، سوئی، اجیہ اور دیگر بچیاں ہاتھوں میں مہندی کے تھال اور شیخ جلا کر ان کے آگے آگے تھیں۔ آج ہم سب نے شرارے پہنے تھے اور ماشا اللہ بہت خوب صورت لگ رہے تھے (آہم) ہمارے بچے ایمان نے ماموں کی شادی کی خوشی میں بڑا اچھا ڈانس کیا اس کا ساتھ ہادی بھی ممتی سی بیٹی کوئی نے بھی دیا۔ آج وہ سرخ رنگ کے شرارے، کرنی کے ساتھ پرانہ ڈال کر چوٹی میں بھی تھیں اور پرانہ ہاتھ میں پکڑ کر خوب گھما بھی رہی تھیں۔ سوئی کے ساتھ میری پیاری بیٹیجیاں کرن اور راتین بھی برابر کی شریک تھیں اور بار بار شہینہ جی پوچھوں کی چٹیاں پھینک رہی تھیں۔ ممتی سی ہانیہ کے ڈانس کو بھی سب نے پسند کیا۔ عسیر کے ڈیر سارے دوست ڈھولکی کی اس تقریب میں نمایاں تھے۔ بچوں کے ڈانس کے بعد جب ان کی باری آئی تو انہوں نے ایسے ہیٹھ ڈالے کہ سب کا ہنسنے پر حال ہو گیا آخر میں انہوں نے عسیر بھائی کو بھی اٹھایا اور جب عسیر نے ڈانس شروع کیا تو ہمارے میاں بی بی قاتق بھی اس میں شامل ہو گئے اور بڑے بھائی عظیم کے ساتھ خدی بھی شامل ہو گئے۔ یہ خیر دوسری بات ہے کہ ہمارے ابو کی کام کا بھانہ کر کے تھوڑی دیر کے لیے دوسرے فلور پر چلے گئے۔ عسیر اور شہینہ کو بھولے پر

بھلا کر سب نے صدقہ ادا کر دیا۔ اس میں ہادی پچھو نہت آئی، یعنی باجی، ویلوفر بھائی، تہار باجی، شازیہ، شیخ آئی، نازہ، جیٹا بھائی، آرزو بھائی، ماما اور دیگر بھائیوں نے حصہ لیا۔ رات گہری ہوئی تھی اور بھوک چمک رہی تھی۔ بیرون سے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی اور سب نے گھر ماموں، کباب، پرائز، پوری، آلو کی ترکاری، بطیم، بروست، ملائی تیک، غیر خوب مزے لے لے کر کھانا کھا لیا یہ ایک چھوٹی سی تقریب خیر و عافیت اور اللہ کے کرم کے ساتھ اہتمام کو پہنچی۔ اس تقریب میں دہن کی سبلی ”چی“ ساڑی پہن کر شریک ہوئی۔ آج کی یہ ساڑی ہادی امی نے اسے گفٹ کی تھی۔ سارا وقت وہ اپنے کمرے سے تصویریں بناتی رہی۔ نئے لوگ، نیا چہرہ اسے بہت بھار تھا۔

دوسرے دن ویسے کی تقریب تھی۔ صبح سے ہی تیاریاں شروع رہیں۔ میں تقریب سے تین دن پہلے ہی اس کے گھر آئی تھی۔ صبح جب میں نے ساڑی لٹائی تو معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ کا پتلی کوٹ گھر پر ہی رہ گیا ہے اور گھر پر کہاں سنبھال کر رکھا ہے۔ وہ دامغ میں نہیں آ رہا تھا۔ جلدی سے فون کر کے اپنے میاں جی یعنی آفاق کو پہنچی کوٹ کی گمشدگی کی اطلاع دی گئی اور ان سے کہا کہ ڈھونڈ کر لائے پر آپ کا انعام الگ دیا جائے گا اور انعام میں بھینڈا راز ش لکھا جائے گا۔ خیر جناب گھبراہٹ اور ریش میں ایک کے بعد ایک چیز ہوتی چلی گئی تھی۔ تین بجے دہن، تہار باجی اور دہن کی سبلی پتی پارلر میں تو ابھی زبردستی ساتھ لے گئیں۔ ہادی امی کو لب اسٹک لگانے کا شوق ہے اور وہ اس کو لگا کر گھمتی ہیں کہ پورا میک اپ کر لیا ہے مگر تہار باجی نے کہا دو لکھا کی اماں مہمان خصوصی ہوا کرتی ہے اس لیے آپ کو ہمارے ساتھ ضرور جانا ہے۔ دہن کا میک اپ امی کی دوست اور وز بیٹی پارلر



دو ہجرت فرحت احسان کی خصوصی توجہ کی وجہ سے ان کی بہترین میک اپ آرٹسٹ ٹانے کیا تھا۔ جو دن کو دیکھ رہا تھا اس میک اپ کی تعریف کر رہا تھا (فرحت آئی بے حد شکر) کہ تمام مردوں میں تھے آج میرے دونوں بیٹے ایمان اور علی نے بھی سوٹ پہنے تھے۔ بڑی بیٹی اجیہ نے فیروز شرت اور فرزا پرہتا تھا جبکہ چوتھی شہزادی کسوٹی آج فیروز بیگم میں تھی۔ امی، ندرت، بھائی، عذرا، پیچو، جمع آئی، میں، نہار بانی اور جی سب ساڑیوں میں تھے۔ جی آج آج کے بعد کاردار ساڑی نہار بانی آسٹریلیا... سے لے کر آئی تھیں۔ ”دکن ٹمپن نے بہت پیارا فیروز کی س گرین اور کولٹن کر کے کافرٹی شرارہ پہنا تھا جو کہ خاص طور پر ڈیزائن کر دیا گیا تھا۔ ٹمپن چونکہ نازک سی ہے تو کوئی اسے بال ڈول کبہر ہا تھا تو کوئی گڑیا۔ غیر بھائی بھی سیاہ سوٹ میں مردانہ وجاہت کا نمونہ دکھائی دے رہے تھے۔ ہمارے میاں آفاق ساری تقریب میں چین چین تھے کیونکہ امی کے اکلوتے داماد ہیں اس لیے بھی امی اور ابو کے ہر دل عزیز ہیں اور آفاق بھی اپنی طرف سے کوشش کرتے ہیں کہ سب ان سے خوش رہیں۔ ابھی سب تصویروں کے سیشن میں ہی مصروف تھے۔ امی، ابو اور دونوں ماموں میرن گارڈن چلے گئے جو علاقے کا سب سے خوب صورت گارڈن تھا۔ امی کو معلوم تھا کہ غیر اور ٹمپن پولیس بیٹے کے ساتھ جائیں گے مگر انہیں اپنے مہمانوں کا خیال تھا اور وہ ان سے پہلے ہال میں موجود تھیں اور یہاں انہوں نے خود سٹیو کیا تھا۔ بیٹا باجے برات کی روٹی پڑھاتے ہیں مگر تم تو اپنے باجے برات کے رکے نہیں تھے تو آج دیکے کی تقریب میں پولیس بیٹے کو بلوایا گیا تھا جو دروازے پر کھڑا ایسی دمن بکیر رہا تھا جس سے

ہماری خوشی کی تائید بھی بلند ہو رہی تھیں۔ ٹمپن چونکہ آسٹریلیا میں ہی پیدا ہوئی ہے اور جہلی مرتبہ پاکستان آئی ہے اس کے لیے سب نیا، دلچسپ اور بے حد مہمست تھا۔ آفاق، عظیم بھائی اور فیاض نے سب مہمانوں کو جلدی جلدی گاڑیوں میں بٹھایا۔ آگے آگے بیٹا باجے والوں کی گاڑی اور پیچھے پیچھے ہم روانہ ہوئے۔ میں، دولہا، دہن کی گاڑی میں تھی۔ ایک بہن کے لیے اس سے بڑا دن ہوتا ہی نہیں ہے جب وہ بھائی کی برات لے کر جاتی ہے۔ آج ہمیں اپنے سارے ارمان کا نکلنے تھے۔ شادی ہال سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ساری گاڑیاں رک گئیں۔ ابھی گئیں۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے اور یہ بات غیر اور ٹمپن کو نہیں بتائی تھی اور اس پر اثر کے انچارج ہمارے میاں جی تھے۔ اب دہن، دولہا کو پھولوں سے سجی چار کوٹھے والی بھی میں سوار کرایا گیا۔ بڑی بھائی ندرت، میں، دہن کی امی، نہار بانی، کسوٹی، رائیں اور دکن اس میں سوار ہو گئے۔ ہمارے آگے اب بیٹا دمن بکیر ہوا چل رہا تھا۔ کبھی خرابیاں خرابیاں چل رہی تھیں۔ باقی گاڑیاں اس کے پیچھے تھیں۔ اس سڑک پر میرن ہائر قطار سے بنے ہوئے ہیں۔

اس شان سے ہماری سواری جاری تھی کہ ٹمپن نے مجھ سے کہا۔ ”عظمیٰ باجی، میں تو اپنے آپ کو پرس محسوس کر رہی ہوں۔“ ہم نے ان میں سوچا۔ ”تم کیا ہم خود اپنے آپ کو مہارانی سمجھ رہے ہیں۔“ اس تمام راہ میر، رشا، نکسی والے، بائیک والے جو اب آگے کی جانب رہے تھے مگر سب کے چہرے ہماری جانب تھے۔ چھوٹی بچیاں سب دیکھنے والوں کو ہاتھ ہلا رہی تھیں۔ کچھ لوگ یہ سمجھ کر شاید یہ

کسی ڈرائے کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ کسی ہال میں آتش بازی ہو رہی ہے مگر دیکھنے والے تو کیا ہم لوگ بھی کبھی سمجھ رہے تھے کہ آتش بازی بھی ہماری جانب سے ہی ہو رہی ہے۔ اسی شب میر کے قریبی دوست عدیل کو لہجہ میں اسی قطار کے ایک ہال میں تھا۔ اس نے جب ہمیں میر کو جانا دیکھا تو وہ اپنے مہمانوں کے استقبال کو چھوڑ کر ہاتھ ملاتا ہوا باہر اچھٹا۔ نہار بانی اپنی شہزادی جیسی بنی کو دیکھ کر بے حد خوش ہو رہی تھیں۔ ندرت بھائی اور میں بھی خوب انجوائے کر رہے تھے۔ ہال کے دروازے پر امی، ابو، اجیہ، بندم، ماموں، سہیل ماموں، شازہ سب انتظار میں کھڑے تھے۔ پورا ہال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ آٹھ سو مہمان مدعو کیے تھے اور ہزار کے قریب مہمان موجود تھے۔ تو کور فرز اور مودی میک بھی کے مزید شائش لینا چاہ رہے تھے۔

امی نے کہا ”بیت دہو ہوگی بے غیر بیٹا اب کو کر آؤ، سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔“ غیر جب ہم سب اندر آئے تو لوگوں کا جم غفیر تھا جو بڑی محبت سے شرکت کرنے آئی تھا اور دولہا، دہن کو دعا میں اور نیک خواہشات کا پیغام بھی لے لیا تھا۔ اس تقریب کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ آسان اب کے بے شمار ستارے اس میں جھلک جھلک کر آئے۔ اس تقریب کی خاص بات یہ بھی تھی کہ آئی عذرا رسول اسے بھائیوں اور بھائیوں کے ساتھ شریک ہوئی تھیں بلکہ ان کی حیثیت میزبان کی تھی۔ وہ تمام راکٹر کے پاس جا کر نہ صرف ان کی خبریں دریافت کر رہی تھیں بلکہ ان سے کھانے پینے کا بھی پوچھ رہی تھیں۔ آج انہوں نے بہت پیارا فیروز بیٹا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ افسانہ نگار اور شاعرہ رفاقت جاوید اپنے شوہر قاضی جاوید کے ہمراہ اسلام آباد سے بطور خاص آئی تھیں اور وہ ساڑی میں تھیں۔ آئی عذرا رسول انہیں

کچن دے رہی تھیں۔ شاعرہ، افسانہ نگار خالدہ جم اپنی بھانجی کے ساتھ آئی تھیں اور عذرا آئی سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عذرا آئی نے امی سے کہا ”اہم، حقیقت تو خاصی موٹی تھیں تو بہت سہل ہو گئیں۔“ جب امی نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ نے انہیں پرکھنے میں دیکھا ہوگا۔“

سیما مناف کا کچھ عرصے پہلے ہی وی کا سوپ ”ٹوٹے ہوئے“، ”ختم ہوا ہے۔“ ان کو دیکھنے کے لیے لڑکیاں بڑی بے چکن تھیں۔ خاص طور پر ہماری بیٹی اجیہ کہ اس کے نام پر ہی انہوں نے اپنی بیرون کا نام اجیہ رکھا تھا۔ رفاقت سران بھی تقریب میں بے حد ان تھیں۔ مہمان خاتین ان کے پاس جا کر ہاتھ ملا رہی تھیں۔

عذرا آئی کے پاس جا کر کب کوئی لڑکی یہ کہتی کہ میں آپ کی فین ہوں تو وہ مسکرا کر کہتیں۔ ”کون سی فین ہو، ملتے فین یا پاک فین؟“ اور پولی بھی عذرا آئی کے ملتے فین مزاح بن کر کہتی ہیں۔ ڈراما کار شاکت عزیز کی بہت پیاری لگ رہی تھیں اور بڑی محبت سے شریک ہوئیں۔ آج کل ان کا سوپ مال اور لگانا آئی ایئر چار ہے۔ نجیت عبداللہ کی کمر میں چمک آئی تھی مگر وہ اپنی ہواور بیٹے کے ساتھ تقریب میں شریک ہوئیں۔ آف وائٹ سوٹ میں بے حد سوبرگ رہی تھیں۔ انتر شاعت امی کی بے حد پرانی پہلی پٹی، ایسی نکلی جو ابی پیار ہوں تو اپتال میں موجودہ امی کی سالگرہ کا دن انہیں یاد، شادی کی سالگرہ کا دن انہیں یاد ہے۔ اب وہ افسانے لکھنے کے بجائے دینی مضامین لکھتی ہیں۔ سیاہ برقع میں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ شیخ زیدی معروف صحافی اور لکھاری ہیں ان کے آنے پر امی کو دلی مسرت ہو رہی تھی۔ نزہت اصغر تو فیروز ٹورٹ ہیں ان کو دیکھ

کرد لی خوش ہوئی۔ رضوانہ منظر، اینلہ عباس اور سزشر کو دیکھ کر امی کے ساتھ ساتھ میری خوشی بھی بڑھ گئی۔ شاعرہ شاکرہ بیکل جاوید تو امی کی تصویر چچی کی رشتے دار نکلی آئیں۔ وہ اس بات پر ناراض ہوئیں کہ آپ نے میرے دینے کے بارے میں تو قہی بتایا ہی نہیں، میں تو سمجھ رہی تھی شاید رائنزی کی کوئی تقریب ہے۔

تب امی نے ہنس کر کہا۔ ”ہاں رائنزی کی تو تقریب ہے، ادب کے ڈھیر سارے چاند آج اس محفل میں آئے ہیں۔“

میرے عرصے بعد بہت ساری رائنزی ایک ساتھ جمع تھیں۔ ساری سیکنڈ فرخ اپنے کزن شوہر کے ساتھ موجود تھیں۔ ڈاکٹر منیر ضیا اپنی بھانجی کے ساتھ آئی تھیں۔ رخ چوہدری اپنی بہنوں کے ساتھ آئیں تو مجھے بہت اچھا لگا۔ یہ امی سے بہت محبت کرتی ہیں اور امی کو بھی رخ چوہدری کی عادات بے حد اچھی لگتی ہیں۔ امی تو انہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی ہیں۔ تیرہ نگار اور شاعرہ رفعت عین رنی اپنی طبیعت خرابی کے باوجود آئیں۔ تیرہ نگار اور میری پڑوسن سرست پرویز کی ٹانگ کا پلاسٹر چند دن پہلے ہی ٹکڑا تھا اور وہ اسٹک کے سہارے موجود تھیں۔ سرست جی، آپ کی بہت ساری اسٹوڈنٹ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھیں۔ شاعرہ پرویز عین زکرا تھنہ اپنی بے حد پیاری ہیر جی جیسی بھو اشٹن اور ہیر جی سے ملنے کے ساتھ آئی تھیں۔ ان کا بیٹا اور بھوجو جیٹل پر جاب کرتے ہیں۔ افسانہ نگار صدف آصف، سماج سیکٹر پر جاب کرتی ہیں اور امی کے گھر کے قریب ہی رہتی ہیں۔ ان کی خوب صورت آنکھوں کی غذا آٹنی سے بہت تعریف کی جس سے وہ بہت خوش ہوئیں۔ تیرہ نگار نرسن زبیر کھارمی اپنے بیٹے کے ساتھ آئی تھیں اور قریب کی سب سے پہلے تعویذ انہوں نے امی کی

فیس بک وال پر ڈالی۔ (شکریہ) سلمیٰ غزل اور شیا انجم سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور بہت اچھی لگیں۔ شاعرہ اور افسانہ نگار طلعت جنیں مہناز تو امی کے اسلام آباد کے اسکول کی ہیں افسانہ نگار سحرہ بیگم اپنی بہن در شہوار کی تقریب چھوڑ کر ہمارے ہاں آئیں۔ تیرہ نگار، افسانہ نگارہ حنا رضوانہ کے فرسٹ کزن کی اس شب شادی کی تقریب تھی، وہ پہلے ہمارے ہاں آئیں مگر کھانے سے پہلے ہی چلی گئیں۔ شاعرہ فرحت جمال کو ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا جو بڑی اچھی لگیں۔ معروف شاعرہ حلقہ شفیق آئیں تو ہر رائنزی سے گلے کٹیں۔ ان کے نام کا اثر ان کی پوری شخصیت پر ہے۔ مختلف بھی ہیں شفیق بھی۔ تیرہ نگار انجم گھڑا بہت دور سے آئی تھیں اس لیے زیادہ دیر تک بائیں۔ امی کے گھر کی میڈ اینیہ بائی زہد صوف اپنی پوری ٹیلی کے ساتھ آئی تھیں بلکہ اپنی دو سہیلیوں کو بھی لے کر آئی تھیں۔ اینیہ بائی، آپ نے سب مہمانوں کا بے حد خیال رکھا۔ شادی میں بھی اور بعد میں بھی، بے حد شکر ہے جیٹل، ہم سے شلک سیارضا آئیں تو قفل پر چھائی گئیں۔ وہ مجھے سلم ہونے کے ساتھ ساتھ حلقہ شفیق لگیں۔ بے حد پیاری عادتوں والی سیارضا سے ہماری ٹیلی کے ذریعہ تعلقات ہیں۔ آنٹی حین حسین، مسودا نکل، نازہ اپنی بھینا اور ان کے والدین کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھیں۔ رائنزی سے جا کر وہ خود ملیں۔ شکر ہونے کے سبب آنٹی خاصی کمزور سی ہو گئی ہیں مگر ان کا حافظہ اتنا شاندار ہے کہ جو تحریر، انٹرویو وہ پڑھ لیں وہ انہیں منظر پر راقی ہے اور بعض دفعہ ایسی باتیں کر جاتی ہیں کہ لکھنے والا بھی ان کا سن سنا کر رہ جاتا ہے کہ یہ میں نے کب لکھا تھا۔ آنٹی ان دنوں اپنی ٹیلی کے ساتھ لاہور گئی ہوئی ہیں۔

ہائین رشید امی سے بہت چھوٹی ہیں مگر امی کی بہت اچھی دوست ہیں۔ یہ کراچی کی معروف فیشن ڈیزائنر

ہیں۔ اس تقریب میں اپنے بھانجوں کے ساتھ آئی تھیں۔ شائستہ اعجاز بے عذرا آنٹی کی بچپن کی ٹیلی ہیں (ہائین رشید کی طرح) شائستہ آنٹی ان دنوں اپنی پیاری بیٹی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہیں مگر دوا، دکن کو دوا دینے کے لیے موجود تھیں۔ آنٹی رضوانہ پرس تو ہمارے گھر اس وقت سے آ رہی ہیں جب میری شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ بے حد بننے بنانے والی بلکہ جہاں چلی جائیں قہقہوں کے پھول پھیرنے والی شخصیت ہیں۔ امی کو اپنا کر دیکھا کرتی ہیں۔ آنٹی کی تقریب میں وہ بے حد خوب صورت دکھائی دے رہی تھیں۔

سیامانف امی سے کہہ رہی تھیں۔ ”انجم، بہنوں کی محفل میں تمہارے طویل جوابات بڑھ کر بے حلف آتا ہے۔ تم بڑے جواب دی کادو“

امی نے کہا۔ ”پھر خلک شاخ ہو گے۔“ اس پر سیامانف نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں مگر ہمیں تمہارے طویل جوابات میں مزہ آتا ہے۔“ ڈاکٹر شہلا عامر، گورنر کراچی عشرت العباد کی بھانج ہیں۔ وہ اپنی نند کے ساتھ اس تقریب میں شریک ہوئیں۔ شہلا عامر یا کیزہ کی تیرہ نگار بعض پیش پہلے امی کی فین تھیں اور انہوں نے ہی بہنوں کی محفل کو یا کیزہ کی فیس بک کا نام دیا جسے تمام بہنوں نے پسند کیا۔ پروفیسر قمر جہاں خلیل بہت دور سے آئی تھیں۔ امی نے ان کی دوستی جب ہوئی تھی جب میرا کالج میں ایڈمیشن ہوا تھا اور وہ دوستی آج تک برقرار ہے۔ ان کے پوتے، میرے بچوں کے کلاس فیلوز ہیں اور ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے ہیں۔ پروفیسر قمر جہاں خلیل یا کیزہ کی اچھی تیرہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی کالم نگار بھی ہیں۔ شیا انجم اچھی افسانہ نگار ہیں۔ امی سے ان کی ملاقات اس تقریب میں پہلی مرتبہ ہوئی۔ اس تقریب کو سعادت بخشے کے

لیے جہاں بہت آٹنی آئیں، وہ امی سے اتنی محبت کرتی ہیں کراچی کو ہر وقت دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں وہاں سا جازہ اودہ ابوالسود و سرور احمد بھی اپنی ٹیلی کے ساتھ موجود تھے۔ ان کو ہیر دنی ملک سے لوگ اپنے ہاں بلانا سعادت سمجھا کرتے ہیں مگر یہ ہمارے ابو کے قریبی دوست سید مظفر علی کے داماد ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے ہاں آئے تھے۔ معروف شاعرہ اور محفلہ کھور سلطانہ نے بھی شرکت کرنی تھی مگر وہ آتہ نہیں۔ ار جند لعل بھی یا کیزہ کی بھئی افسانہ نگار ہیں مگر بہت اچھی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر بہت اچھا لگا۔ میری بڑی بھائی جنہیں ہم گھر میں نہرت کے نام سے پکارتے ہیں سب مہمانوں سے مل رہی تھیں کہ ہم نے دیکھ لیا تھا امی اپنی رائنزی کے حلقے سے باہر نہیں نکلتی رہی ہیں اس لیے میں اور نندت ہر مہمان سے جا کر مل رہے تھے۔ آج کی اس تقریب میں میری پوری سرال کا بچہ بچہ بونا بونا شریک تھا (ماشا اللہ) دینی، وانی، خاندانبر کو چھوڑ کر میری ساری نندیں دیوید، جیٹل اپنی ٹیلی کے ساتھ موجود تھے۔ یا کیزہ کی تیرہ نگار اور اس سے چھلکے امی کی دوست اور سہو بہن امی، اور میری ضیا ساس سز زہمت اشفاق اپنی طبیعت خرابی کے باوجود بھی بائیں اور اشفاق انکل کے ساتھ موجود تھیں۔ زہمت خالہ، عذرا آنٹی کی زبردست فین ہیں۔ ان کے ہاں میلاد میں بھی امی کے ساتھ جا چکی ہیں اور آج بھی انہوں نے عذرا آنٹی سے خوب باتیں کیں۔ امی کی چچی منسو تیرہ استقبال جو چچی سے زیادہ امی کی ٹیلی ہیں وہ بھی تمام رائنزی سے ملیں۔ عذرا آنٹی، رفعت سراج، سیامانف، رخ چوہدری اور نکبت عبداللہ سے مل کر بے حد شہر شادی کیں۔ اس سے بیٹے سید فاران بخاری جو باجوہ یونٹس میں پروفیسر ہیں ان کی اسٹوڈنٹس نے انہیں گھیرے چدے رکھا تھا۔



ہمارے رشتے داروں کی ایک بڑی تعداد غمگین ہے پاس جا کر چل چل رہی تھی۔ اکثر اس سے انگریزی میں باتیں کر رہے تھے مگر وہ سب کی باتوں کا جواب اردو میں دے رہی تھی۔ ہاں انگریزی صرف شہینہ کی کھلکی چچی سے بولی پڑی۔ وہ تقریب کے بعد 15 دن ای کے ہاں رہ کر گئی، گھر میں کام کرنے والیاں بھی اس سے انگریزی میں بات کرنے لگی تھیں۔ شہینہ کے ابو ڈاکٹر خجوع چونکہ کراچی اور اسلام آباد میں رہ چکے ہیں تو ان کی اردو تو بہت صاف ہے۔ نہار بائی (سز خجوع) انگریزی تو فراٹے سے بولتی ہیں مگر اردو بھی اچھی خاصی بولی لیتی ہیں مگر شہینہ کی اردو اس سے زیادہ اچھی ہے۔ اس تقریب میں امی کو ڈاکٹر ذکیہ بگاری کا انتظار آخری وقت تک رہا مگر وہ اپنی طبیعت خرابی کے باعث نہیں آئیں۔ تیسرہ ڈکار ذکیہ ایوب بے حد محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ ان کی حال ہی میں عدت ختم ہوئی تھی اور انہیں اپنے دوسرے بیٹے کے پاس لاہور بھی جانا تھا مگر تیسرے ویسکے بیٹے سے لاہور بعد میں گئیں۔ ذکیہ آٹنی بے حد شکر ہے اس محبت کا.....! رمضان اگلے سب سے آخر میں آئے اور آخر

میں گھر والوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ بہت ساری بہنوں کو ای بلا نہیں پائیں جس کا امی کے ساتھ مجھے بھی افسوس رہا۔ جن میں بی بی وی کی پروڈیوسر نسیم اسلم، شاعرہ زہرہ جنید، افسانہ نگار مہناز عرفان، افسانہ نگار حامد فاطمہ حسین کا تو مومناں ہی بننا تھا۔ جیل ہم سے وابستہ سارہ غلام نبی اپنی ذاتی مصروفیت کے باعث انہیں سکیں۔ امی طرح امی کی بے حد پیاری دوست افسانہ نگار غزالہ رشید اپنی طبیعت خرابی کے باعث شرکت نہیں کر سکیں۔ شادی ہال بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ دو بڑی اسکرین لگائی تھیں جن میں عمیر اور شہینہ کی منگنی

شادی اور ایک دن پہلے ہونے والی ڈھولکی کی تصویریں چل رہی تھیں۔ آسٹریلیا سے جو مہمان نہیں آ سکے تھے وہ بھی اس تقریب کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ خصوصاً جگنو ماموں، سعیدہ مامی اور پیاری سی راجہ۔ میری فرسٹ کزن ندانویدا ان دنوں زندگی میں بھی اس کے ایک پیاری سی بیٹی ہوئی ہے وہ نہیں آ سکی تھی اور نایدہ ممانی بھی نہیں آئی تھیں۔ نادرہ ممانی ان دنوں امریکا میں ہیں ان کی بھی کسی سب سے محسوس تھی۔ چچا ماموں، زینا ممانی، آمنہ چچو کی بھی کمی ہے ان محسوس کی تھی مگر امریکا سے آنا کوئی اتنا آسان کام نہیں ہوا کرتا ہے۔ ہماری امی، ابو کی نشاط مامی ان دنوں بیمار ہیں اور اسپتال میں ایڈمیٹ ہیں۔ اس لیے وہ نہیں آ سکی تھیں۔

میری کان فریڈ ناز جب اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی تو میری خوشیاں جیسے بڑھ گئیں اور اس وقت میں اسنے آپ کا کالج کرل محسوس کرنے لگی۔ میں شکر ہے ادا کرتا چاہوں گی اپنی پیاری دوست شازینہ جمال کا جو امی کی بیٹی بھی ہیں، امی کی پردوں میں بھی اور ہم ان کو گھر میں ڈاکٹر شازینہ کے نام سے پکارتے ہیں کہ دواؤں کے نام انہیں ازبر ہوتے ہیں۔ یہ پاکستان کے بے حد معروف سرجن ڈاکٹر جمال الدین کی بیٹی ہیں۔ شازینہ پوری تقریب میں ایسے ہی شامل تھیں جیسے میں اور ندرت۔ ان کی پیاری سی بیٹی ماموڑا میرے عمیر ماموں کی شادی میں، ننھی خوش بھی چھپے کہ اجیب کی سہیلیاں اس تقریب میں افواہیں تھیں، امی طرح ماموڑا نے بھی اپنی خاصیت سن سہیلیوں کو بلا یا تھا کہ شازینہ کے بچے ہمارے بھائیوں کو ماموں ہی کہتے ہیں۔ ٹھوڑی دیر بعد ڈر مشرور ہو گیا جس میں چمن برائی، منٹن بادامی، تورمہ، چکن بروسٹ، مینٹی سو سے، سب کباب، ہا جہر کا طلوہ، کشمیری چائے اور کولڈ ڈرنک وغیرہ شامل تھیں۔ امی اور ابو

دونوں کا بھی حلقہ کافی وسیع ہے اس لیے جس کو بھی بلا یا گیا وہ سب ہی آئے۔ سب لوگ کھ رہے تھے کہ یہ تو شادی پکس ویسہ ہو رہا ہے۔ ایسا لگ ہی نہیں رہا کہ صرف ویسے ہی آئے ہیں۔ یہ تو برات بھی لگ رہی ہے۔

عذرا آٹنی، آپ کی میزبانی نے میرے دل میں آپ کی محبت کی ایک قدیل کی روئ کر دی ہے اور انشاء اللہ یہ بھی ذیشان کی شادی میں میزبان کی حیثیت سے شریک ہوں گی۔ ذیشان ہمارے عیسے دو ڈھائی سال ہی تو چھوٹا ہے۔ اس لیے آپ بھی اس کی برات کے بارے میں سوچنا شروع کر دیں (اللہ وہ وقت جلد لائے) اس تقریب کی اداس بات یہ تھی کہ اس میں ہماری بی بی اپنی طبیعت کی خرابی کے باعث شریک نہیں ہو سکی تھیں اور سب کو ان کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ اللہ ان کو صحت اور زندگی عطا فرمائے، آمین۔ عمیر اور شہینہ پر اللہ اپنا کرم رکھے اور انہیں شاد و آوارہ رکھے۔ بفضل خدا بہت پیاری جوڑی ہے اور بہت محبت کرنے والی بھی۔ میرے بھائی ضیا کے لیے بھی ایک پیاری سی دلن جلدی مل جائے تو میں ان محبت پر آپ کے لیے اس کی شادی کا احوال قلم بند کروں گا۔ خیرا نا عمر پورہ، پر محبت اور پُرووق ویسہ لوگوں کو اتنی جلدی نہیں بھولے گا۔ جس کا ہر مہمان ہم سب کے لیے مہمان خصوصی کا درجہ رکھتا تھا۔ اس تقریب کی تصاویر جس میں سرونی کی تصویر بھی شامل ہے۔ حنا فوٹو اسٹوڈیو کی جانب سے لی گئیں۔ سیل نمبر ارشد جمال 0300.2248374

ایک ستاروں بھری تقریب

شعائلہ سہیل جاوید

ہال اگر چہ کچھ بچا ہوا تھا۔ ہر طرف خوشبوؤں کا سیلاب اور رنگ برنگ لباسات کی بہار تھی اور سب سے زیادہ مرکز نگاہ وہ ٹیبل تھی جس پر

آسانی ادب کے درخشاں ستارے جگمگ رہے تھے۔ سب سے چمکا جانے والا عذرا آٹنی تھیں۔ وہ تو بین ہی سدا بہار، ہر فورہ چہرہ۔ ان سے مل کر معراج صاحب کی طبیعت کے بارے میں جان کر دل ملی ہوئی۔ اللہ انہیں سدا سہاگن رکھے۔

سعیدہ رکمن بھی بے حد پیاری لگ رہی تھیں۔ سیما مناف، شائستہ اور رقتہ مرزا سب بے حد گرم جوشی سے ملیں۔ میری بیٹی بھی میرے ہمراہ تھی جب رقتہ معراج سے ملایا تو اسے تو قیظین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سادی سی خوش اخلاق خاتون رقتہ معراج ہیں اور دل وہاں دلیز کے باری کی خالق۔ کافی دیر تک تو حیران ہی رہی۔ بگت عبد اللہ، رضوانہ پرنس، رخ چوہدری صاحبہ، علقہ شفیق، نایدہ چوہدری، زہبت اصغر اور بھی دیگر نامور ہستیاں جن میں ذرا برابر بھی غرور نہ کہ شائبہ تک نہیں تھا۔ سب سہیلیوں کی طرح گفتگو، چٹختے اور سدا بے حد چمک رہی تھیں۔

اور بھی بہت سی رانگڑ تھیں جنہیں دور دور سے دیکھا مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ کھانا بے حد شاندار تھا۔ اپنے لوگوں کا انتظام اور کھرب کو فرما دیا پوچھنا بہت بڑی ذمہ داری ہے لیکن سب کام احسن طریقے سے ہو گئے۔ حیران کن بات یہ بھی تھی کہ اس تقریب کے سووی میکر حنا فوٹو اسٹوڈیو کی ٹیبل بھی پکیزہ کی فین تھی۔

مہمانوں کی گرجوشی جہاں ان کی محبت کا اظہار تھا وہاں دوا بھی تمام حاضرین سے بڑے اچھے طریقے سے مل رہے تھے۔ سب کا انہوں نے شہزادہ کیا۔ عمیر کی یہ پوری خوشحالی کہ وہ ہر مہمان کے پاس خود جائے۔ (ماشاء اللہ)

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس جوڑے کو ساری خوشیاں عطا فرمائے اور انہیں اپنے والدین کے لیے صدقہ جاریہ بنادے۔ (آمین)



میں اور شفیق یہ خوب صورت تقریب انیڈ کرنے کے لیے وقت مقررہ پر موجود تھے۔ سامنے ہی انجمن انصار باجی کھڑی تھیں۔ کالی خوب صورت کا مدار سازی میں بیشک کی طرح بے حد گریس نل اور ہر وقار لگ رہی تھیں۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ انجمن باجی بے حد منشار ہیں جو ایک بار بات کر لے وہ کرویدہ ہو جاتا ہے اور جوان سے ایک باہل لے تو پھر وہ ان کو بھول نہیں سکتا۔ عمیر کے ویسے میں لکھاریوں کا ماشا اللہ بے غیر موجود تھا۔ جن میں سے بیشتر کے سیریل، ٹیٹا فلز اور ڈرامے کی ناکسی دی جینٹل پر چل رہے ہیں یا پلنے والے ہیں۔ مدتوں کے بعد اتنی اچھی شادی انیڈ کر کے بے حد حلف پایا۔

رضوانہ پرنس، عذرا رسول اور ان کی بھابیوں کے ساتھ آئی تھیں۔ عذرا رسول بے حد چرچی تھیں۔ رضوانہ اب کج قامت و حارثی تھیں۔ عطیٰ آفاق، اجیہ آفاق، آرزو عظیم ہر ایک بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ ہمارے برابر میں شائستہ عزیز اور سیما مناف تھیں جن سے تمام وقت دلچسپ گفتگو رہی۔ درخ چوہدری اور تاجید چوہدری کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھیں لیکن دل سے نزدیک تھیں۔ رفعت سراج ایک زبردست رائٹر ہیں ہی اس کے ساتھ بونی بھی بہت اچھا ہیں۔ شمس حسین سے چلتے چلتے ملاقات ہوئی تب وہ کہنے لگیں کہ ارے، آپ ہیں شگفتہ شفیق۔ آپ کینیڈا آئی تھیں تو ہمارا اہل نمبر کیوں نہیں لے کر گئی تھیں۔ بہت اچھا لگا۔ اگسٹاری وہاں بھی ملاقات ہوئی۔ عقیلہ حق اور فرحت جمال سے بھی ملاقات رہی۔

رائج باریک بڑی اہلی سی ڈی پر عمیر کی شادی کی مودی چل رہی تھی۔ ہال کی سجاوٹ قابل ویدیو۔

کھانے کا مینیجر زبردست اور ذائقہ بہترین تھا۔ وہ ساں بہت ہی پیارا لگا جب دولہا واپس اور واپس کی سہیلیاں بیٹھا بے کے ساتھ پنڈال میں آئے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے اور انجمن باجی کو ان کی خوشیاں دکھائے۔ (آمین) دولہا اور واپس دونوں بہت نیک اور پیارے لگ رہے تھے۔

## مزہ آیا

### رفاعت جاوید

میر ضروری کراچی آتا بھی کئی ماہ سے مل رہا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ انجمن انصار کے بیٹے کے ویسے میں شرکت کرنے جاتا ہے۔ اگر پہلے ہو آتی تو اتنی جلدی دوبارہ کراچی شاید نہ جانا پڑا۔ انجمن سے میری ملاقات اسلام آباد میں کی بار ہو چکی تھی۔ اور اب مجھے اس شادی میں جانا تھا جہاں بہت ساری مصنفات نے آنا تھا اور مجھے سب سے ملنے کی خواہش تھی۔

15 فروری کی شب میں ایک جگہ گاتے ہوئے میرج کارڈن میں موجود تھی۔ میرے ساتھ میرے شوہر بھی تھے۔ یہ ایک پرہیزگار تقریب تھی۔ انجمن انصار کو پہلی مرتبہ میک اپس دکھانے والی شیون کی کامیابی... ساڑی اور لائٹ میک اپ میں وہ مجھے بہت اچھی لگیں۔ پھر میں نے مصنفات کو دیکھا، سب سے جا کر خود لکھ مجھ سے آخر خود ملنے والی شخصیت عذرا رسول کی تھی۔ وہ مجھ اس محفل کی بیڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ رائٹر کو کھانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ ایک ایسی ڈنٹے دار مہمان تھیں اسے پہنے مہمانوں کا خصوصی خیال ہو۔ میرے شوہر نے ان راہ مذاق ان سے کہا میں کہ ہم تو انجمن انصار کے مہمان ہیں تو انہوں نے کہا یہ میری اپنی تقریب ہے اور میں واقعی میزبان ہوں۔ یہ سب دیکھ کر مجھے بے حد اچھا لگا کہ پاکیزہ واقعی ایک ایسا ادارہ

ہے جہاں کا ہر فرد ایک دوسرے کا خیال رکھتا ہے۔ ایک دوسرے سے محبتیں جتنی جہاں دکھائے اور بناوٹ کا ناگوار تنک نہیں ہے۔

مجھے وہاں سکین فرخ، سعدیہ بیگم، شگفتہ شفیق، نگت عبد اللہ اور سیما مناف سے مل کر بہت اچھا لگا۔ بعض مصنفات مجھے کتنی ہی بھی لگیں مگر میں نے ہر ایک سے خود بات چیت کی۔ دولہا عمیر اور واپس غنیمت بھی بہت اچھے لگے۔ زیادہ تر شادیوں میں اور اس وقت دولہا نظر آیا کرتے ہیں کہ اسے مسائل سے نہت نکلی بھی ہے۔ ایسے میں جوان لڑکے کی شادی دیکھ کر اچھی بھی ملتی اور خوش بھی ہوتی۔ شبنم کے والد اور امارت سی شبنم کی امی سے بھی ملی۔ ماشا اللہ تعلیم یافتہ فیملی ہے۔ جوانی بیٹی کے شاندار دیر ہے بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ کراچی قیام کے دوران میری دیگر مصروفیات بھی تھیں۔ مگر انجمن تمہارے بیٹے کی شادی میں جا کر مجھے واقعی مزہ آیا اور سکین فرخ اور عذرا رسول سے مل کر اچھا لگا۔

### رائٹرز کے دیدار کے لیے

### ستارہ شیخ

پہلے ہمارے بچے میں شادیوں کا سلسلہ چلا اور پھر سسرال میں شادیوں کا سیزن گزرا۔ اور میں سمجھنے دولہاؤں کو دیکھ کر دل برداشتہ ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کئی عرواے دولہا۔ دیکھ کر کچھ کھٹک گئی۔ کم عمر جو دولہا تھا وہ بھی 32 سال کے کم کا نہ تھا اور لگتا وہ 36 کا تھا۔ ایک دن تو میں نے اسے میاں سے لے کر دیا تھا کہ اگر کم عمر لڑکی کی شادی ہو چکی ہے تو کم عمر لڑکی کی شادی کیوں نہیں ہوا کرتیں۔ جس کا جواب ان کے پاس یہ تھا کہ ایسا فلوں میں ہوتا ہے۔ لڑکیوں پر ڈنٹے دیاں ہیں بہت ہوتی ہیں۔ اگر وہ شادی جلدی کر کے بیٹھ جائیں تو کھر کے

کام کیسے ہوں گے..... اور جب ہم انجمن باجی کے بیٹے عمیر کے ویسے میں گئے تو ایسا خوب صورت اور کم عمر دولہا دیکھا کہ دل خوش ہو گیا۔ میں پاکیزہ کی مستقل قاری بھی ہوں کبھی کبھار پاکیزہ میں تبصرہ بھی شائع ہو جاتا ہے۔ مجھے سب معلوم ہوا کہ عمیر کا ولیمہ ہونے والا ہے تو رائٹرز کے دیدار کے لیے میں نے باجی سے ریکویسٹ کی کہ آپ مجھے بھی اپنے ہاں مدعو کر لیں۔ انجمن باجی نے ہاں بھی بھری۔ میں جب ہاں میں داخل ہونے والی ہی تھی اس وقت دولہا واپس بیٹھ گئے تھے۔ عطیٰ آفاق نے بڑی خوب صورت ساڑی پہنی تھی اور واقعی دلہا کی بہن لگ رہی تھیں۔ میں رفعت سراج، شبنم عبد اللہ سیما مناف سے ملی۔ عذرا رسول کو قد سے قریب سے دیکھا۔ ان کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی کہ کراچیوں نے پوچھ لیا کہ کتنے کون ہوتے ہیں کیا جواب دوں گی اور کھر آکر اسوس بھی ہوا کہ میں نے ان سے بات کیوں نہیں کی۔ انجمن باجی آپ کے مہمان اتنے پیارے پیارے سے تھے کہ مجھے تو ایسا ہی لگا کہ ہر مصنف اس تقریب میں موجود ہے۔ میں نے شمس حسین کو پہچان لیا تھا..... میں نے ان کو کاجا کسلاام کیا مگر وہ اپنی باتوں میں شاید اتنی مصروف تھیں کہ انہوں نے میری جانب نہیں دیکھا۔ انجمن باجی ایک سیاہ کا مدار سازی میں بے حد سوہری لگ رہی تھیں۔ ایسی شاندار تقریب میں نے تو شاید پہلی مرتبہ ہی دیکھی تھی جس میں بے شمار لوگ تھے۔ سیما رضا کو میں اس لیے پہچان گئی کہ وہ بی بی ہفتا میں کیا کرتی تھیں۔ افسوس صرف یہی رہا کہ میں آٹو گرافیک لے جانا بھول گئی تھی۔ سیما رضا، رفعت سراج، سیما مناف، عذرا رسول اور دیگر رائٹرز سے دیکھو کب ملاقات ہو پاتی ہے۔



نہیں تھا تو اپنے بندے کی کفایت و کفالت کا میں دتے رہا ہوں۔“

مرسلہ: تاہم بدت نور، واہ سینٹ درکس

## اللہ کا خوف

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں دو خوف یا دو تحفظ کسی ایک بندے میں جمع نہ کروں گا یعنی اگر کوئی بندہ یا میں مجھ سے ڈرتا ہے گا تو میں قیامت کے دن اسے محفوظ رکھوں گا اور اگر کسی نے دنیا میں خوف نہ کیا تو قیامت کے دن اسے جلائے خوف رکھا جائے گا۔ نیز ارشاد فرمایا جو حق تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس سے ساری دنیا ڈرتی ہے اور جو اللہ سے نہیں ڈرتا وہ ہر شے سے خائف رہتا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تم میں سے جو خائف ترین ہے وہی عاقل ترین ہے اور فرمایا جو خوف خدا سے دوزخ کی آگ اس کے قریب نہیں جاسکتی۔“

مرسلہ: انیلا تاہم، لیلہ

## غلاف یعنی پردہ

کعبہ پر غلاف اس لیے ہے کہ ہٹا چلے یہ کوئی عام گھر نہیں اللہ کا گھر ہے۔ قرآن پر غلاف اس لیے ہے کہ ہٹا چلے یہ کوئی عام کتاب نہیں بلکہ اللہ کی کتاب ہے۔ اسی طرح مسلمان عورت کو پردے کا حکم ہے تاکہ ہٹا چلے یہ کوئی عام عورت نہیں ایک مسلمان عورت ہے۔ انہی نظروں کو کھڑا کر چلا کر دے مومنوتا کہ ہٹا چلے یہ کوئی عام شخص نہیں بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی جا رہا ہے، بھان اللہ!

مرسلہ: قمرش الحق، جنگ صحر

## پیاری باتیں

حضرت بی بی فاطمہ زہراؓ کا قول ہے۔ ”جب ایک عورت گھر میں کام اور بچوں کی تربیت کرتی ہوئی



## پاکستان ذہن اور عقلی مذاق سعید

## حمد باری تعالیٰ

خالق کائنات ہے مالک دو جہاں ہے تو میری زمیں بھی ہے تو ہی اور میرا آسمان ہے تو جلوہ نما ہے تیری ذات وہ دو مہکاں کہ لامکاں تیرا کرم محیط ہے ہر سو جہاں، جہاں ہے تو مانگے بغیر دے دیا دوسرے کو کیا بنا دیا شکر تیرا ادا کروں دل میں مرے نہاں ہے تو مجھ تیرا نہ پائے عقل و خود کسی طرح آکھ کہے کہاں ہے تو دل یہ کہے یہاں ہے تو کن ہی سے کائنات کو کیا کیا مخر عطا کیے مدح کریں شجر حجر، خالق این و آن ہے تو شاعر ذہن غزل

## نعت رسول ﷺ

خدا نے میری دلجوئی کا کچھ ایسا سبب رکھا نبی کی یاد میں دل کو ہمیشہ مضطرب رکھا انہی کی یاد میں قلب و نظر فکر و زبان ڈوبے انہی کا تذکرہ ہونوں نے اکثر روز و شب و یحیا خدا کا عشق اور اس کے نبی کا عشق مل جائے فقط اس کے سوا ہم نے کوئی احساس کب رکھا خدا اپنی جگہ پر ہے نبی اپنی جگہ پر ہیں ابوبے جب جسے لکھا تو پھر پاس ادب رکھا وہ نام کا جب آیا کہیں ہونوں ہے ہو یا رب

## مسلمانوں کی آبرو کا حق

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”جو شخص کسی مسلمان کو ایسے موقع پر ذلیل دے آبرو کرے گا جہاں اس کی چمک ہو یا اس کی عزت میں کچھ کی آئے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسے مقام میں ذلیل و بے آبرو کرے گا جہاں وہ اللہ کی مدد کا طلب گار ہوگا اور جو شخص کسی ایسی جگہ کسی مسلمان کی مدد کرے گا جہاں اس کی بے عزتی اور چمک ہوئی ہو تو اللہ ایسے مقام پر اس کی مدد کرے گا جہاں اسے اللہ کی مدد درکار ہوگی۔“

(سنن ابوداؤد)

مرسلہ: سعید یہ سلیم، مہدنی

## مسکین کا حق

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس نے میری مخلوق میں سے کسی ایسے کم زور کے ساتھ بھلائی کی جس کا کوئی کفایت (کفالت) کرنے والا



## میرا انتخاب

آمنہ حماد

شاکر کی سالگرہ بھی اس ایک لمحے کی یاد میں لکھی گئی  
اک خوب صورت نظم ہے۔ ارم کا انتخاب کراچی سے۔  
سالگرہ

محبت شاعری کی اساس ہے اور شاعر محبت کے  
پیامبر ہیں..... شاعر ان پیغامات کو خوب صورت  
لفظوں میں پرو کر غزل کے سانچے میں ڈھالتے ہیں  
مگر محبت اندھیروں اور بربادیوں کی ناہریاں دہلوی  
ہے جس کی زد میں آنے والے زندہ تو رہتے ہیں مگر  
تاعمر دل و جان کا نشان نہیں پاتے..... فیض احمد فیض  
کے کلام میں بھی یہ تاثر ملتا ہے جسے فائزہ رحمن نے  
سیالکوٹ سے منتخب کیا ہے۔

آرزو

مجھے مجھڑوں پہ یقین نہیں  
مگر آرزو ہے کہ جب تنہا  
مجھے ہر دم ہر سے لے چلے  
تو پھر ایک بار یہ اذان دے  
کہ کدہ سے لوٹ کے آسکوں  
ترے در پہ آ کے صدا کروں  
تجھے غمگسار کی ہو مطلب  
تو ترے حضور میں آروں  
یہ نہ ہو تو سوئے روعدم  
میں پھر ایک بار روانہ ہوں

۱۱۱۱

کچھ مل..... کچھ لمحے زندگی میں امر ہو جاتے  
ہیں۔ اس ایک لمحے کے خیال سے لکھنا بھی چاہیں تو  
آزاد نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس ایک لمحے کی اسیری  
میں ہی زندگی کی خوشیاں پنہاں ہوتی ہیں..... پروین

اپنی مندوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ واقعی علیحدہ گھر نے کام  
کر دکھایا۔

مرسلہ: سمیعہ ممتاز شیخ، لایاں

بیٹیاں

بیٹیاں تو رحمت ہیں  
بیٹیاں محبت ہیں  
اس چرخ آشوب دور میں لوگو  
یہ غذا کی بڑی عنایت ہیں  
یہ تو بھلوں کی طرح بیجاری ہیں  
بڑی بے بسی ہیں یہ بے چاری ہیں  
انہی ہستی مٹانے کے ہر دم  
سب کے کہنے کی لاج کرتی ہیں  
ان کو دیکھو تو پیار سے دیکھو  
ان سے بولو تو پیار سے بولو  
کبھی آنکھوں کو ان کی تم نہ کرو  
کبھی ان کو ہر اس تم نہ کرو  
آئینہ دل جو تو ڈیٹھتے تم  
ان کا ہر بان ٹوٹ جائے گا  
پھر کسکھیں تم سے چھوٹے گا  
اور الفت کا ناتانے گا

شاعرہ: شگفتہ شفیق، کراچی

لڑکیاں

لڑکیاں رزق کی طرح ہوتی ہیں۔ اپنی ہوں تو  
ہمیش خوشی اور شکر کی نگاہ ڈالو لفظوں میں مت تو لو،  
نگاہوں اور دل سے ان کی سلامتی چاہو۔ دوسروں کی  
ہوں تو نگاہیں بھلا ہوتا ہوں، کہ تو کوئی گدا گدا نگاہ اور  
دل کو آلودہ نہ کرے۔ تمہارا ہونا تحفظ کا احساس دلانے  
نہ کرنا سنے والے کو اپنی عزت کی فکر پڑ جائے۔  
مرسلہ: نیرہیم خان، کراچی

سالگرہ نمبر

سکتا ہے کہ وہ بھی آپ کو چاہتی ہے یا  
نہیں۔ یاد رہی خانے میں اگر وہ کھانا  
بنا رہی ہو تو آپ چپکے سے اس کے قریب جائیں اور اس  
کے شانے پر ہلکی سی چپت لگا دیں۔ اگر وہ آپ کو دیکھ کر  
مسکرا دے تو سمجھیں کہ وہ آپ کی ہے اور وہ بھی آپ کو  
چاہتی ہے لیکن اگر لڑکی غصے سے گھور کر دیکھے تو آپ تالی  
بجا کر کہیں۔ ”آہ..... باجی، ڈر گئیں..... باجی  
ڈر گئیں۔“

تحریر: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

ایک کہانی

چاند نے کہا: روتا ہے کس لیے  
میں نے کہا: دل تو ہے اس لیے  
چاند نے کہا: جاہت میں تو ایسا ہوتا ہے  
میں نے کہا: جاہت میں تو اڑک دھوکا ہے  
چاند نے کہا: بھول جاے  
میں نے کہا: تو میری زندگی لے جا  
چاند نے کہا: دنیا میں اور کی چہرے ہیں  
میں نے کہا: دل پاس کی یادوں کے پہرے ہیں  
چاند نے کہا: ہر طرف ویرانی ہے  
میں نے کہا: دنیا بھی تو اڑک کہانی ہے  
مرسلہ: امینہ عنایت، سلاوا ولی

نمکین باتیں

بہلیا بار جب میں سہرا لگتی تو میں کچھ گھر اری  
تھی۔ یوں تو سب کچھ ٹھیک ہی تھا مگر جب اچانک  
میری نظر اپنی درجن بھر مندوں پر پڑی تو مجھے بڑی  
پریشانی ہوئی پھر میری ایک دوست نے مجھے علیحدہ گھر  
لینے کا مشورہ دیا۔ علیحدہ گھر لینے سے نہ صرف مندوں  
سے نجات بلکہ سراسر بے جا جستجو سے بھی بچ سکتا  
ہوگا۔ آج جب میں علیحدہ گھر میں رہ رہی ہوں تو مجھے



مادی زندگی کی ضرورتوں سے قطع نظر دل انسان کو اپنی ضرورتوں کو بچہ طریقے سے احساس کراتا ہے۔ اس کے اپنے ہی تقاضے ہیں آوازوں کے شور میں ایک آواز ہمیں اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ زندگی کی سختیوں اور مصائب پر ہماری نگہماری کرتی ہے وہ صداقت و سچائی کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتی ہے۔ حیران کا انتخاب لاہور سے۔

## غزل

میں نے کہا کہ میرے لیے کچھ دعا کرو  
اس نے کہا دعا یہ نہ بھیجے کیا کرو  
میں نے کہا کہ کام و دین بے مزہ سے ہیں  
اس نے کہا کہ حافظ و غالب پڑھا کرو  
میں نے کہا کہ دوست نبھائیں گے میرا ساتھ  
اس نے کہا کہ وقت پہ یہ تجربہ کرو  
میں نے کہا کہ ذوق جالی ہے بغض وقت  
اس نے کہا کہ کوئی غزل ابتدا کرو  
میں نے کہا کہ اصل کی مجھ کو تلاش ہے  
اس نے کہا کہ اپنا تعاقب کیا کرو  
میں نے کہا کہ شہر میں تشہیر ہوگی  
اس نے کہا کہ اپنی حدوں میں رہا کرو  
میں نے کہا کہ بہت حقیقت ہے یا مجاز  
اس نے کہا کہ غور نہ اتنا کیا کرو  
میں نے کہا کہ مشورہ رہا ب و کمبختی  
اس نے کہا کہ ذات کشفہ پیا کرو  
میں نے کہا کہ خدمت احباب کا صلہ

اس نے کہا کہ جو کام کرو بے ریا کرو  
میں نے کہا شعار زمانہ ہے سخت گیر  
اس نے کہا کہ شعور سے رو بلا کرو  
میں نے کہا کہ بڑھنے لگی تیرگی بہت  
اس نے کہا کہ سم تھوں میں رہا کرو  
میں نے کہا کہ حصول عوکاری جہاں  
اس نے کہا کہ صحبت بد سے بچا کرو

فیصلے کا سفر لفظوں کی نرم چھاؤں میں نہیں  
کھلتا..... صحبت کے دشت بے برگ میں واپسی کا  
کوئی رستہ نہیں ہوتا۔ اعتبار ساجد بھی اپنی اس فلم  
میں فیصلے اور صحبت کی کش مکش میں جتنا نظر آ رہے  
ہیں۔ تانیہ کا انتخاب کوئٹہ سے۔

## موسم گل کا آخری پیغام

جب یہ سوچو کہ کبھی چکا ہے دل  
میری چاہت میری رفاقت سے  
خود کو وقت عذاب مت کرنا  
لہذا چوڑا خطاب مت کرنا  
کار دہمی انتخاب مت کرنا  
ایک سوکھا ہوا گلاب کا پھول  
بس لٹافے میں بھیج دینا تم  
میری تشہیموں کے نام  
موسم گل کا آخری پیغام



## چلترنگ انجمن انصار

## شادی کی سالگرہ

”پیارے میاں جانیں  
سلام محبت!“

آپ مجھے اسنے یاد آتے ہیں اسنے یاد آتے ہیں کہ آپ  
کی تصویر گرو میں رکھ کر خوب باتیں کرتی ہوں درست  
کہتے ہیں بزرگ اصل محبت دور رکھ دیتی ہے۔ جب  
ہم پاس تھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ ایک دوسرے سے  
محبت بھی کرتے ہیں یا نہیں۔ کتنا اچھا ہوا کہ آپ باہر  
چلے گئے آپ کے جانے کے بعد ہی مجھے پتا چلا ہے کہ  
آپ کتنے اچھے ہیں مگر آپ نے خط نہیں لکھا ہے کہ  
پردیس میں دل ٹھہراتا ہے اور وطن آنے کا پروگرام  
بناتے ہیں۔ یہ گھر آنے کی پٹی کس دکن نے  
پڑھا دی۔ یہاں کے لوگ باہر جانا چاہ رہے ہیں اور  
آپ اچھے خاصے باہر ہیں۔ لوگ عقیدت اور شک  
سے مجھے دیکھتے ہیں اور آپ یہاں آنے کا پروگرام  
بناتے ہیں۔ اہل عمر میں تو آپ کو یہاں ملازمت ملے  
سے رہی یہاں جو لوگ ملازم ہیں وہ اپنی ملازمتوں سے  
طرح طرح کے بھانوں سے نکلے جا رہے ہیں۔  
میرے دونوں بہنوئی رضا کارانہ سیکم کے تحت اپنی اپنی  
توکریوں سے بے دخل کر دیے گئے۔ اچھے خاصے صبح  
سویرے بغیر ناشتے کے اپنے آپس جاتے تھے آپ اور  
باجی کی قسمت میں چین ہی چین تھا۔ آپ اور باجی سارا  
دن خوب گھومتی پھرتی تھیں۔ چونکہ ہمیں اور پوچھائی کی  
بڑی ہماری بہنوں نے ساتھ جا کر خرید واپی بھی حالانکہ



نکلے کا معاملہ تھا اور ہمارے محلے والے کرائے داروں  
سے محل ملا پڑھا نے شین بچکے تھے مگر ہماری بہن  
تو سب کے کام آتا جاتی ہیں غرض ہماری بہنوں کی  
قسمت میں چین ہی چین تھا۔ دونوں بہنوں رات گئے  
گھر آتے تھے مگر اب تو ہر وقت گھر میں بڑے بڑے،  
ایڈلے رہتے ہیں۔ اب میں کیسے بھولوں کہ بدلیٹر  
شوہروں کو چھینٹنے اور ڈر کرنا کوئی انسان بات ہے  
بھلا۔ دونوں بہنوں کو ایک ایک طلاق تو ہو گئی ہے کہ  
بہنویوں کی زبانیں ان کے کندھوں پر لگی ہوئی ہیں۔  
ہر بات میں مادی قادی کرنے کے عادی ہیں۔ یہی  
وجہ ہے کہ گزشتہ ماہ بڑی آپا کا پندرہ پونڈ وزن کم ہوا اور  
باجی کا تین پونڈ اور سب سے بڑی بات کہ کئی بہنوں  
کے مزاج میں ایسی تبدیلی آ گئی ہے کہ خدا کی چاہ  
..... میں جب بھی انہیں فون کرتی ہوں تو میری آواز سن  
کر خوب رونے لگی ہیں اور پھر کہتی ہیں کہ کئی تو بہت قسمت  
والی ہے۔ تیرا میاں ملک سے باہر ہے ہماری بھی کوئی  
زندگی ہے میاں نہ صرف ملک میں ہو بلکہ ہر وقت اپنے  
گھر میں ہو اور زندگی شوق کر کے کر دے۔ باجی کے  
میاں تو کسی بڑی قسم کی ماس سے کسی طرح کم نہیں  
ہیں۔ ہر وقت ہماری آبا رہتے ہیں، یہ ہر پوری خانے  
میں بڑوں کی برات کیوں کی ہوئی ہے، یہی فون پر ہر  
وقت اپنے سینے باتیں کیوں کرتی ہو روزانہ بازاری کی  
روٹیاں کیوں کھلاتی ہو گھر میں روٹیاں کیوں نہیں پکاتی  
ہو، تو کرانی پر گھر چھوڑ کھٹے میں کیوں چلی گئی، اسنے  
مجھے تنگ اپنے سینے والوں کو کیوں دیتی ہو..... ظاہر  
ہے کہ باجی کو غصہ تو آتا ہی تھا انہوں نے بھی کہہ دیا کہ

تخالف محبت کرنے والوں کو ہی دے جاتے ہیں جو لوگ منہ دیکھ کر محبت کرتے ہیں ان کو اپنی جوتی بھی نہ دوں۔ باقی کے سارے کے سارے سسرالی ایک گھر کے عمار ہیں ہماری باجی کیوں انہیں منگائی گی۔ ان کو کتنا دے دو ان کی نیت ہی نہیں بھرنی۔ باجی کی ساری تنہیں نوچے کھونٹے والی ہیں اب پرسوں ان کے سر آئیں تو واپسی پر چھوٹوں کے گلے ہی اٹھا کر گئے کس کہتہ تارے ہاں یہ گھر بھار دے میرے ہاں میں پھول آئیں گے اس پر ہماری باجی نے ان کی طبیعت صاف کی تو ان کے میاں جی تھکے سے اکھڑ گئے۔ میاں ملک سے باہر ہوتا ایسے مساک ہے چاری بیوی خود پھنسل کر رہی ہے اور میاں خوشوار پر پڑا نہیں ہوتا۔ اس کا پیسہ کوشہ شاہ آ کی بیہوش نے میری چوڑیاں دیکھ کر کھانچا کھانچا بھائی سے ہو کر ہیں چاندی کی چوڑیاں ہی بنا کر دے دیں تو میں نے انہیں اتنی سناپی نہیں کہ آپ کی دوہنیں تو مکاری سے بے ہوش ہونے کی اداکاری کرنے کی نہیں مگر میں انہیں چھوڑ کر اپنے گھر سے نکلتی تھی وہ تو بعد میں چلا چلا کر پرانے پردوں ان کو اپنی گاڑی میں انہیں گھر چھوڑنے گئے تھے جو صرف یہ بھی کہ کئی پردوں کو دوسروں کے معاملات میں ہیشہ گونے کا شوق رہا ہے (اور انہوں نے اپنی نیکسین کر لی ہوگی) ہاں لوگ کتنا غلط کہتے ہیں کہ پردس میں جن ہوں تو عید نہیں ہوتی۔ کتبہ اس موضوع پر اپنے قلم خوشوار دے دیے ہیں حالانکہ جن کے جن ملک سے باہر ہوں اور سال سال بھرا جی کلن دکھائیں۔ اصل تہوار، کچھ اور طمانیت تو ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے۔ ہاں میں آپ کو آپ کی ماں کی قسم دے رہی ہوں کہ باہر کی ملازمت چھوڑ کر ہرگز نہیں آئے گا۔ یوں ہی بھٹھا کیلئے رہنے کی عادت ہوئی ہے اور آپ جب بھی آتے ہیں دیکھیں رہتے جیسے فون پر ہوتے ہیں۔ جی کہہ رہی ہوں کہ آپ کے آنے سے مجھے عجب وحشت ہو، نہ لگتی ہے اور کچھ نہیں تو

الٹیاں کر کر کے ہی جی ماندہ سا ہو جاتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگ ہماری خوشگوار ازدواجی زندگی پر نظر گارہے ہیں، وہ نہیں چاہتے کہ ہم آپس میں محبت اور الفت سے رہیں کہ یہ یقیناً ہمارے دشمنوں کی ہی چال ہے کسی طرح ہماری آپس میں وجہاں قسم کی لڑائیاں ہوں اور غار ہے کہ وہ ایسی صورت میں ہو سکتی ہیں کہ آپ اپنی لگی لگی ملازمت چھوڑ کر وطن آ جا میں اور ج شام جھ میں اور میرے کھانوں میں لیڑے لگائیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں.....؟ میری بات کا یقین نہیں ہے تو اپنی کزن محبت کی حالت زار پر غور کر لیں کہ جب تک اس کا میاں ملک سے باہر ہوں تو ان کی وقتی ہم آہنگی اسے دن رات اور جیسے ہی وہ وطن واپس آیا چند دن کے بعد ہی وہ لڑکے جیسے جاکشیں۔ میاں چلی آتی ہے یا تہ غور ہے جاسٹے ہیں کہ جب یہ تو مساک کے نوکر ہے نوکر سے بچ رہے رکھے ہیں جو اسی صورت میں مل ہوں گے کہ جب آپ باہر سے اندر آنے کا سوچیں۔ ہاں اپنا ڈرافٹ ہر مہینے میرے نام بھیجتے رہیں اگر بوریت زیادہ ہو رہی ہے تو میں اور نام کر لیں اس سے داغ میں پرانہ خیالت نہیں آئیں گے اور آپ کی طبیعت بھی بھاش بھاش رہے گی۔ ہاں جانو اس ماہ ہماری شادی کی سالگرہ ہے مگر آپ ہرگز، ہرگز وطن نہیں آئیں گے۔ سالگرہ اگر علیحدہ رکھ کر منائی جائے تو زیادہ لطف آئے گا کہ محبت جدارہ کر ہی چلتی ہے یہ دانشورانہ قول سنی صدمہ میرا ہے۔ ہاں شادی کی سالگرہ خصوصی تھو کیا سمجھیں گے؟؟؟

فقط آپ کی راج ڈلاری بیگم لیتی جو ہر

ایک خط پیارے میاں جانی!

سلامیاں.....

میری بھجھ میں نہیں آتا کہ آپ پر اتنے دورے

کیوں پڑتے لگے ہیں۔ پورا سال ہو گیا ہے پاکستان صرف چند دنوں کے لیے آتے ہیں اور اگر کسی آپ کا سوٹ کیس بھی صحیح طرح نہیں مل پاتا کہ آپ پر پھر دورہ پڑ جاتا ہے اور آپ دوبارہ سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ آپ اپنی بطوطہ تو نہیں ہیں تو پھر اتنے کھوتی کیوں نہیں گئے ہیں خیر..... یہ آنا جانا آپ کی دفتری مصروفیات کا ایک حصہ ہیں مگر میں کیا کروں، کہاں تک فی دی دیکھوں، کہاں تک شوہر کے رسائل چاٹوں ہمارے ملک میں تو تسلیم کرنے کی اسکیڈل بھی اسے سامنے نہیں آتے کہ بندہ اپنی پریشانیوں کو بھول کر ان کی کہانیاں میں کھوجا ہے۔ چاہے مرزا اور شعیب کی شادی کے گانے بھی تمام پھیلنے سے آئے بند ہو گئے ہیں۔ دوشانہ نہیں دیکھ کر اوسن کر طبیعت میں کچھ کشکی سی تو آ جاتی تھی۔ یقین کیجیے میں سو کر تھک گئی ہوں مگر میرا وقت کا نہیں کتنا۔ آپ کی اماں، بہنیں جو بکا دیتی ہیں، میں اپنے کمرے میں ہی کھا لیتی ہوں۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں نہیں جانتی کہ ان کے بدعزہ کھانوں میں کوئی برائی نکالوں وہ کچھ ہی نکالیں کھانے کا ذائقہ ایسا جیسا ہی ہوتا ہے جیسے نقدانی سرور کے کھانوں سے ایک عجیب قسم کی بے جا بھانہ آتی ہے۔ ایسا ہی کچھ ان لوگوں کے ساتھ بھی ہے۔ ایسی کچھ بیوی کس کی ہو سکتی ہے جو جب چاہتے بازار سے کھانے منگو کر خاموشی سے کھا کر گھر آپ کی بہنوں کا ادا کرتی ہوں کہ کیسے کیسے بدعزہ کھانے کی وہ ماہر ہیں۔ یقیناً نہیں سے جا کر ضرور دیکھے ہوں گے۔ میرے بھی ڈیڑی کچھ ملل ہیں اس لیے میں ان کو اپنے گھر لے آتی ہوں، آپ کی بیوی آپ کا سکران کوڈ سہا ہے۔ بیوی آپ کا کیا ہے، وہ تو آپ کے کمرے میں بھی سو سکتی ہیں مگر مہمانوں کو تو خیال رکھنا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں ڈیڑی بغیر گاڑی کے نہیں رہ سکتے اور ان کی گاڑی آج کل سرور پر چلی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کے بہنوئی کی

گاڑی لے لی ہے کہ ایسا کرنے کو آپ نے کہا ہے۔ گاڑی کو کھاسے پرانے ناول کی ہے اور ڈیڑی اس کو چلا کر بھی خاصی شرمندگی محسوس کر رہے ہیں گھر گیا کریں وہ جب تک روزانہ اندھا دھند گاڑی نہ چلائیں انہیں جین ہی نہیں پڑتا۔ آج بھی وہ دو دفعہ باہر سے گاڑی مار کر لائے ہیں اور کبہرے سے کہتے کہ تمہارے منہ کو کی ڈیل کی گاڑی مہا ڈیل ہو گئی ہے۔ میں نے کہا آپ پر دامت بخیر، ان کی یہ کھانا تو ہزاروں پیش کھائی ہوئی ہے۔ تندہی بے چارے کا کھل ہی نہیں ہے کہ آئے دن اپنی گاڑی کے ڈیفٹ صحیح کر داتے رہیں۔ چھوٹی نند پارلر چلی ہیں۔ چہرہ کے ڈیفٹ دور کرتی ہیں اس وجہ سے ان دونوں میاں بیوی میں خوب وقتی ہم آہنگی ہے۔ بحال ہے ایک دوسرے کو مذاق میں ہی سہی مگر راج بھائی نہیں سناتے۔ ہاں کل آپ کے کوئی دوست اعتراف آئے تھے اور ڈھائی لاکھ دے گئے ہیں کہ انہوں نے آپ سے لیے تھے، میں فوراً جا کر اپنے لیے سوئے گا کیٹ لے آئی کہ کل سوٹا کس قدر تیزی سے گزر رہا ہے جب تک آپ آئیں گے ڈھائی لاکھ کا سیٹ تین لاکھ کا چکا ہوگا آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ کے گھر والوں کا کیسا خیال رکھتی ہوں تو خوش ہو جا میں جس دن میں اپنے لیے سیٹ لائی اسی دن میں گھر میں صفائی بھی لے کر آئی تھی اور آپ کے سب گھر والوں کو کھلائی۔ آپ کی اماں میرا سیٹ دیکھ کر پوچھ رہی تھیں کہ کتنے کا خریدا میں نے انہیں صدمے سے بچانے کے لیے کہا ہے میرے ڈیڑی کی میرے لیے لائے ہیں اور پانچ لاکھ کا ہے اس پردہ بہت خوش ہویں۔ دیکھا، میں سب کی خوشیاں کا کتنا خیال رکھتی ہوں اسی خوشی میں جلدی سے میرے نام ڈرافٹ بھیجیں..... فوراً۔

آپ کی بیگم شیا۔۔

صغریٰ زیدی



☆ شہلا رضا.....راول پنڈی

دردِ فرقت سہا نہیں جاتا  
لیکن اُن سے کہا نہیں جاتا  
جی رہا ہوں کہ مر نہیں سکتا  
مر رہا ہوں جینا نہیں جاتا

☆ پروین شکور.....لاہور

شب کی ایک بوند بھی پھولوں کی کائنات  
وہ بھی نہ بچ سکی ہوئے آفتاب سے  
☆ خیزنا ذوالفقار.....کراچی

یہ شہر جہاں ہم ہیں یہاں کون ہے اپنا  
یہ بات ہی کیا کم ہے یہاں بیت گیا دن  
☆ صہبہ انور.....راول پنڈی

میرا اعزاز کیا کم ہے کہ میں حوا کی بیٹی ہوں  
مثال موسمِ الفت تیری تھی سے گزری ہوں

☆ زہرہ ناز.....اسلام آباد

پھولوں سے قریب بہت کچھ اکبوں میں  
تو مجھ کو چاہتا ہے تو پتھر تلاش کر  
☆ عظمیٰ.....فیصل آباد

افرو کی زیت کی تردید نیچے  
ہاں مسکرائیے، مری تائید نیچے  
☆ نسreen یاسین.....حیدر آباد

محبوبوں کا مقدر ہے بدگمانی بھی  
کہ تیرے ساتھ رہوں اور ڈرنے جائے کہیں  
وفا کا چاند ہمیں پانیوں میں اترتا ہے

یہ میرے خواب کا منظر بکھر نہ جائے کہیں  
☆ رابعہ اسلم.....رحیم یار خان  
آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا

یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں  
☆ آصف ستار.....فیصل آباد  
گھر موم کا پہلے تو بنایا نہیں جاتا

بن جائے تو سورج سے بچایا نہیں جاتا  
اب تم ہو مقابل تو مجھے ہارنا ہوگا  
تم کو تو میری جان ہرایا نہیں جاتا

☆ خدیجہ بی بی.....بھکر  
ہجوم اپنی جگہ تاریک جنگل کے درختوں کا  
پرنے پھر بھی اپنا آشیانہ یاد رکھتے ہیں

☆ منورہ تبسم.....ساہیوال  
میں تیری ذات سے آگے نہ بڑھ سکی ہوں  
میں کیا کروں کہ یہ دل کا معاملہ ٹھہرا

☆ نور اختر.....خانپل  
پتوں سے بھر رہے تھے ہواؤں کی جھولیاں  
گرتے ہوئے طہر بھی تھی انتہا کے تھے

☆ مسز ندیمہ.....جعفر آباد  
اسے گواہ کے ہیں خود بھی پتھر گیا طالب  
وہ ایک شخص تو ہر پتہ تھا آئینہ میرا

☆ حرا شریف.....فیصل آباد

نیند سے تعلق ہی نہیں برسوں سے میرا  
خواب آ کر میری چھت پر ٹپکتے کیوں ہیں  
میں نہ جگنو ہوں نہ دیا، نہ کوئی تارا

روشنی والے پھر نام سے میرے جلے کیوں ہیں  
☆ نوشین اقبال نوشی.....بدر مہمان  
میرے لفظوں سے نکل جائے اثر

کوئی خواہش جو تیرے بعد کروں  
☆ شائلہ انجم.....سرگودھا  
جمیل سی اپنی طبیعت ہے ذرا کی بات پر

ذہن میں الفاظ جم جائے ہیں کالی کی طرح  
☆ امینہ عنیدہ.....سلاوالی  
کتے مگر ہیں جو بھی اجڑے بھی بے

اجڑا جو ایک بار یہ دل بھر بسا نہیں  
☆ عالیہ طاہر رفیقہ.....لاہور  
کبھی یوں بھی تھا کہ ہزار پرگہ میں تھے دو تکی نہ تھے

مگر اب یہ ہے کہ کسی مہرباں کے تپا کے بھی رلا دیا  
☆ مس اعجاز احمد.....لاہور  
لگایا اندھیرا تھا سوکار خاموشی

عمر اس طرح بچی شامِ ڈھل گئی جیسے  
☆ انیس فاطمہ.....سیالکوٹ  
تم ہم سفر ہوئے تو ہوئی زندگی عزیز

مجھ میں تو زندگی کا کوئی حوصلہ نہ تھا  
☆ نور اختر.....اوکاڑہ  
کاش دینا کے مصائب کو سمجھنے کے لیے

تم نے کچھ دن میری دنیا میں گزارے ہوئے  
☆ قرۃ العین قرۃ.....نیر کراچی  
آتے جاتے سارے موسم اس سے نسبت رکھتے ہیں

اس کا جگر خزاؤں جیسا اس کا قرب بہاروں جیسا  
☆ مسز عہدہ.....ملتان  
منا تارا اگر نہیں آساں تو سہل ہے

دشوار تو مہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

☆ عالیہ مشتاق.....راول پنڈی

ہر اک سے کون محبت بناہ سکتا ہے  
کہ سب سے دوستی یاری تو کی وفا نہیں کی  
☆ حرم طارق.....کراچی

اک نگاہ خود شناس مجھ سے ہوئی جو روشناس  
اپنے ہر اک سوال کا خود ہی جواب ہو گئی  
☆ فرزانہ ٹکس.....سرگودھا

بچپنوں کے کلمے جب گلاب آنکھوں میں  
کسی کے خواب رہے بے حساب آنکھوں میں  
☆ قرۃ العین.....لاہور

زندگی ختم ہوئی دوست جہاں ختم ہوئے  
رہ گئی عمر تو چاہے وہ جہاں تک پہنچے  
☆ سعدیہ.....لاہور

دل اک خون کے قطرے سے زائد نہ تھا مگر  
آنسوؤں نے اس کو بھی طوفان بنا دیا  
وہ قیس تھا کہ جس نے بہا ہاں کو گھر کیا

ہم نے تو اپنا گھر ہی میا ہاں بنا دیا  
☆ فہیدہ.....میاں چنوں  
اس سے پہلے کہ رُت بدل جائے

اپنے سارے گلاب لے جاتا  
☆ محبت.....کوئٹہ  
قراز غم بھی ملتے ہیں نصیب والوں کو

ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں  
☆ یاسین سحر.....کراچی  
بھری بہار میں اب کے مجھ پھول کلمے

نہ اپنے زخمی ہی سینے نہ دل کے چاک کلمے  
☆ نایبہ.....اسلام آباد  
یہ مصححتِ وقت ہے یا کرب کی شدت

ہونٹوں پہلے آنکھوں میں اشکوں کے بجائے  
☆ ربیعہ فہیمہ.....سیالکوٹ  
میری خلاؤں میں میری مجھ کا وصل نہیں

میں جو بھی کرتا ہوں بے اختیار کرتا ہوں





### دھنی کا کیک

اشیاء ترش پھلوں کا رس، پن کب۔ جلیان پاؤڈر۔ ایک کھانے کا کچھ۔ انڈے کی سفیدی، تین عدد۔ دہی، دو تھائی کب۔ بیز کے کلتے سے کا چھلکا۔ ایک عدد۔ آم، ایک عدد۔ کیوی فروٹ، دو عدد۔ کچے انجور، دس سے بارہ عدد۔ میوں کا رس، دو کھانے کے کچھ۔  
ترکیب..... پھلوں کے رس کو گرم کریں اور جلیان پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح حل کر لیں۔ ایک پیالے میں انڈے کی سفیدی کو پینٹیشن ساتھ ساتھ میوں کے چھلکے اور دہی ڈالتے جائیں۔ اسی آمیزے میں جلیان اور پھلوں کے رس کا آمیزہ بھی ڈال کر پینٹیشن میں یہاں تک کہ تمام ایشیا بھی طرح سے بھنٹ جائیں۔ آمیزے کو جھلی کے سانچے میں ڈال کر فریج میں خنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ سانچہ ایسا ہو جو درمیان خالی اور اطراف سے رنگ کی گھل کا ہو۔ تیار شدہ جلی کیک کو پیٹ میں نکال کر فریج میں رکھ دیں۔ آم کو پھیل کر کھلی نکال لیں اور گودے کے کلو سے رکھیں۔ کیوی فروٹ پھیل کر کلو سے رکھیں، انجور بھی دو کلو سے رکھیں۔ کٹے ہوئے پھلوں کو پیالے

میں ڈال کر اوپر سے میوں کا رس چھڑک کر کچھ سے مکس کریں۔ سارے پھلوں کو کیک کے درمیان خالی حصے میں ڈال دیں۔  
مرسلہ:- سائونڈز کراچی۔

### شلجم کا قورمہ

اشیاء گوشت، آدھا کلو۔ شلجم، آدھا کلو۔ سبزی، تین چھٹانک۔ لوگ، دس عدد۔ الاچی، چار عدد۔ لہسن، ایک ٹمبی۔ پیاز کے لمبے، آدھا پاؤ۔ اورک، ایک گرہ۔ دھنیا بھنا ہوا، دو تولہ۔ سرخ مرچ پیسی ہوئی۔ حسب ضرورت۔ میوں کا رس، حسب ذائقہ۔ جادری، ڈرا سی۔ راجی، ٹھوڑی سی۔ کالی مرچ، ایک عدد۔ نمک، حسب ذائقہ۔ جانتل، ڈرا سا۔

ترکیب..... پہلے شلجم پھیل کر بڑے بڑے کلو سے کر کے کی ٹوکدار پیڑ سے گودیں پھرائیں مٹی میں الاچی ڈال کر سرخ کر کے نکال لیں اور پیاز کے آدھے لمبے مٹی میں سرخ کر کے نکال لیں۔ بقیہ پیاز کو سالے کے ساتھ ملا لیں۔ لہسن، پیاز کے آدھے لمبے، اورک، دھنیا اور سرخ مرچ ایک ہی بار میں لیں اور مٹی جو شلجم تھلے اور پیاز سرخ کرنے سے بچ گیا ہے اس میں پانچ ٹونک اور دو بڑا الاچی ڈال کر کڑا کر اسی پھر گوشت کو دھو کر اس میں ڈال دیں اور بھون کر سرخ کر لیں۔ اس کے بعد باقی سالے اور نمک حسب ضرورت ڈال کر بھونیں اور پانی ڈال کر کھنے کے لیے چڑھادیں۔ جب گوشت گل جائے اور پانی گل جائے تو آدھا پاؤ دہی ڈال کر خوب بھونیں اگر ہو سکے تو ایک میوں کا رس بھی ڈال دیں تاکہ تھلے بھی گل جائیں۔ آخر میں لال کی ہوئی پیاز، جانتل، جادری، راجی، اورک، کالی مرچ، ہری الاچی تین کر ڈال دیں اور کیو سے کا عرق بھی ملا دیں تاکہ خوشبو آئے۔  
مرسلہ:- ذکرو ملائیر کراچی۔

☆☆☆

## سندیہ



### پاکیزہ بہنیں



ساگرہ مبارک

مج کی کرن بولی

اٹھ کھڑا نکالنا رہے

میں نے کہا

رک پبل

ایس ایم ایں تو کروں

اس دوست کو جو

مج سے بھی

پیارا ہے

ساگرہ مبارک

ایسی تحریر پڑھنے والے ہیں جو دھیرے دھیرے بحر طاری کروے گی اور کچھ وقت کے لیے ہم ارد گرد کو بھول کر ان کرداروں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ محبت کے نرم دگدگاموضوع کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں محاشرے کی تلخ حقیقتیں بھی شامل ہوتی ہیں جو ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔ اللہ ان کے قلم کا اور طاقت دے۔  
مرسلہ:- سدرہ رضوان، راولپنڈی

### عمیرہ احمد کے نام

عمیرہ آہلی، آپ ہم سب کی مسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ ہم سب سہیلیاں آپ کی تحریروں کی دیوانی ہیں۔ آپ کوئی وی والوں نے بہت مصروف کر دیا ہے۔ آپ کے ڈرامے بھی شوق سے دیکھے جاتے ہیں پر آپ کی تحریر پڑھتے ہوئے تو نشہ چھا جاتا ہے۔ آپ خوب زیادہ یاد دہا کر رہیں۔ لوگ آپ کے ناولوں دجان سے پڑھتے ہیں۔ پائین لفظوں کے یہ خزانے آپ نے کہاں سے تحریر کیے ہیں۔ ایک عام سے منظر کو آپ کا انداز بیان خاص بناتا ہے۔ آپ کا کوئی حیرا گراف بڑھ کر ہی چٹا نکلتا ہے کہ عمیرہ احمد ہی ہیں۔ آج کے دور کی منفرد ترین رائٹر میں آپ بر فہرست ہیں۔ اللہ آپ کو کبھی عرصہ عطا کرے اور قلم سے رشتہ ہمیشہ مضبوط رہے۔ آمین

مرسلہ:- نازہ جبین، انک پیاری۔ بہوؤں کے نام ایک مفید پیغام آج کل انکھروں کا یہ مسئلہ ہے کہ انہیں بہت خوش خوش بیٹے کی شادی کر کے، بہو کو لالائی میں لیکن بیٹا اگر ذرا سانس بول لے، بیوی کو لے کر کہیں گھوٹے بھرتے۔۔۔ چلا جائے بس ماں کو گورا پریشانی شروع ہو جاتی ہے اور بہو کا بیٹا دو بھر کر دیتی ہیں اور بٹے کو بھی بیوی سے بدلتی کر دیتی ہیں۔ ان بچیوں کے لیے جو شر اور داساں سے بہت پریشان ہیں 7 پارسم اللہ الرحمن یا

مرسلہ:- عزیز دیم، گوجرانولہ  
عمیرہ سید کے نام  
قلم جن کے ہاتھوں میں آکر فخر کرے کہ اب لفظوں کے دو موتی بکھیرے جائیں گے کہ جن کو سیٹ کرانے دامن میں بھر کر تاریخ مالامال ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو خدا الٰہی ملائحتوں سے نوازتا ہے کہ جب وہ انہی ان خوبیوں کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں تو پھر ہر طرف ان کا ہی چرچا ہوتا ہے۔ عمیرہ سید ان ایسا ہی نام ہے جسے دیکھتے ہی یقین ہو جاتا ہے کہ اب ہم کوئی



ادارہ

## روحانی مشورے

لے تو انشاء اللہ اس کو شفا ہوگی۔

☆ ہر نماز کے بعد پندرہ (15) مرتبہ  
(اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَلَامُ سَلَامُ سَلَامُ) پڑھا ہر طرح کی  
سلاحتی کے لیے مفید ہے۔

☆ جو کوئی ایک سو پندرہ (115) مرتبہ یہ اسم  
پڑھ کر بیمار پر دم کرے گا اللہ اس کو صحت و شفا عطا  
فرمائے گا۔ انشاء اللہ!

## چھوٹے بچوں کے مسائل اور ان کا حل

اگر دودھ پیتے بچے کا پیٹ خراب ہو جائے تو  
1/2 چائے کا چمچ عرق کاغذ بان 1/2 چائے کا چمچ  
سوف کے عرق میں ملا کر نیم گرم کر کے چند دانے  
چینی شامل کر کے دن دو تین دفعہ پینے کو یاد دیں۔  
☆ اگر بچہ بلا وجہ الٹیاں کر رہا ہو تو میوں کے  
اندر سے دو عدد چمچ نکال کر چمکا کر اس میں پھر پرت میں  
رکھ کر کچھ کے الٹے سرے سے پیس لیں پھر چمچ میں رکھ  
کر ہلکا سا پیانی ملا کر دے دیں۔ انشاء اللہ دو تین دفعہ  
دینے سے آرام آ جائے گا۔

☆ سفید کبیر کے پھول لے کر دھو کر سکالیں،  
اس طرح سکالیں کہ ایک سفید مٹل کا کپڑا انچے  
پچھا میں اور اوپر پھول رکھ دیں اور ایک سفید مٹل کا  
کپڑا اوپر ڈال دیں، سوکھ جائیں تو صاف کر انڈوڑ یا  
کوڑی میں باریک غیس کر چھان لیں۔ جس بچے کو  
بہت زکام ہو، ایک ٹوتھ پک کے سرے پر جتنا  
یاؤڈر آتا ہے وہ ایک ایک دونوں نتھوں میں لگا کر  
آنکھوں پر کپڑا رکھ کر (بچے کی) پھونک مار دیں۔ چند  
چھینکیں آکر ساراریشہ باہر نکل آئے گا۔ دن میں دو  
دفعہ کر لیں۔

یاسلام کے معنی اور اس کے خواص  
(سب یوحہ و آفات سے سالم، سب نفساں  
اور کمزوریوں سے پاک، سلامت و بے عیب ذات)

## خواص

☆ جو ہمیشہ صبح کی نماز کے بعد ایک ہزار  
(1000) بار اس اسم کو پڑھے گا اس کا علم زیادہ  
ہوگا۔

☆ اگر کوئی اس اسم کو ایک سو اکیس (131)  
بار یا ایک سو اٹھ (161) بار پڑھ کر بیمار پر دم کرے  
گا تو بیمار صحت پائے گا۔

☆ جو اس اسم کو کثرت سے پڑھے یا لکھ کر پاس  
رکھے وہ دشمن سے بے خوف رہے گا۔

☆ بیمار یا خائف اگر ایک سو نو بار (111) بار  
پڑھ کر دم کرے تو بیماری اور خوف سے محفوظ رہے گا۔

☆ جو کوئی کثرت سے اس اسم کو پڑھتا رہے گا  
انشاء اللہ تمام آفتوں سے محفوظ رہے گا۔

☆ یہ اسم مبارک چھ سو نوے (690) بار  
شیرینی پڑھ کر دشمن کو کھلائے تو دشمن مہربان  
ہو جائے۔

☆ اگر کوئی ایک سو اکیس (121) بار یہ اسم  
اور (مُسْلِمٌ قَوْلُهُ رَبِّ رَحِيمٌ) کی  
مرلیں پڑھے تو مرلیں شفا پائے گا یا کم از کم اس  
کے مرض میں کمی ہوگی۔

☆ اگر کوئی شخص مریض کے پاس اس کے  
سرہانے بیٹھ کر دو دنوں یا تھارے یا تھارے کے بعد اس  
(136) بار اقی بلندہ آواز سے پڑھے کہ مریض سن

جائیں۔ آپ سنے سنے افسانے اور ناولز منظر عام پر  
لایں لوگ مشتاق ہیں پڑھنے کے لیے۔ اپنی  
معروفیات میں سے قارئین کے لیے وقت نکالیں اور  
اپنے منفرد قلم سے رنگ بکھیر دیں۔

مرسلہ: جویریہ فاطمہ، زیارت

## سن توسی

سنو!

کبھی ناراض مت ہونا  
کبھی ایسا جو ہو جائے کہ  
تیری یاد سے غافل کسی لمحے جو ہو جاؤں

ہنا کیسے تیری صورت  
کسی شب میں جو سو جاؤں  
تو پیٹوں میں چلے نا  
مجھے احساس دلا جانا

سنو ناراض مت ہونا  
کبھی ایسا جو ہو جائے جنہیں کہنا ضروری ہو  
وہ مجھ سے لفظ کھو جائیں  
ابا کو چمتا مت لا تا میری آواز میں جانا

کبھی ناراض مت ہونا  
مرسلہ: حلقہ تازک، جلی پور

## تمام مصنفات کے نام

اس نے سال کی کوکھ سے  
چل کر نوازا کہہ رات کی

ان چھوٹی بھگتی ساعنوں میں  
تم نے اتنے خوب صورت اعزاز میں

مجھ سے دوستی کا اقرار کیا کہ  
میری آنکھوں میں آنسو آگئے

نئے سال پر اس سے سچا  
اور انمول تحفہ

اور کیا ہو سکتا تھا  
شاعرہ: پروین عذرا شتہ، کراچی

سبحانہ یا قدوس یا غفور یا ودود پڑھ کر پانی  
پر دم کر لیں اور ساس اور شوہر کو  
پلائیں ساتھ اپنا روپیہ بھی درست رکھیں شوہر کی ماں آپ  
کی ماں ہے ان کی عزت کریں، محبت اور خدمت کریں  
شوہر کی اطاعت کریں پھر کرشمہ دیکھیں۔

ماخوذ حق الرجال

مرسلہ: رفعت تبین ربی، کراچی

## اقبال بانو کے نام

ہماری پیاری اقبال بانو آپ بہت کم کم نظر آتی  
ہیں..... مسلسل غائب رہنا اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کو پتا  
ہے ہم لوگ آپ سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ میں اور میری  
بہن اسکول کے زمانے سے آپ کی کہانیوں کے قین  
ہیں۔ آپ کے ناول اور افسانے کسی بھی رسالے کی  
جان ہوتے ہیں۔ آپ کی کہانیاں اس قدر کی گئی ہیں  
خوشبو بھری ہوئی ہیں۔ آپ کے لفظ لفظ میں اپنی  
ثقافت بڑھتی ہے۔ یہی کہنا میں اور سادگی آپ کو سب  
سے ممتاز کرتی ہے۔ پائیزہ کے صفحات میں جلدی  
جلدی آیا کر میں محبت کے موضوع پر لکھتے ہوئے آپ  
سرتاپا محبت اڈو لیتی ہے یہی چادر پڑھنے والے کو بھی  
اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

مرسلہ: طلعت جمیں نیاز، کراچی

## رفعت سراج کے نام

رفعت آئی کہاں غائب ہیں آپ.....؟ اپنی  
چاہنے والی، بہنوں کی پیار پر لوشائیں۔ آپ کی چھوٹی  
نعرہیں پڑھنے کو ہم سے تاب رہتے ہیں۔ انفتوں کی  
بازنگاری سے وہی حامد و مدد دیر جو قاری کو اپنے حصار  
میں لے لیتا ہے۔ آپ کی دل موہ لینے والی کہانیاں  
آپ کا بے ساختہ پین اور چھوٹے افسانے میں بڑی  
بات کہہ دینا یہ سب ہم یاد کرتے ہیں۔ آپ کے طویل  
ناول پڑھنے کو ہمارے دل چاہتا ہے کہ کس پڑھتے ہی



ہے۔

مسئلہ نمبر ۲: میرے

چہرے پر دانے نکل رہے ہیں

جو کہ پہلے سرخ ہوتے ہیں پھر

اس میں سے مواد پھیلا نکلتا ہے بعد میں اپنا نشان

چھوڑ جاتے ہیں۔ میری ۴ ماہ بعد شادی ہے۔ اس

کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ این بہاؤ پور

جواب: قد اور وزن نہیں لکھا کرتا ہے، ورنہ

کتے عمر سے ہے؟ اگر نہ کے بعد یا چوٹ لگنے

کے بعد یا کوئی چیز اٹھانے کے بعد ہوا تھا۔ دانے

کب نکلتے ہیں یا ہوا رے سے پہلے دوران، بعد میں

X-Ray. lumbo-sacral

Spine ضرور کروائیں۔

ڈاکٹر ولما روٹا بے جرنی کی مندرجہ ذیل

ادویات ایک ماہ استعمال کرنے کے بعد حال

بتائیے گا۔

Gnaphilum30, Calc Sul 30

اور Rhustox30 کے 5.5 قطرے دن میں

3 مرتبہ ایک کپ پانی میں ڈال کر استعمال

کریں اور وزن اٹھانے سے پرہیز کریں۔

☆.....☆.....☆

بچوں کا قد

میرا بیٹا عمر تقریباً 19 سال، بنی عمر

تقریباً 16 سال دونوں کا قد نہیں بڑھ رہا میرا بیٹا

فرما کر کوئی اچھی سی دوائی تجویز فرمائیں۔ بیٹے کا

قد پانچ فٹ ساڑھے 6 انچ بنی کا قد پانچ

فٹ 11 انچ میرا بیٹا فرما کر کوئی تیز اثر دوائی تجویز

ملنے لگا ہے۔

اپریل 2012ء

31

تک یہ احتیاطیں کریں۔

1۔ میٹھی + مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں

(اس میں شربت کولڈرنک بریانی شامل ہیں)

2۔ چھل قدری کی عادت ڈالیں ابتدا دس

منٹ سے کریں۔

3۔ رکھانے سے پہلے ایک گلاس پانی ضرور

پینیں کھانے کے ساتھ اور بعد ناکل بھی نہ پینیں۔

4۔ ڈاکٹر ولما روٹا بے جرنی کی مندرجہ ذیل

ادویات استعمال کریں Calc Carb 200

ہر ہفتہ ایک خوراک استعمال کریں۔

Bryonia 30 Rhustox30

5.5 قطرے صبح دوپہر شام استعمال کریں

Phytolacca berry Q

10 قطرے دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

☆.....☆.....☆

لنگڑی کا درد اور

چہرے کے دانے

میں آپ کا یہ کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔

میں آپ کے پاس اپنا مسئلہ لکھ کر حاضر ہوئی ہوں

اس امید پر کہ مجھے آپ کی وی ہوئی دوائی سے

ضرور فائدہ ہوگا۔

میرا مسئلہ نمبر ۱ ہے کہ میری الٹی ٹانگ میں

کھنکھنے کی سانس پر درد ہے۔ میں اگر ٹانگ کو....

موٹلوں تو درد ہوتا ہے اور کھنکھاؤ سامحوس ہوتا ہے

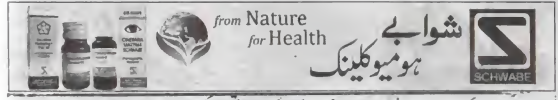
ٹانگ کو سیدھا کرلوں تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور اگر

میں کھڑی ہو جاؤں تو ایک دم سے کھڑا نہیں ہو جاتا

تک آپ یہ تقیلات ہمیں روانہ کریں اس وقت

اپریل 2012ء

31



اس بات کی ضرورت کافی عمر سے محسوس کرانی جاری تھی کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا پورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہراندہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی جہنما بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو بحث کے مسائل ہوں اس کو پورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹر کے ذریعہ حل کر میں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، پوسٹ نمبر بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ کایزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی جہنما کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، پتہ اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹ ہوں تو اس کی کوئی کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

لے کافی ادویات استعمال کر چکی ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں کمرے میں جتا ہوں، جس کی ادویات بھی استعمال کر رہی ہوں۔ اور اس مرض کی وجہ سے کوئی ورزش بھی نہیں کر سکتی۔ برائے مہربانی کوئی اچھی دوائی بتائیں جس سے مٹا پاکم ہو جائے۔

آپ کی کبھی بہن۔۔۔! فرحت ضلع ہیکر جواب: فرحت آپ نے نہیں لکھا کہ آپ کا قد کتنا ہے اور یہ بھی نہیں بتایا کہ صبح دوپہر اور رات کھانے میں کیا اور کتنا لیتے ہیں، شادی شدہ ہیں یا نہیں اور کتنے بچے ہیں، کمر کی تکلیف کیا ہے اس کی کوئی رپورٹ کروائی ہیں؟ ماہوار کی متعلق بھی بتائیں۔ ان سب چیزوں کے بعد آپ کو یقیناً پھر اچھی دوا تجویز کی جاسکتی ہے۔ جب تک آپ یہ تقیلات ہمیں روانہ کریں اس وقت

اپریل 2012ء

31

ملنے لگا ہے۔

اپریل 2012ء

31





3- تیسرا مسئلہ ڈپریشن اور اعصابی کمزوری ہے۔ ایلو پیتھک علاج کے لیے ڈاکٹر اسپیشلسٹ آزما چکی ہوں۔

کافی عرصے علاج بھی کرتی رہی ہوں۔ ملڈ پریشر تو کافی حد تک کنٹرول ہو جاتا ہے دو انیوں سے۔ کبھی کبھی فینشن سے زیادہ تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ البتہ الرتبی بہت تکلیف دیتی ہے۔ احتیاط بھی بہت کرتی ہوں۔ کمزوری ہو گئی ہے۔ نیند بھی نہیں آتی۔ میں 1993ء سے چنگک کے شے سے روایت ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ 4 بچے ہیں عمر 44 سال ہے۔ اب چھوٹی چھوٹی باتوں پر فینشن ہو جاتی ہے اور طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ شوہر سخت مزاج کے ہیں۔ بچے بھی تنگ کرتے ہیں۔۔۔۔۔ پہلے تو معمول کے مطابق زندگی گزارتی رہی آپ براہ رشت نہیں ہوتا اور میں پیار ہو جاتی ہوں۔ شیخ ناز راجن پور

جواب: ڈپریٹیشن انسان کو بیمار بناتی دیتی ہے اور بیماری کو شک نہیں ہونے دیتی۔ میرا خیال ہے کہ آپ سب سے پہلے اپنے گھر کیلے ماحول کو بہتر بنائیں، شوہر کو دوست بنائیں اور اس کی دوست بنیں۔ اچھے میاں بھوی اچھے ماں باپ ہوتے ہیں اور ان کے بچے بھی اچھے ماحول میں تربیت پا سکیں گے بصورت دیگر بچے بھی خراب ہوں گے۔ نیند کی گولی اور اعصابی سکون کی ادویات کا استعمال بند کر دیں۔ ڈاکٹر ولما رشوایے جرنی کی Mercsol اور Arsenic Antimonium tart - 30

ایسی دوا تجویز کروں کہ اس کا جسم موٹا ہو جائے۔ دوا استعمال کرنے سے ایک دو ماہ کے لیے جسم کچھ بھاری ہو جاتا ہے پھر اس کے بعد کمزوری ہو جاتی ہے۔ آپ ضرور جواب دیں۔ رابعہ خان خیر بختون خواہ

جواب: بچی کا قد بڑھ رہا ہے تو اس کو بڑھنے دیں، وزن نہیں لگتا کہ کتنا ہے۔ بچی کی عموں صحت کا خیال رکھیں۔ موٹا ہونے پر نہ جائیں، متوازن غذا کھلائیں، درزش کراہیں اور ڈاکٹر ولما رشوایے جرنی کی Borax 30 اور Mercsol 30 کے 5.5 قطرے دن میں 3 مرتبہ 1/2 کپ پانی میں دیں۔ ساتھ میں U/s pelvis اور CBC کی رپورٹ بھیجیں۔

☆.....☆.....☆

الرجی فینشن

میں ماہنامہ پاکیزہ کی پرانی پڑھنے والی ہوں۔ اس میں دیے گئے صحت کے بارے میں مشورے بھی پرستی رہی ہوں لیکن اب پہلی دفعہ اپنی صحت کے بارے میں قلم اٹھا رہی ہوں۔ امید ہے کہ آپ ضرور جواب دیں گے۔ میری صحت سے متعلق مندرجہ ذیل مسائل ہیں۔

1- ہائی بلڈ پریشر (11 سال سے)

2- تقریباً 20 سال پرانی الرتبی جو کہ کبھی کبھی کھانسی یا دم کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے، بطن کا بھی ہے اور گلے پر بھی گرتا ہے۔ کبھی ناک بند ہو جاتی ہے کبھی چھاتی بند ہو جاتی ہے۔ سانس لینے میں دقت ہوتی ہے۔

اولاد کی نعت سے بھی فیض یاب ہو سکے۔ (خاندنو چیک کر دیا ہے۔ وہ بھی صحیح ہے) (رپورٹس ہمارے پاس نہیں ہے) غمینہ طاہرہ کبیر دلا جواب: 35 سال عمر ہو گئی ہے۔ مسئلہ 8/9 سال پرانا ہے شادی کو 6 سال ہو گئے۔ بے پروائی میں یہ دن کیوں گزارے اس کا علاج شروع کیوں نہیں کر دیا، رپورٹس ضرور بھیجیں اس کے بغیر دوا کی تجویز ممکن نہیں ہے۔

Color dopler pelvis CBC

Urine D/R اور Profile - قحطی طور پر

ڈاکٹر ولما رشوایے جرنی کی Pulsatilla 30

کے 5 قطرے اور Aletris Farinosa

کے 10 قطرے 1/2 کپ پانی میں 3 مرتبہ دن میں لیں۔

☆.....☆.....☆

قد بڑھ رہا ہے موٹی نہیں ہو رہی

امید ہے کہ آپ ٹھیک ہوں گے۔ یہاں میں اپنی بیٹی کا مسئلہ لکھ رہی ہوں جو کہ 15 سال کی ہے۔ اس کا مسئلہ پہلا یہ ہے کہ اس کا منہ پک جاتا ہے اوپر کی طرف۔ جسے میں ایک دفعہ ہوتا ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ وہ سسے زیادہ کمزور ہے، قد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اور زیادہ پتلی گتی ہے۔ میں نے دو سال پہلے "الفا الفا Q" استعمال کرایا تھا مسلسل 3 ماہ تک لیکن کچھ فرق نہیں پڑا۔ پھر میں نے حکیم سے دوا لی کہ ٹھوسا سانس موٹا ہو لیکن کچھ فرق نہیں ہوا۔ لیکور یا کی تکلیف بھی ہے لیکن کم۔ آپ کوئی

فرمائیں۔ دونوں کی عموں صحت اچھی ہے۔ والسلام والدہ شہریارہ سعد میاں نوالی

جواب: محترمہ والدہ صاحبہ یہ بات ضرور ذہن میں رکھیں کہ قد کا تعلق ماں اور باپ کے خاندان سے ہے دوسرا مین انج تک بڑھتا ہے۔ سوم و درش، متوازن غذا اور اچھا ماحول اس میں معاون بنے ہیں۔ عام جسنائی صحت کیسی ہے اس کا بھی بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔

بہر حال دونوں بچوں کو ڈاکٹر ولما رشوایے جرنی کی دوا Baryta carb 30 کے 5.5 قطرے دن میں 3 مرتبہ 1/2 کپ پانی میں استعمال کریں۔ 3 ماہ بعد دوبارہ بتائیں۔

☆.....☆.....☆

بے اولاد دی و ماہواری کی خرابی

میری ہمیشہ جس کی عمر 35 سال ہے شادی شدہ ہے۔ 6 سال شادی کو ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک اولاد سے محروم ہے۔ ماہواری صحیح نہیں آتی۔ 3 دن ٹانگوں اور کمر میں شدید درد ہوتا ہے۔ ٹھوسا ساخون آتا ہے۔ وہ بھی کالے رنگ کا۔ مکمل کر ماہواری نہیں آتی۔ ڈاکٹر دن کو چیک کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ٹیوٹین بند ہیں آپریشن کروائیں۔ لیکن ہم نے آپریشن نہیں کروایا۔۔۔۔۔ یہاں کر کے میری ہمیشہ کے مسئلہ کا حل بتائیں (ماہواری کا مسئلہ 8.9 سال سے ہے) بہت پریشان ہے۔ ایسی دوا تجویز کریں کہ میری ہمیشہ کی ماہواری صحیح ہو جائے۔ اور وہ

☆.....☆.....☆

سے دور رہیں، ہاں لٹی، ستو (سنت بھی ہے) تیل گیری، قالہ، اناس، کیری، آم، لیمو کے تازہ جوس و شربت حقیقی صحت اور تازگی کے لیے مفید ترین ہیں۔

4۔ موسی پھل اور سبزیوں کا استعمال آپ کی صحت کو بحال رکھے گا۔

5۔ اسی طرح گرمی کی مناسبت سے کپڑوں کا استعمال بھی کرنا چاہیے۔ سر کو گرمی سے ضرور بچائیں۔

6۔ پسینے کو کبھی ٹھنڈا یا ہوانہ لگائیں، اس طرح جسم کے پٹھے اکڑ سکتے ہیں، ان میں درد ہو سکتا ہے، دل کی حرکت بند ہو سکتی ہے یا فالج کا اثر ہو سکتا ہے۔

7۔ صفائی کا خیال رکھیں، رواز نہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور نہائیں۔

8۔ باہر ٹوچل رہی ہو یا گرمی کی شدت ہو تو کم از کم ایک گلاس پانی لے کر گھر سے نکلیں۔

9۔ جلد کو دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے سن بلاک والا فیس واش لوشن استعمال کریں، ہم سے بھی منگوا سکتے ہیں۔

10۔ یاد رکھیں یہ وہ احتیاطی تدابیر ہیں جن کو اختیار کر کے آپ اپنی موجودہ صحت کو مزید بہتر کر سکتے ہیں۔ بیماریوں سے اور گرم موسم کی شدت سے اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

اور 30 Kaliphos 5، 5 قطرے 1/2 کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں اور رات کو سونے سے پہلے Passiflora - Q کے 10 قطرے 1/2 کپ پانی میں لیں۔ نمک کم سے کم کھائیں، مرغن و میٹھی اشیاء پر ہیز کریں، چہل قدمی کیا کریں گھر سے سانس لیا کریں۔

☆.....☆.....☆

گرم موسم کی خصوصی احتیاطیں  
جن کو اختیار کر کے آپ موسم گرما کو انجوائے کر سکتے ہیں۔

1۔ گرم ٹھنڈا یا ٹھنڈا گرم نہ کریں۔ یعنی گرم جگہ سے ایک دم اتر کھینڈ میں نہ جائیں یا ٹھنڈی جگہ سے گرم جگہ نہ جائیں، اسی طرح نہا کر فوراً پٹکھے یا اتر کھینڈ میں نہ آئیں یا باہر لوس میں نہ نکلیں۔

2۔ گرمی کی شدت کے حساب سے پانی کا استعمال کریں لیکن یاد رکھیں پیاس کتنی بھی لگ رہی ہو گرمی سے آکر فوراً پانی نہ پیئیں خصوصاً ٹھنڈا بلکہ پہلے ہاتھ منہ دھو کر خود کو ٹھنڈا کریں اس کے بعد پانی پیئیں، دن میں کم سے کم 10 سے 12 گلاس پانی پیئیں، بچوں کو 6 سے 8 گلاس پانی پلائیں دن میں لیکن یاد رہے کہ کھانے کے ساتھ اور کھانے کے فوراً بعد نہیں پیئیں۔ نہار منہ، کھانے سے پہلے اور کھانے کے دو سے ڈھائی گھنٹے بعد پانی کا استعمال صحت و ہاضمہ کے لیے مفید ہے۔

3۔ مصنوعی شربتوں، سے ہر قسم کی کوئلڈرنک



**Dr. Willmar Schwabe , Germany.**

Available at All Leading Medical & Homoeopathic Stores